اردو ڈائجسٹ

اللہ کا قرآن

روزہ

رمضان کا مہینا (ہے) جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور (جس میں) ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے۔ تو جو کوئی تم میں سے اس مہینا میں موجود ہو چاہیے کہ پورے مہینا کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں ان کا شمار پورا کرلے۔

(البقرہ 2:185)

رسول ﷺ کا فرمان

روزہ کی فضیلت

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "روزے دار میری خاطر کھانا پینا اور شہوت نفس کے تقاضے پورے کرنا چھوڑتا ہے۔ اس لیے روزہ ایک ایسا عمل ہے جو خالصتاً میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دیتا ہوں اور نیکی کا بدلہ دس گنا دیا جاتا ہے۔" رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "روزہ ڈھال ہے۔ روزہ دار کو چاہیے کہ نہ فحش کلامی کرے اور نہ جاہلوں جیسا (کوئی فضول) کام کرے اور اگر کوئی شخص اس سے لڑے یا اسے گالی دے تو اسے چاہیے کہ اس سے کہہ دے: میں روزے سے ہوں۔"

(بخاری کتاب 30، باب 2۔ مسلم کتاب الصیام۔ باب 29)

دیا اور حکومت پاکستان کو مشکل میں ڈال دیا۔ لیکن وزیراعظم پاکستان نے اس تقریب میں شرکت کر کے اس موو (Move) کو اپنے حق میں موڑ لیا۔ انتخابات میں غیرمعمولی اکثریت کی بنا پر مودی حکومت کئی برس اقتدار میں رہ سکتی ہے۔ بہرحال وہ بھارت کی معاشی ترقی اور مسائل کے حل کے دعوے پر حکومت میں آیا ہے۔ جس کی وجہ سے بھارتی میڈیا اور حکومت کے علاوہ عوام اچھے دنوں کی آس میں ایک ایک دن بڑی بے چینی سے گن رہے ہیں۔ اپنی تنگ نظری اور جارحانہ رویے اور ماضی کی طرح انتہا پسندی سے ہٹ کر وہ کسی بھی اپنے وعدوں کو پورا نہیں کر سکے گا۔ اس کی کابینہ میں اکثر وزرا پاکستان مخالف اور جذباتی ہیں۔ اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کی اوپر چھا اور کابینہ میں نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مودی کابینہ کے ایک وزیر نے حلف اٹھاتے ہی اپنے انتخابی منشور کے مطابق بھارتی آئین میں سے کشمیر کے خصوصی اختیارات میں تبدیلی کا اظہار کر کے لاکھوں کشمیریوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ عدالت کے حکم پر کالے دھن واپس لانے کے لیے مودی کابینہ نے ایک ایکشن بنا کر وہ اپنے سرپرست سرمایہ داروں کو بھی "پیغام" دے رہے ہیں۔

نواز شریف کے معاشی وژن کے مطابق چین کی پاکستان میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری خصوصاً بلوچستان میں سڑکوں کے جال اور گوادر پورٹ جیسے انفراسٹرکچر کی تعمیر جو چین کو وسط ایشیائی ممالک سے جوڑ رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی گیم چینجر ہیں کی اور پاکستان کے مستقبل کو روشن اور محفوظ بنائے گی۔ یقیناً مودی سرکار کے لیے پریشانی کا باعث ہوں گی۔

بلوچستان میں ڈاکٹر مالک کی حکومت اور سکیورٹی ادارے بڑی جانفشانی اور محنت سے عالمی طاقتوں کی خفیہ ایجنسیوں کے جال کو بے نقاب کرنے میں مصروف ہیں۔ سی پی این ای (CPNE) کے وفد کے ہمراہ گوادر کے دورے کے دوران تمام اراکین اس بات پر متفق نظر آئے کہ حالات حکومت کے قابو میں آتے جا رہے ہیں اور تمام ادارے مل کر کام کر رہے ہیں اور وہاں کے عوام پچھلے ایک سال میں نمایاں تبدیلی دیکھ رہے ہیں اور اچھے دنوں کی آمد محسوس کر رہے ہیں۔

طیب اعجاز قریشی

tayyab.ejaz@urdu-digest.com

فہرست

کور سٹوری

تھر کوئلے سے نو سو سال تک 40 ہزار میگاواٹ بجلی بنانا ممکن ہے

"سوان ریور اسٹوریج" کی تعمیر کے بغیر کسان پانی کی بوند بوند کو ترسیں گے

ماہر ارضیات مرزا عبدالصمد بیگ کے انکشافات

فہرست

156
ظرف اور ضروف

177
لؤلو سر سے
سیف الملوک تک

اُف!
میں پاس ورڈ
بھول گیا
180

190
بچہ جس نے مرنے سے
انکار کردیا

مستقل سلسلے

عام آدمی کے لیے بجٹ

امیروں کے بجٹ امیروں کے لیے اور امیروں کے ذریعے اس لیے بنتے آئے ہیں کہ اسمبلیوں میں جاگیردار، سرمایہ کار اور باوسائل افراد بیٹھے ہیں جبکہ آج سب سے بڑی ضرورت غریبوں کے لیے بجٹ سازی کی ہے۔ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والی حکومتوں پر واجب آتا ہے کہ وہ سب سے پہلے "غریب" کی تعریف میں بدلے ہوئے حالات کے مطابق ترمیم کریں۔ اب تک دو ڈالر یومیہ آمدنی رکھنے والوں کو خطِ غربت کے نیچے شمار کیا جاتا ہے جو انسانیت کے ساتھ بہت بڑا مذاق ہے۔ آج دو ڈالروں کو دس ڈالروں میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے اقتصادی منصوبہ سازوں کو اس امر کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ایک غریب کو گھر کا کرایہ اور یوٹیلٹی بلز ادا کرنے اور تعلیم و صحت کے اخراجات پورا کرنے کے لیے تین ہزار روپے ماہانہ دستیاب ہونے چاہئیں۔ اس کی اُجرتوں میں گرانقدر اضافہ ازبس لازم ہے۔ فوڈ اسٹیمپ کا ایک شفاف نظام قائم کیا جائے جس کے ذریعے غریب لوگوں کو کم قیمت پر گندم، چاول، چینی، گھی اور دودھ فراہم کیے جائیں۔ آج وزیراعظم ہاؤس میں روٹی اسی قیمت میں خریدی جاتی ہے جس پر غریبوں کو میسر ہے۔

دوسرا قدم ان ڈائریکٹ ٹیکسوں میں کمی لانے کے لیے اٹھانا ہوگا۔ جنرل سیلز ٹیکس جو اس وقت 17 فی صد کی شرح سے نافذ ہے، اس سے مہنگائی میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کا زیادہ بوجھ غریب اٹھا رہے ہیں۔ اگر یہ شرح گھٹا کر 7 فی صد کر دی جائے تو عام آدمی پر سے بوجھ کم ہو جائے گا اور انڈر انوائسنگ (Under Invoicing) اور اوور انوائسنگ (Over Invoicing) میں کمی واقع ہوگی اور رجسٹریشن کا دائرہ وسیع ہو جانے سے قومی خزانے کو زیادہ وسائل میسر آئیں گے اور ہماری معیشت بتدریج مستحکم ہوتی جائے گی۔ یہ بات شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ امیر ہر سال ٹیکسوں میں اربوں روپے کا استثنیٰ حاصل کر لیتے ہیں اور فیڈرل بورڈ آف ریونیو بڑی فراخ دلی سے ایس آر اوز جاری کر دیتا ہے جس کا بار عام آدمی کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ آئی ایم ایف نے اس غیر منصفانہ عمل کو ختم کرنے پر زور دیا ہے جس کے نتیجے میں 436 ارب روپوں سے فی الحال 200 ارب کا ٹیکس استثنیٰ واپس لیا جا رہا ہے اور یوں عام آدمی کے لیے حالات قدرے بہتر ہوں گے۔

بجلی عام شہری کی بنیادی ضرورت ہے اور اس کے نرخوں میں دو روپے کا فیڈرل ٹیکس بھی شامل ہے۔ بجلی اور گیس کے بلوں میں عجیب عجیب مدوں کے تحت ٹیکس وصول کیے جا رہے ہیں۔ پی ٹی وی ٹیکس ان لاکھوں غریبوں سے

بھی وصول کیا جا رہا ہے جن کو ٹیلی ویژن کی سہولت میسر ہی نہیں۔ موبائل کارڈز پر 22 فی صد سے زائد ٹیکس لیا جاتا ہے جو کم وسائل شہریوں کے لیے بہت زیادہ ہے' اس میں تخفیف کر دینے سے اس کا بوجھ کسی قدر کم ہو سکتا ہے۔ ایک زمانے میں پبلک اسکول اور پبلک ہسپتال عام شہریوں کو بہت سہارا فراہم کرتے تھے' مگر اب حکومت عملاً ان اداروں سے دستبردار ہوتی جا رہی ہے حالانکہ نہایت اچھا انفراسٹرکچر آج بھی قائم ہے' مگر مناسب نگرانی ختم ہو جانے سے وہ زوال حالی کا شکار ہیں۔ امیر طبقے نے اپنے الگ اسکول اور ہسپتال بنا لیے ہیں جن کے فروغ میں ہمارا حکمران طبقہ بڑی دلچسپی لے رہا ہے اور اعلیٰ سرکاری ملازمین عوام کے مسائل سے لاتعلق ہوتے جا رہے ہیں۔ عوام کے اٹھ کھڑا ہونے سے پہلے حکومت کو اس پالیسی کا اعلان کرنا چاہیے کہ سرکاری طبقے کے بچے سرکاری اسکولوں میں پڑھیں گے اور سب کا علاج معالجہ سرکاری ہسپتالوں میں اسی طرح ہونا چاہیے کہ ادارے اچھی حالت میں آ جائیں گے اور حکومت کے مصارف بھی کمی واقع ہوگی جو بڑے بڑے منصب داروں کے بیرون ملک علاج پر اٹھتے ہیں۔

ہم امید رکھتے ہیں کہ وزیراعظم نواز شریف کی قیادت میں جناب اسحٰق ڈار اور ڈاکٹر وقار مسعود جو عوام کی حالت بہتر دیکھنا چاہتے ہیں' وہ ایک ایسا بجٹ تیار کریں گے جسے عوام اپنا بجٹ کہہ سکیں گے اور ان کے صحن دل میں امید کے شگوفے پھوٹنے لگیں گے۔

الطاف حسن قریشی

نئی کروٹ لیتے حالات

پاکستان کی ریاست اور معاشرے کو جو بلائیں چمٹی ہوئی ہیں' ان کی جڑیں تلاش کرنا اور یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ دوسرے ملکوں میں اس طرح کے بحرانوں پر کیسے قابو پایا گیا اور ہم اپنے ماحول میں کیونکر استحکام لا سکتے ہیں۔ تشویش یہ ہے کہ میڈیا میں اُمڈتے ہوئے طوفان کے آثار گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔

الطاف حسن قریشی کا تجزیہ

قیامِ پاکستان بلاشبہ بیسویں صدی کا ایک بڑا سیاسی تجربہ تھا جبکہ اس کا استقلال اس سے کہیں بڑا تجربہ ثابت ہوا۔ ہندو توا کے پُرجوش نوجوان' گرتار سنگھ کی قیادت میں سکھوں کے مسلح جتھے اور انڈین نیشنل کانگرس کے بیشتر قائدین ہندوستان کی تقسیم کے سخت مخالف اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ہر نقش مٹانے پر تُلے ہوئے تھے۔ گاندھی جی بھی یہی کہتے رہے کہ وہ گاؤ ماتا کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے' مگر جب پاکستان کی تشکیل فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگئی' تو انہوں نے بڑے پن کا ثبوت دیا اور تقسیم شدہ اثاثوں کے سلسلے میں پاکستان کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور بے انصافی کے خلاف مرن برت رکھا۔ اس پر ایک سر پھرے ہندو نوجوان نے انہیں گولی مار دی اور ساری عمر عدم تشدد کا درس دینے والے مہاتما اپنی ہی قوم کے ہاتھوں تشدد کا شکار ہوگئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو جیسے "روشن دماغ" لیڈر بھی اس امر پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں جو نیا ملک وجود میں آیا ہے' وہ چھ ماہ سے زائد اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکے گا اور آخر کار ہمارے اندر ضم ہو جائے گا۔ بدقسمتی یہ رہی کہ ایک وقت میں آزاد ہونے والے ہمسایہ ملک ایک دوسرے کے ازلی دشمن قرار پائے۔

بھارت پاکستان کو (خاکم بدہن) صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتا رہا۔ اس کی اوّلین کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کا نیا ملک پیدائشی طور پر جغرافیائی اعتبار سے اس قدر کمزور رہے کہ اس کے لیے زندہ رہنا محال ہو جائے' چنانچہ انڈین کانگرس نے صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کا مطالبہ کر دیا اور برطانوی حکومت نے اسے تقسیم ہند کی اسکیم میں شامل بھی کر لیا۔ سرحد میں ان دنوں خان عبدالغفار خاں کا طوطی بول رہا تھا اور وہ "سرحدی گاندھی" کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ ریفرنڈم یہ معلوم کرنے کے لیے کرایا جا رہا تھا کہ صوبہ سرحد کے عوام پاکستان میں یا بھارت میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ ہندوؤں نے ریفرنڈم جیتنے کے لیے تجوریوں کے منہ کھول دیے اور سرحدی گاندھی نے کانگرس کے ساتھ وفاداری بشرط استواری کا حق ادا کر دیا' لیکن پشاور یونیورسٹی کے طلبہ' پیر

مانکی شریف کے ہزاروں مریدین اور ہزارے کے مسلم لیگی رضا کاروں نے اُن کے سارے عزائم خاک میں ملا دیے اور سرحد کے عوام نے بھاری اکثریت سے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ صوبہ سرحد کے شامل ہونے سے پاکستان کا جغرافیہ ناقابلِ تسخیر ہو گیا۔ انڈین کانگرس نے برٹش بلوچستان کو بھی پاکستان کا حصہ بننے سے روکنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی تھی، مگر نواب جوگیزئی، نواب اکبر خاں بگٹی اور جناب ظفر اللہ خاں جمالی کے اکابرین کی بالغ نظری اور حب الوطنی کے سامنے بالکل شکست کھا گیا اور آج ہم جس وسیع و عریض علاقے میں آباد ہیں اور اسے جنتِ ارضی کا نمونہ بنا دینے کا عزم رکھتے ہیں، وہ ہمارے عظیم سیاسی قائدین کی ناقابلِ فراموش خدمات کا صلہ ہے۔

.......☆.......

قیامِ پاکستان کے ابتدائی چند سال بڑے خونریز اور ہلاکت خیز ثابت ہوئے تھے۔ اعلانِ آزادی سے چند ماہ پہلے اور اس کے فوراً بعد مشرقی پنجاب، دلی، بہار اور سکھ ریاستوں کے اندر مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ سے زائد اسلامیانِ ہند شہید اور نوے لاکھ کے لگ بھگ بے سروسامانی کی حالت میں پاکستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیے گئے۔ مسلمانوں کے خون کے پیاسے درندہ صفت ہندو اور سکھ بچوں کو نیزوں پر لٹکاتے اور عورتوں کی عصمتیں لوٹتے رہے۔ مغربی پنجاب میں بھی خونریز فسادات کی تباہ کاریاں دیکھنے میں آئیں۔ وہ قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا۔ مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے بڑی تعداد میں ارضِ وطن کی طرف آ رہے تھے جبکہ پاکستان ان کا بوجھ اٹھانے کا متحمل نہیں تھا۔ ہر طرف خون ہی خون اور لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ اس افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارتی حکومت نے مہاراجہ کشمیر کی طرف سے الحاق کی ایک جعلی دستاویز کی بنیاد پر سری نگر میں اپنی فوجیں اُتار دیں اور شیخ عبداللہ کو سیاسی فریب دے کر کشمیر کے ایک بڑے حصے پر غاصبانہ قبضہ جما لیا۔ پاکستانی فوج کا کمانڈر ان چیف انگریز تھا جو ایک مشترکہ سپریم کمانڈر ان چیف کے تحت کام کر رہا تھا۔ قائداعظم نے جنرل گریسی کو کشمیر میں فوجی کارروائی کا حکم دیا۔ غالباً زمینی حقائق اس کے حق میں نہیں تھے، کیونکہ پاکستان کے حصے میں جو فوج آئی تھی، وہ ابھی تک ملائیشیا، سنگاپور اور برما کے محاذوں ہی پر تھی اور اس کی یونٹوں کی کمان انگریز افسر کر رہے تھے۔ کشمیر پر غاصبانہ قبضے کے بعد بھارت نے پاکستان کی طرف آنے والی نہروں کا پانی بند کرنا شروع کر دیا اور مشرقی پنجاب سے دی جانے والی بجلی میں بھی خلل پڑنے لگا۔ یہ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت کیا جا رہا تھا جس کا مقصد پاکستان کو انتظامی، اقتصادی اور سیاسی طور پر مفلوج کر دینا تھا۔ اس کے برعکس قائداعظم یہ واضح کر چکے تھے کہ بھارت اور پاکستان اسی طرح امن اور دوستی کی فضا میں رہیں گے جس طرح امریکہ اور کینیڈا کے مابین خوشگوار تعلقات قائم ہیں۔ بھارتی قیادت نے ابتدائی برسوں میں پاکستان کے ساتھ جو انتہائی مخاصمانہ اور غیر دانش مندانہ سلوک روا رکھا، اس کی تلخیاں ہمارے سڑسٹھ سالہ سفر میں شامل رہی ہیں اور نریندر مودی کی غیر معمولی پارلیمانی فتح نے پرانے زخم درد کی ایک نئی لہر کے ساتھ ہرے کر دیے ہیں۔

ہمارے ابتدائی سال اپنے دامن میں بے مثال کامیابیوں کی ایک حیات افروز داستان لیے ہوئے ہیں جو یہ ثابت کرتی ہے کہ سچی لگن اور جوان جذبے ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ پاکستان کے مقابلے میں بھارت دس گنا بڑا ملک اور برطانیہ کی عظیم الشان میراث کا وارث تھا۔ برطانیہ نے پہلی اور دوسری جنگِ عظیم افواجِ ہند کی مدد سے لڑی

تھیں اور دہلی میں وزارتِ دفاع' وزارتِ خارجہ اور سول سیکرٹریٹ کا وسیع و عریض انفراسٹرکچر موجود تھا جبکہ پاکستان ایک مضبوط مرکزی ڈھانچے کے بغیر ایک نئی ریاست کے طور پر وجود میں آیا تھا اور ہر شعبے میں تجربہ کار اشخاص کا ایک مہیب خلا تھا۔ ایسے میں یکجہتی اور ستاروں پر کمند ڈالنے والے جذبے کام آئے۔ مسلمانوں پر جب پہلی بار اپنا ملک چلانے کی ذمے داری آن پڑی' تو انہوں نے حسنِ انتظام کے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیے اور وزیرِ خزانہ ملک غلام محمد نے 1948ء میں بے پناہ افراتفری کے درمیان فاضل بجٹ پیش کیا۔ دراصل آزادی برقرار رکھنے کا جذبہ اس قدر ہمہ گیر اور بے پناہ تھا کہ وہ پہاڑ جیسی رکاوٹوں پر غالب آتا گیا۔ ہم دفتروں میں کیکر کے کانٹوں سے کاغذات نتھی کرتے اور لکڑی کی پیٹیوں پر بیٹھ کر دفتری امور سرانجام دیتے تھے۔ دراصل نیکی اور بھلائی کے کاموں اور تعمیری سرگرمیوں میں سبقت لے جانے کا ولولہ تمام تر مشکلات پر حاوی ہو چکا تھا۔ پاکستان فقط سات برسوں کی قلیل مدت میں بھارت کے مقابلے میں اقتصادی طور پر زیادہ طاقت ور ہو چکا تھا جسے اپنے روپے کی قیمت کم کرنا پڑی تھی۔

☆

قائداعظم گورنر جنرل کے طور پر نشانِ منزل ثبت کرنے میں شب و روز مصروف رہے۔ ان کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ پاکستان کا مرکزی بینک جلد سے جلد قائم ہو جائے۔ وہ سالہا سال سے تپ دق کے مریض چلے آ رہے تھے' مگر انہوں نے اپنے سیاسی حریفوں کو اس کی بھنک تک نہ پڑنے دی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو انتقالِ اقتدار سے ذرا پہلے اس بات کا علم ہوا' تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ اگر یہ راز مجھے پہلے معلوم ہو جاتا' تو ہندوستان کی آزادی کا اعلان ایک سال مؤخر کر کے ''گریٹ ڈیوائڈ'' سے بچا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق حضرت قائداعظم زیارت میں زیادہ وقت گزارنے پر مجبور تھے اور وہ شدید علالت کے باوجود اسٹیٹ بینک کا افتتاح کرنے کراچی تشریف لائے۔ افتتاحی تقریب میں وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے' کیونکہ بھارت کی کرنسی سے نجات پانے' پاکستان کی معاشی خودمختاری قائم کرنے اور اسلامی اصولوں کے مطابق معیشت کو فروغ دینے کے یہ تاریخ ساز لمحات تھے۔ اس عظیم پیش رفت سے چند برس بعد پاکستان فوجی اعتبار سے بھی طاقت ور ہو گیا اور سیٹو اور سینٹو کے دفاعی معاہدوں نے اسے بھارتی جارحیت کے خوف سے بڑی حد تک محفوظ کر دیا تھا اور مشرقِ وسطیٰ سے لے کر مشرقِ بعید تک بھارتی بالادستی کا خواب چکنا چور کر ڈالا تھا۔

ہمارے ابتدائی آٹھ دس سال ہمیں جہاں آج بھی ایک حوصلہ عطا کرتے ہیں' وہاں شدید ناکامیوں کا احساس بھی دلاتے ہیں کہ اسی عہد میں ہماری قیادتوں سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں اور ہمارے رویوں میں جو بیماریاں پرورش پاتی رہیں' وہ بڑی حد تک ہماری نفسیات اور طرزِ حکومت کا حصہ بن چکی ہیں۔ ہماری آزادی کے پہلے عشرے میں بدقسمتی سے وہ تمام حادثے پیش آئے جو ایک خودغرض' پسماندہ اور کوتاہ اندیش معاشروں میں بالعموم رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان کی تشکیل میں مغربی پاکستان کے وڈیروں' نوابوں اور سرداروں کا بہت کم حصہ تھا۔ وہ سیاسی شعور سے نابلد اور بدترین قدامت پرستی کی علامت تھے۔ 6-1945ء میں جو فیصلہ کن انتخابات ہوئے' ان میں پرائمری پاس یا جائداد کے مالک افراد ہی ووٹ دینے کے مجاز تھے' اس لیے مسلم لیگ کو

پاکستان کی جنگ جیتنے کے لیے انگریز چودھریوں اور خان بہادروں کا تعاون حاصل کرتے اور انھیں سیاسی عمل کا حصے دار بنانا پڑا۔ اُس وقت سے یہی جاگیردار اقتدار کے مالک چلے آرہے ہیں جن میں بعدازاں سرمایہ کار، بیوروکریٹس اور جرنیل بھی شامل ہو گئے اور یوں ایک ایسی اشرافیہ وجود میں آچکی ہے جو آبادی کا محض پانچ فی صد حصہ ہونے کے باوجود پچانوے فی صد قومی وسائل پر قابض ہے۔ اسی اشرافیہ نے ملک میں بااصول اور مڈل کلاس پر مبنی مضبوط سیاسی جماعتیں قائم نہیں ہونے دیں اور آج اسمبلیوں کے دروازے عام شہریوں پر بند ہو گئے ہیں۔ ان کی قبائلی رقابتوں نے پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کو ملک کے بنتے ہی دھڑوں میں تقسیم کر دیا تھا اور راتوں رات "صاحب بہادر" کے اشارے پر نئی سیاسی جماعت بنانے کی ریت ڈالی تھی۔ اِن جاگیردارانہ رویوں سے پاکستان میں حقیقی جمہوریت کا کلچر فروغ ہی نہ پا سکا اور آج اس نام نہاد اشرافیہ کے ہاتھوں میں سیاسی جماعتیں، اسمبلیاں اور میڈیا ہاؤس یرغمال بنے ہوئے ہیں اور جنگ زرگری عروج پر ہے۔

☆

داخلی انتشار اور اقتدار کی کھینچا تانی کے باعث جب 1950ء میں پاکستان مسلم لیگ عوام کی حمایت سے محروم ہو گئی، تو اس کی قیادت نے پنجاب، سرحد اور بہاولپور میں انتخابات جیتنے کے لیے دھونس، دھاندلی اور جھرلو کے نت نئے طریقے ایجاد کیے۔ تب سے جعلی مینڈیٹ کا آسیب ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ یہی جعلی مینڈیٹ جو شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے مسلح جتھوں کے ذریعے حاصل کیا تھا اور مخالف سیاسی جماعتوں کے ووٹر پولنگ اسٹیشنوں تک پہنچنے نہیں دیے تھے، مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بنا جبکہ بھاری مینڈیٹ پر قابض ہو جانے کی لامحدود خواہش نے 1977ء میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار اور بعد میں ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ ہم نے آئین میں اٹھارویں اور بیسویں ترامیم کے ذریعے الیکشن کمیشن اور نگران حکومتوں کو غیرمؤثر اور موم کی ناک بنا کے رکھ دیا ہے جس کے سبب گیارہ مئی 2013ء کے انتخابی نتائج متنازع بنتے جا رہے ہیں۔ ایک سال بعد جناب عمران خاں نے انتخابات میں دھاندلی کے خلاف احتجاجی تحریک چلانے کا اعلان اور الیکشن کمیشن سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کر دیا ہے۔ وہ ایک آزاد اور خودمختار الیکشن کمیشن کی تشکیل کے لیے بنیادی اصلاحات کا مسئلہ اٹھا رہے ہیں اور چار حلقوں میں دوبارہ گنتی پر سب سے زیادہ زور دے رہے ہیں جن کی تعداد میں اضافہ متوقع ہے۔ قابلِ اطمینان امر یہ ہے کہ وہ اِس عزم کا بھی اظہار کر رہے ہیں کہ جمہوریت کو پٹڑی سے اترنے نہیں دیں گے۔ الیکشن کمیشن کی طرف سے ان کی شکایات کا جائزہ لینے کا اعلان ہو چکا ہے اور خدشہ پیدا ہو چلا ہے کہ ایک پنڈورا بکس کھل جائے گا۔

جناب عمران خاں ایک وسیع المطالعہ اور سیماب صفت قومی لیڈر ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ اب انھیں اپنی اٹھارہ سالہ سیاسی زندگی میں ملنے والی کامیابیوں اور ناکامیوں کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیں۔ دراصل ان کی عظیم صلاحیتوں کو وقت کے غلط انتخاب سے بڑے دھچکے لگے ہیں، کیونکہ سیاست میں ٹائمنگ بالعموم ایک فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ جنرل پرویز مشرف نے اقتدار پر قبضہ کیا، تو عمران خاں جو سیاست میں جمہوری طرزِ حکومت کو استحکام بخشنے کا ارادہ لے کر آئے تھے، ایک ہی جست میں نئے مسیحا کی آغوش میں جا بیٹھے اور کئی سال اُن کے بااعتماد مصاحبین میں شامل رہے۔ پھر عالمِ یاس میں وہ جنرل مشرف کے دورِ اقتدار کو فسطائیت سے تعبیر کرنے لگے۔ اِس

تضاد کے باوجود وہ اپنی پُرجوش تقریروں سے عوام کے اندر تبدیلی کی اُمنگ بیدار کرتے رہے' لیکن لاہور کے عظیم الشان جلسے کے بعد چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ یہ سب کچھ آئی ایس آئی کے جنرل احمد شجاع پاشا کی جلوہ آرائی ہے۔ جب انتخابات قریب آئے' تو خان صاحب کو پارٹی کے اندر انتخابات کرانے کا شوق چرایا اور پانچ چھ ماہ اِسی سعیِ لاحاصل میں ضائع ہو گئے۔ یہی وقت انتخابات کی عملی حرکیات کو سمجھنے اور پولنگ ایجنٹوں کے چناؤ اور اُن کی تربیت پر توجہ دینے کا تھا۔ اُمیدواروں کے انتخاب میں ذاتی پسند اور دولت نے اپنا اثر دکھایا اور ناتجربہ کار اور نااہل افراد پُراسرار طریقوں سے پارٹی ٹکٹ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اپنی اِس ناکامی کا اعتراف کرنے کے بجائے جناب عمران خاں نے ایک سال بعد انتخابات میں دھاندلی کے خلاف آسمان سر پر اُٹھا لیا ہے اور اِس میں سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو بھی ملوث کر لیا ہے۔ یہاں بھی اُن کی ٹائمنگ بڑی عجیب و غریب دکھائی دیتی ہے۔ وہ یومِ تشکر منانے اور خیبر پختونخواہ حکومت کی کارکردگی پر توجہ دینے کے بجائے اچانک میدانِ احتجاج میں اُتر آئے ہیں' اِس پر قومی حلقے چہ میگوئیاں کر رہے ہیں کہ اُنہیں اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے اشارہ ہوا ہے جو 19 اپریل کی شام سے جیو ٹی وی پر ڈی جی آئی ایس آئی کے خلاف نشریات چلنے اور حکومت کی مجرمانہ خاموشی اور بےعملی پر تخت پیچ و تاب کھا رہی ہے۔ اِس پس منظر میں انتخابی بےقاعدگیوں کی چھان بین کوئی بھی گل کھلا سکتی ہے اور جمہوریت کے لیے خطرات پیدا کر سکتی ہے۔

......☆......

اِس وقت انتخابی اصلاحات کا موضوع سیاسی حلقوں سے غیر معمولی سنجیدگی کا متقاضی ہے۔ بلاشبہ الیکشن کمیشن کی طرف سے انتخابی عمل کو زیادہ سے زیادہ شفاف بنانے کی قابلِ تحسین کوششیں ہوتی آئی ہیں' مگر اِس کی تشکیل میں بنیادی خرابی کے باعث پورا انتخابی عمل احتجاج کی زد میں ہے۔ بنیادی خرابی یہ ہے کہ الیکشن کمیشن ریٹائرڈ جج صاحبان پر مشتمل ہے جو انتظامی مشینری کے استعمال سے قطعی طور پر نابلد اور فیلڈ کے معاملات سے بےخبر ہوتے ہیں' جبکہ پورے ملک میں ایک دن کے اندر انتخابات کرانا غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں اور تجربات کا تقاضا کرتا ہے۔ ریٹائرڈ یا سن رسیدہ ججوں کی مخصوص طرزِ زندگی اور ناتجربہ کاری کے سبب انتخابی نظم و نسق میں بڑے بڑے نقائص رہ جاتے ہیں جو پورے عمل کو غیر شفاف اور متنازع بنا دیتے ہیں۔ اِس بار انگوٹھوں کے نشانات محفوظ رکھنے والی روشنائی ایک معمہ بنی رہی اور کراچی شہر کے مختلف حلقوں میں وقت پر عملہ پہنچا نہ انتخابی ساز و سامان۔ اِس کا حل یہ ہے کہ بھارتی الیکشن کمیشن کی طرح پاکستان الیکشن کمیشن بھی انتظامی صلاحیتوں سے مالا مال' دیانت دار اور اچھی شہرت کے حامل افراد پر مشتمل ہو جو گاؤں کی سطح تک نظم و نسق چلانے کا تجربہ رکھتے ہوں۔ بھارت میں اسی کروڑ ووٹروں کے جملہ انتظامات فقط تین افراد پر مبنی الیکشن کمیشن کی نگرانی میں ہوتے ہیں' جبکہ ووٹنگ کا دورانیہ بالعموم پانچ ہفتوں پر محیط ہے اور شکایت ملنے پر چار پانچ دنوں کے اندر دوبارہ گنتی بھی عمل میں آ جاتی ہے۔ انتخابات کا اعلان ہوتے ہی الیکشن کمیشن ایگزیکٹو کے مطلوبہ اختیارات سنبھال لیتا ہے اور تمام تقرر اور تبادلے اُس کی اجازت سے کیے جاتے ہیں۔ وہ اعلیٰ انتظامات کے ذریعے ہر اُمیدوار کے انتخابی اخراجات پر کڑی نگاہ رکھتا ہے اور خلاف ورزی پر اُمیدوار نااہل بھی قرار دے جاتے ہیں۔ ہم بھی اِنہی خطوط پر ایک آزاد اور خودمختار الیکشن کمیشن کی تشکیل نو کے علاوہ انتخابی عمل میں کامل

شفافیت لانے کے لیے بنیادی اصلاحات نافذ کر سکتے ہیں۔ اس وقت ہمیں بھارت کے حالیہ انتخابات میں کارپوریٹ سیکٹر اور میڈیا کے غالب اثرات کا تفصیل سے جائزہ لینا ہوگا کہ وہ الیکشن کمیشن کی کارکردگی پر اثرانداز ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی الیکٹرانک میڈیا ایک ایمپائر کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے اور اس نے گزشتہ انتخابات میں اپنی طاقت کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

اس ضمن میں ہمارا مشورہ یہ ہوگا کہ بھارتی الیکشن کمیشن کی ساخت، اس کے ارتقا اور اس کے دائرہ کار کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ روزنامہ ڈان نے بھارتی الیکشن کمیشن کے ایک رکن مسٹر قریشی کا تفصیلی انٹرویو شائع کیا ہے جس میں حقائق تک پہنچنے کے بہت سے لوازم پائے جاتے ہیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ ہمارے پڑوس میں جو ایک کامیاب ماڈل کام کر رہا ہے، اس کا پوری طرح احاطہ کرنے کے لیے سیاست دانوں کے علاوہ پروفیشنل ماہرین کی ایک ٹیم بھارت جائے اور برسرِزمین حقائق بھی معلوم کرے۔ بھارتی اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ مودی کے انتخابات پر کارپوریٹ سیکٹر نے ایک ہزار کروڑ روپے خرچ کیے ہیں اور میڈیا نے اس کا امیج تراشنے میں انتخابی پابندیوں سے بڑی جسارت سے پہلوتہی کی ہے۔ ناقدین کہہ رہے ہیں کہ نریندر مودی جو آٹھ سال کی عمر میں آر ایس ایس کا رضاکار بن گیا تھا، اس کی پارلیمانی کامیابی دراصل میڈیا اور کارپوریٹ سیکٹر کا بہت بڑا کرشمہ ہے۔ اس معاملے کے تمام پہلوؤں کی تفتیش از بس لازم ہے کہ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کی ذیل میں یہ سارے محرکات آتے ہیں۔ ہم نے تاریخ میں دیکھا ہے کہ جہاں جہاں انتخابات ایک ہیجانی کیفیت میں منعقد ہوئے، وہاں غیرمعمولی نتائج برآمد ہوئے جو معاشرے میں عدم توازن پیدا کرنے کا باعث بنے۔ ہٹلر اور مسولینی نے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنے اپنے ملکوں میں ایک زبردست اضطرابی کیفیت پیدا کی تھی۔ پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن اور مسٹر بھٹو نے یہی نسخہ آزمایا تھا اور وہ عوام کو شدید جذبات میں بہا کر لے گئے تھے۔ ہمیں دوررس اصلاحات کے ذریعے پاکستان میں بھی کارپوریٹ سیکٹر اور بے پایاں طاقت ور میڈیا کے آگے ایک بند باندھنا ہوگا۔ ہندوتوا کے جنون اور گجرات میں گڈ گورننس کی جلوہ آرائی نے مسٹر مودی کو وزارتِ عظمیٰ کے منصب تک پہنچا کر ہمارے حکمرانوں کو ایک تشویش ناک پیغام پہنچایا ہے جس کا جواب تخلیقی ذہن، تاریخی شعور اور سیاسی بصیرت سے دینا ہوگا۔

٭

آج پاکستان میں بظاہر جمہوری حکومتیں بھی ہیں، منتخب اسمبلیاں بھی کام کر رہی ہیں، حکمران ملک میں خوشحالی اور ترقی کا عمل تیز کرنے، توانائی کے بحران پر قابو پانے اور دہشت گردی کا ناسور ختم کرنے کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں، اس کے باوجود معاشرہ اضطراب اور احتجاج کی کیفیت سے دوچار ہے۔ ہنگامے سر اٹھا رہے ہیں اور شہروں اور قصبوں میں آئے دن ریلیاں نکالی جا رہی ہیں اور بات بات پر دھرنے دیے جا رہے ہیں۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکمران طبقے میں فہم و فراست کے سرچشمے خشک ہو چکے ہیں اور فیصلہ سازی کا عمل جمود یا غفلت کا شکار ہے۔ چند ماہ پہلے اسلام آباد میں ایک سکندر نامی شخص نے دونوں ہاتھوں میں بندوقیں تھام کر پورے اسلام آباد کو یرغمال بنا لیا تھا۔ الیکٹرانک میڈیا نے ایک ہیجان برپا کر دیا تھا اور ہمارے وزیرِداخلہ ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ پچھلے

کئی دنوں سے الطاف بھائی کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کا ایشو ایک ارتعاش پیدا کر رہا ہے۔ ایک ڈیڑھ ماہ سے جیو کے خلاف اور فوج کے حق میں شہر شہر اور قصبے قصبے مظاہرے ہو رہے ہیں اور عوام لوڈشیڈنگ اور مہنگائی کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ بلوچستان' کراچی اور فاٹا میں انسان کا خون بہہ رہا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا نے بے حیائی اور شعائرِ اسلام کی بے حرمتی کا ایک طوفان اُٹھا رکھا ہے جبکہ حکومت مراقبے میں ہے۔ دراصل ایسے ہی حالات نادیدہ قوتوں کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس وقت مختلف عوامل کے باہمی تعامل سے ایک پیچیدہ صورتِ حال جنم لے رہی ہے۔ ایک طرف زخم خوردہ فوج' دوسری طرف میڈیا میں جاری سول وار اور تیسری طرف تاخیری حربے استعمال کرنے والی حکومت ہے جو اپنی بے عملی سے چنگاریوں کو شعلوں میں تبدیل کر رہی ہے۔

سیاست میں عسکری قیادت کی مداخلت اب مستحکم جمہوری ملکوں میں ایک ناقابلِ برداشت عمل ہے۔ پاکستان جمہوری عمل کے ذریعے معرضِ وجود میں آیا تھا۔ حضرت قائداعظم نے سٹاف کالج کوئٹہ میں فوجی افسروں سے خطاب کرتے ہوئے اُنہیں حلف کی اہمیت کا احساس دلایا اور یہ امر پوری قوت سے واضح کیا تھا کہ فیصلے عوام کے منتخب نمائندے اور اُن کی حکومت کرتی ہے اور فوج اُن کی پابند ہوتی ہے۔ ایک سال بعد پاکستان نے سلامتی کونسل میں اُس وقت کشمیر کے محاذ پر جنگ بندی قبول کر لی جب اُس کی فوجیں جموں کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں' تو سپاہ میں بے چینی پیدا ہوئی اور دل برداشتہ افسروں کے ایک ٹولے نے حکومت کا تختہ اُلٹنے کا منصوبہ بنایا جو بروقت پکڑا گیا۔ وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد سول بیوروکریسی منہ زور ہوتی گئی اور اس نے ملٹری بیوروکریسی کے ساتھ مل کر دستور سازی کا راستہ ایک سازش کے ذریعے روک دیا۔ 1954ء میں وزیراعظم محمد علی بوگرا جن کا تعلق مشرقی بنگال سے تھا' پارلیمنٹ سے ایک ایسا دستور منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے جس میں پارلیمان کے دو ایوان تھے۔ ایوانِ زیریں میں آبادی کے لحاظ سے مشرقی بنگال کی جبکہ ایوانِ بالا میں مغربی پاکستان کی اکائیوں کی اکثریت رکھی گئی تھی اور طے پایا تھا کہ قومی اہمیت کے معاملات پارلیمان کے مشترکہ اجلاس میں منظور کیے جائیں گے' مگر مغربی پاکستان کے طاقت ور عناصر مشرقی پاکستان کی اکثریت قبول کرنے پر تیار نہیں تھے' چنانچہ جب اکتوبر 1954ء میں دستور ساز اسمبلی آئین کی آخری خواندگی کر چکی' تو اُس وقت کے کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خاں لندن کے ایک ہوٹل میں پاکستان کا ایک نیا دستور تیار کر رہے تھے جس میں ون یونٹ اور پیریٹی کا فارمولا تجویز کیا گیا تھا۔ گورنر جنرل ملک غلام محمد نے عسکری قیادت کے ایما پر دستور ساز اسمبلی توڑ ڈالی اور ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی۔ اس ایمرجنسی کے دوران جو باصلاحیت کابینہ (Talented Cabinet) تشکیل دی گئی' اُس میں جنرل ایوب خاں وزیرِ دفاع بنائے گئے۔ اس طرح کم نظر سیاست دانوں' حکومت کے بدمست اعلیٰ عہدے داروں نے فوج کے کمانڈر ان چیف کو حکومت کے فیصلوں میں دخیل ہونے کا موقع دیا اور دوسری دستور ساز اسمبلی نے وہی آئین منظور کیا جس کے بنیادی نکات جنرل ایوب خاں نے طے کیے تھے۔ تب سے سول ملٹری تعلقات عدمِ توازن کا شکار چلے آ رہے ہیں اور سول ادارے روبہ زوال ہیں۔

☆

ملک میں پانچ بار مارشل لا نافذ ہوئے ہیں۔ دو بار آئین توڑنے کی "سعادت" جنرل پرویز مشرف کو حاصل

ہوئی۔ جس جرنیل نے بھی اقتدار سنبھالا‘ اُس نے سیاست والوں اور جرأت مند صحافیوں کے ساتھ نہایت برا سلوک روا رکھا اور قانون کی حکمرانی کا دامن تار تار کر ڈالا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سیاست دان جیلوں میں بھیجے گئے اور ان پر سیاست میں حصہ لینے پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ اس طرح حقیقی معنوں میں سیاسی عمل کے ٹوٹ جانے اور عوام کو اقتدار سے بےدخل کرنے کے نتیجے میں سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا۔ جنرل ضیاء الحق کے عہد میں جناب ذوالفقار علی بھٹو تختۂ دار پر لٹکا دیے گئے اور جنرل پرویز مشرف کے عہدِ ستم شعار میں وزیراعظم نواز شریف کو ناقابلِ تصور اذیت پہنچائی گئی اور ان کو سزائے موت دینے کی تیاریاں جاری تھیں کہ سعودی عرب نے اپنے اثر و رسوخ سے فوجی آمر کو شریف خاندان کی طویل جلاوطنی پر رضامند کر لیا۔ ان کے علاوہ خواجہ سعد رفیق‘ جناب پرویز رشید‘ خواجہ محمد آصف‘ رانا ثناء اللہ اور جناب صدیق الفاروق پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے گئے جو الفاظ میں بیان نہیں کیے جا سکتے۔ ریٹائرڈ جرنیل کے جرائم کی فہرست بڑی طویل اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہے۔ انہوں نے پاکستان میں چادر اور چار دیواری کی حرمت جس بےدردی سے پامال کی اور تجر کلچر کو پروان چڑھانے میں جو تمام اخلاقی حدیں عبور کیں‘ وہ اُن کا ایک ایسا جرم ہے جسے ہماری تاریخ اور ہماری دینی شناخت کبھی معاف نہیں کر سکے گی۔ آنے والی نسل ان سے ان ہزاروں شہیدوں کا حساب بھی لے گی جو دہشت گردی میں شہید ہوئے اور وطن کی عزت پر نثار ہو گئے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف کا دوسرا بڑا جرم یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی اقتدار کے لیے فوج کو استعمال کیا جس کے باعث عوام کی نگاہ میں اس کی عزت بہت کم رہ گئی تھی اور فوجیوں کے لیے وردی پہن کر سوسائٹی میں آنا محال ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی پکڑ انہیں دوبارہ پاکستان لے آئی ہے‘ حالانکہ انہیں فوج نے بڑی عزت کے ساتھ بیرونِ ملک رخصت کر دیا تھا۔

جنرل اشفاق پرویز کیانی مختلف وجوہ سے ایک بردبار اور دھیمے مزاج کے فوجی سربراہ ثابت ہوئے۔ وہ چھ برسوں میں ان زخموں کی بخیہ گری کرتے رہے جو پرویز مشرف نے سیاسی قیادتوں اور عوام کی عزتِ نفس پر لگائے تھے۔ جنرل کیانی نے پیپلز پارٹی کے حکمرانوں کی اشتعال انگیزیوں پر بھی بڑے صبر سے کام لیا اور جمہوریت سے ان کی کومٹمنٹ غیر متزلزل رہی۔ ان کے اس صحت بخش طرزِ عمل کی روشنی میں موجودہ عسکری قیادت کو بھی زخموں پر مرہم رکھنے کی حکمت عملی جاری رکھنا چاہیے۔ اسے جنرل پرویز مشرف کے خلاف آئین سے بغاوت کا مقدمہ چلنے پر جزبز ہونے کے بجائے یہ حقیقت قبول کر لینی چاہیے کہ حکومت نے عدالتِ عظمیٰ کی ہدایت پر آئین کے عین مطابق ایک خصوصی عدالت میں مقدمہ دائر کیا ہے۔ اس مقدمے کے معروف طریقے سے چلتے رہنے سے جنرل مشرف کو اپنے دفاع کا پورا موقع ملے گا اور فوج کا وقار بھی بلند ہو گا کہ وہ آئین اور قانون کی پاسداری کر رہی ہے۔ عین ممکن ہے کہ مشرف صاحب اپنی بےگناہی ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں یا ان کے وہ ساتھی بھی گرفت میں آ جائیں جو مشاورت میں بہت آگے آگے تھے۔ بعض حلقے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ طالبان سے مذاکرات کے بارے میں حکومت اور فوج یکساں نقطۂ نظر نہیں رکھتے‘ مگر یہ تاثر درست معلوم نہیں ہوتا‘ کیونکہ سارے فیصلے باہمی مشورے سے کیے جا رہے ہیں اور امن بھی کو مطلوب ہے۔ سوات آپریشن سے فوج کو اندازہ ہو گیا ہے کہ مضبوط سول انتظامیہ کے بغیر فوجی آپریشن سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ مذاکرات کے نتیجے میں طالبان کی تباہ کاریوں میں بڑی

کمی واقع ہوئی ہے۔ اس وقت نازک ترین اور حساس ترین صورتِ حال 19 اپریل کی شام سے جیو نیوز کی ان نشریات سے پیدا ہوئی ہے جس میں یہ تاثر دیا گیا کہ سینئر صحافی حامد میر پر کراچی کے حملے میں آئی ایس آئی کے ڈی جی ملوث ہیں۔ یہ نشریات آٹھ گھنٹے چلتی رہیں جنہیں روکنے کے لیے پیمرا یا حکومت کی طرف سے کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ جیو کی انتظامیہ نے بھی اس بہت بڑی فروگزاشت پر معذرت کرنے اور ایڈیٹوریل کنٹرول مضبوط بنانے کی ابھی تک ضرورت محسوس نہیں کی۔ حکومت کی طرف سے سردمہری کا طرزِ عمل دیکھتے ہوئے آئی ایس آئی نے وزارتِ دفاع کے ذریعے جیو کا لائسنس منسوخ کرنے کی پیمرا سے درخواست کی، مگر اس کے بورڈ نے کسی فوری کارروائی کے بجائے معاملہ وزارتِ قانون کو بھیج دیا۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ حکومت ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے۔ اس دوران فوج کے حق میں عوامی مظاہرے زور پکڑتے گئے اور مارننگ شو کے ایک اور پروگرام نے دینی اور عوامی حلقوں میں جیو نیوز کے خلاف شدید ردِعمل کی لہر دوڑا دی۔ اس ہنگامہ آرائی کے دوران عمران خاں، میر شکیل الرحمٰن اور انتخابی دھاندلیوں کے خلاف جہاد پر تُلے کھڑے ہوئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ حکومت ایک سخت آزمائش سے دوچار ہوتی جا رہی ہے۔

......☆......

جناب سینیٹر میاں رضا ربانی جن کی بات بڑے غور اور دھیان سے سنی جاتی ہے، انہوں نے سینیٹ میں کہا کہ 1977ء جیسے حالات بنتے جا رہے ہیں۔ ان کا اشارہ غالباً پی این اے تحریک کی طرف ہے جو انتخابات میں دھاندلیوں کے خلاف اُٹھی تھی اور مسٹر بھٹو کی حکومت سرنگوں ہوئی تھی۔ اس وقت عوام کے اندر نواز شریف حکومت گرانے کے لیے کوئی جوش و خروش نہیں پایا جاتا، مگر یہ امکان بڑھتا جا رہا ہے کہ الیکشن کمیشن نے جناب عمران خاں کی شکایات کی تحقیقات کا جو بیڑا اُٹھایا ہے اس کے ذریعے ہوشربا واقعات سامنے آ سکتے ہیں جو کسی بڑے احتجاج کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ الیکشن کمیشن نے حلقہ این اے 68 میں ووٹوں کی گنتی میں تضاد کی تصدیق کر دی ہے اور اسے ٹائپنگ کی غلطی قرار دیا ہے جس پر مزید تحقیقات جاری ہیں۔ ایسے موقع پر الیکٹرانک میڈیا ایک مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے جسے مختلف اسباب سے یہ زعم ہو گیا ہے کہ وہ حکومتیں بنانے کے ساتھ ساتھ گرا بھی سکتا ہے۔ جب پرویز مشرف کی ہدایت پر الیکٹرانک چینلز کو بڑی فراخ دلی سے لائسنس دیے گئے، تو خوشی کا احساس ہوا تھا کہ سرکاری کنٹرول میں چلنے والے ٹیلی ویژن کے علاوہ نئی چینلز دیکھنے کا موقع ملے گا اور ہماری معلومات میں اضافہ اور ہماری نظر میں وسعت پیدا ہو گی۔ اس میں شک نہیں کہ نئے ٹی وی چینلز نے ہمیں بی بی سی اور وائس آف امریکہ سے بے نیاز کر دیا ہے۔ جناب حامد میر اور جناب طلعت حسین بہت مہم جو ثابت ہوئے اور وہ عراق اور غزہ جا پہنچے اور میدانِ جنگ سے تازہ ترین خبریں بھیجتے رہے تھے۔ اس کے علاوہ جب 9 مارچ 2007ء کو چیف جسٹس افتخار محمد چودھری برطرف کیے گئے، تو ان کے حق میں وکلاء اور سول سوسائٹی نے جو تحریک چلائی، اس کی کامیابی میں الیکٹرانک میڈیا نے زبردست کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح پرویز مشرف کی ایمرجنسی پلس کے خلاف بعض میڈیا ہاؤس ڈٹ گئے تھے اور جیو نیوز نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔

معاشرے کو بہت کچھ دینے کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک چینلز رفتہ رفتہ خود سر ہوتے گئے اور اپنے آپ کو بادشاہ

کر (King Maker) سمجھنے لگے۔ پی ٹی وی اخلاقیات کا بڑا پاس رکھتا رہا ہے اور جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں اس سے نشر ہونے والے ڈرامے بہت شوق سے دیکھے اور بھارت میں برآمد کیے جاتے تھے۔ بیشتر اینکر پرسن تجربے کار اور پیشے کے اعتبار سے غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ زبان اور واقعات پر توجہ دیتے اور اپنی معاشرتی، مذہبی اور دینی اقدار سے وابستہ رہتے تھے۔ دراصل پی ٹی وی میں زیادہ تر فن کار اور اہلِ قلم ریڈیو پاکستان سے آئے تھے جہاں زبان و بیان، معتبر تاریخی شواہد اور مستند روایات کی بہت پابندی کی جاتی تھی۔ نئے چینلز جب دھڑا دھڑ کھلنے لگے تو معیاری پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت کا بہت کم اہتمام ہو سکا اور اپنی تاریخ اور تہذیب سے بے بہرہ نوجوان دیکھتے ہی دیکھتے اینکر کے نہایت ذمے دار منصب پر فائز ہوتے گئے۔ اُنھوں نے اپنے ناظرین کی ذہنی، اخلاقی اور سماجی تربیت کے بجائے مقبولیت کے نہایت غیر معیاری ہتھکنڈے اختیار کیے۔ خبریں جن میں حقائق اور واقعات معتبر انداز میں بیان کیے جانے چاہئیں، اُن میں بھی حاشیہ آرائی اور جانب داری کا عنصر داخل ہوتا گیا۔ "بریکنگ نیوز" کے شور شرابے میں ذہنی سکون تباہ ہو گیا۔ مسلمہ روایات کی رو سے ریاست اور سوسائٹی کے لیے بہت اہم خبر کو بریکنگ نیوز کا درجہ دیا جاتا ہے، مگر ہمارے نیوز چینلز نے گھٹے کے ایک چھوٹے اور غیر اہم واقعے کو قومی درجہ دے ڈالا اور اُسے بار بار نشر کرنا شروع کر دیا۔ پھر بریکنگ نیوز کا سحر طاری کرنے سکے لیے ایڈیٹوریل کنٹرول ڈھیلا چھوڑ دیا گیا اور واقعے کی مناسب چھان بین کے بجائے خبر میں سبقت لے جانے کے شوق نے چینل کے اعتبار کو بہت مجروح کیا ہے۔ آج کل ناظرین پر دن رات میں بریکنگ نیوز کے اتنے ہتھوڑے چلتے ہیں کہ وہ بیزاری سے ٹی وی ہی بند کر دیتے ہیں۔ دوادوی میں غیر مصدقہ اور بے بنیاد خبریں چلا دی جاتی ہیں، مگر کسی کو معذرت کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، کیونکہ وہ تو اپنے آپ کو احتساب سے ماورا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔

☆

اچھے دنوں کی بات ہے کہ اخبارات میں یہ اصول کارفرما تھا کہ ایڈیٹر اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں کوئی خبر یا تصویر شائع نہیں کرتے تھے۔ نوائے وقت کے ایڈیٹر جناب حمید نظامی کی والدہ کا انتقال ہوا، تو اُنھوں نے اس ارتحال کی خبر اپنے اخبار میں شائع نہیں کی کہ میرے قارئین کو اس خبر سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ٹی وی چینلز نے اس عمدہ حکمت عملی کے برعکس اپنے اینکر پرسنز کی شان میں بڑے بڑے اشتہار اخبارات میں دینا شروع کیے اور سکرین پر ان کی تعریف میں کاروبار کو فروغ دینے کے لیے قصیدہ خوانی ہونے لگی۔ اکثر "معززین" اپنی اس پوزیشن سے مفادات کی عظیم الشان عمارتیں کھڑی کرنے میں جتے ہوئے ہیں۔ پھر ٹاک شوز میں سیاسی جماعتوں کو مقبول یا غیر مقبول بنانے کا سلسلہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ ریٹنگ بڑھانے کے لیے شرکا کو ایک دوسرے پر جھپٹنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ سنجیدہ اور بلند پایہ مکالموں کے بجائے تو تڑاک اور بدتمیزی کا ماحول پیدا ہو چکا ہے۔ یہ تاثر عام ہے کہ مردوزن پہ کلام نرم و نازک بے اثر ہے۔ لوگوں کو شدید احساس ہے کہ زیادہ تر ٹاک شوز سیاسی قائدین اور مذہبی زعما کا مذاق اُڑانے کے لیے منعقد کیے جاتے ہیں اور ان کا بڑا مقصد اعلیٰ سیاسی حلقوں اور اہم اداروں میں اپنا اثر و رسوخ جمانا ہے۔ بعض سیاسی جماعتوں کے سربراہوں سے

اسکرین پر بڑی رعونت سے پیش آتے ہیں۔ اُن کا زعم ہے کہ ہمارا ایک انٹرویو سیاسی لیڈر کو ہیرو یا زیرو بنا سکتا ہے۔ ذہنی اور عسکری انتشار پھیلانے کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک میڈیا کے مارننگ شوز بے حیائی اور بدچلنی پھیلانے کا باعث بن رہے ہیں۔ بازاری عورتیں بھی ثقافتی عورتوں کا درجہ حاصل کرتی جا رہی ہیں۔ ایسے ایسے مناظر دکھائے جاتے ہیں کہ الامان الحفیظ۔ کنجروں کا کلچر ہمارے گھروں میں داخل کیا جا رہا ہے جس میں خاندان کی تباہی کے سارے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ناقدین اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ غیرملکی ایجنڈے پر ہمارے اخلاق اور ہمارے عائلی حصار مسمار کیے جا رہے ہیں۔

اب مفادات کی جنگ وار مختلف میڈیا ہاؤسز کے درمیان جو بے خونخوار انداز میں جاری ہے اور اہل صحافت کی عزت نیلام ہو رہی ہے۔ جیو نیوز کے دو پروگراموں کے خلاف ایک دنیا اٹھ کھڑی ہوئی ہے جو اس کے لائسنس منسوخ کرنے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ وکلا برادری اپنی بار میں جیو نیوز کی بندش کی قراردادیں منظور کر رہی ہے اور یہ سلسلہ تحصیل بار ایسوسی ایشنز کی سطح تک جا پہنچا ہے۔ اسی طرح دینی طبقے شدید غیظ و غضب کا اظہار کر رہے ہیں۔ فوج سے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا ہے جبکہ حکومت کی سست روی سے با اختیار پیمرا بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے اور مختلف اداروں کے اندر کشمکش گہری ہونے لگی ہے۔ جیو نیوز انتظامیہ کے لیے آج بھی یہ آپشن موجود ہے کہ وہ 19 اپریل کی نشریات پر کھلے بندوں معافی مانگے' پروگرام چلانے والوں کا کڑا احتساب کرے' ایڈیٹوریل کنٹرول کو موثر بنائے اور اپنے اندر محتسب کا ادارہ قائم کرے تاکہ دوبارہ کسی ناخوشگوار واقعے کے رونما ہونے کا امکان معدوم ہو جائے۔ اس کے علاوہ تمام الیکٹرانک چینلز کو اپنی نازک ذمے داریوں کا شدید احساس اور اخلاق عامہ کا احترام کرنا ہوگا۔ براہ راست پروگرام کم سے کم نشر کیے جائیں اور پیمرا کے ضابطے اور سماجی قدریں اولین اہمیت کی حامل قرار پائیں۔ فوج کے ساتھ جیو نیوز نے جو زیادتی کی ہے' اس کا بلاتاخیر مداوا ناگزیر ہے کہ فوج ہمارا بہت قیمتی سرمایہ ہے اور اس نے دفاع وطن میں بے مثال قربانیاں دی ہیں۔ حالات ایک نئی کروٹ لے رہے ہیں اور بھارت اور افغانستان کے انتخابات ہماری سیاسی اور فوجی قیادتوں کے لیے بڑے سنگین چیلنجوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ طالبان کے بعض عناصر سرکشی پر اترے ہوئے ہیں جن کے شمالی وزیرستان میں ٹھکانوں کو ہماری فضائیہ نشانہ بنا رہی ہے۔ ان پیچیدہ اور ناہموار حالات میں فوج کو الزامات کے کٹہرے میں کھڑا کر دینا خطرات کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ہماری سیاسی جماعتیں عوام سے دور ہوتی جا رہی ہیں اور حکومتوں کا انحصار چاپلوس بیوروکریسی پر ہے۔ وزیراعظم کی عدم دلچسپی کے باعث پارلیمنٹ کے دونوں ایوان اپنی حیثیت کھوتے جا رہے ہیں اور عوام اچھی حکمرانی کے لیے ترس گئے ہیں۔ حالات ایک نئی کروٹ لینے کو ہیں جن کو سنبھالنے کے لیے کردار کے غازیوں کو آگے آنا اور اسی جذبے سے کام لینا ہوگا جو پاکستان کی تشکیل کے وقت موجزن تھا۔ ارباب حکومت بھی بیدار ہونے لگے ہیں۔ انھیں فوج' میڈیا اور عوام کے اندر اُبلتے ہوئے جذبات کو نہایت سنجیدگی سے لینا اور ایک ایسا بجٹ پیش کرنا ہوگا جسے عام آدمی اپنا بجٹ سمجھ سکے اور تنازعات کا ایک ایسا تصفیہ دریافت کرنا ہوگا جو زخموں پر مرہم ثابت ہو۔ ہماری ریاست ہم سب کو اپنے تحفظ کے لیے آواز دے رہی ہے۔

◆◆◆

پڑوس میں آگ سلگ اٹھی

بھارت کے ناخوش فوجی

افسر شاہی کی مکاریاں اور سیاست دانوں کی غفلت لاکھوں بھارتی فوجیوں کو غم و غصے میں مبتلا کر چکی۔ قدیمی حریف کی کمزوریاں عیاں کرتی چشم کشا رپورٹ

کرنل فضل الرحمٰن

یہ نومبر 2013ء کی بات ہے۔ بھارتی شہر میرٹھ کا رہائشی صوبے دار (ر) پرکاش چندر تپ دار بخار میں مبتلا ہو گیا۔ مقامی اسپتال میں علاج کرایا مگر افاقہ نہ ہوا۔ چناں چہ ڈاکٹر نے اُسے ملٹری اسپتال بھجوا دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ یرقان کا شکار ہو چکا تھا۔

یکم دسمبر کو صوبیدار کے بیٹے، رتیش چندر نے بیمار باپ کو گڑگاؤں کے ایک نجی اسپتال میں داخل کرایا۔ یہ اسپتال سابق بھارتی فوجیوں کے علاج معالجے کی خاطر فوج سے منظور شدہ تھا۔ چناں چہ حسب قاعدہ وہاں صوبیدار (ر) پرکاش چندر کا مفت علاج ہونا چاہیے تھا۔

مگر رتیش چندر کو یہ جان کر صدمہ پہنچا جب اسپتال انتظامیہ نے اُسے بتایا "علاج کا معاوضہ پیشگی ادا کر دو یا اپنے باپ کو کہیں اور لے جاؤ۔" چونکہ تب تک والد کی طبیعت بہت بگڑ چکی تھی، سو بیٹے نے بھاگ دوڑ کر کے دو لاکھ روپے جمع کرائے اور باپ کو اسپتال میں داخل کرا دیا۔

لیکن صوبیدار (ر) پرکاش چندر کی طبیعت سنبھلنے

کے بعد بگڑتی چلی گئی۔ آخرکار اُسے وینٹی لیٹر پر ڈال دیا گیا۔ اُدھر اسپتال کے اخراجات بڑھتے چلے گئے۔ ایک ماہ علاج کے بعد بوڑھا فوجی چل بسا۔ تب تک ساڑھے بارہ لاکھ روپے کا بل بن چکا تھا۔ اسپتال انتظامیہ نے بل ادا کیے بغیر بوڑھے کی لاش بیٹے کو دینے سے انکار کر دیا۔

بے یارومددگار رمیش چندر کو میرٹھ میں اپنا گھر گروی رکھنا پڑا تاکہ باپ کی لاش اسپتال انتظامیہ کی "تحویل" سے چھڑوا سکے۔ اسپتال کے ایک سینئر ڈاکٹر نے اُسے بتایا "ملٹری ہیڈکوارٹر اور وزارت دفاع میں ہمارے کئی بل پھنسے رہتے ہیں۔ جن کی ادائی ہوتے برسوں لگ جاتے ہیں۔ اسی لیے اب سابق فوجیوں سے ہم پیشگی خرچ لے رہے ہیں۔"

بیچارا رمیش اب دہلی میں آرمی ہیڈکوارٹر کے چکر لگا رہا ہے۔ اس کی تمنا ہے کہ باپ کے علاج پر جو اخراجات اٹھے ہیں' ان میں سے کچھ رقم تو واپس مل جائے۔ وہ آنسو بہاتے ہوئے کہتا ہے "میرے والد نے اپنی پوری جوانی مادرِ وطن کا دفاع کرتے بتا دی۔ لیکن ان سے جو ظالمانہ سلوک کیا گیا' اس کی ہرگز توقع نہ تھی۔"

مسائل میں گرفتار بھارتی فوج

یہ محض ایک واقعہ نہیں' بھارت بھر میں لاکھوں فوجی اور شہری اپنی حکومت اور فوج کی ناروا پالیسیوں کے باعث غم و غصے اور ناخوشی کا شکار ہیں۔ تنخواہ سے لے کر پنشن ملنے تک بھارتی فوجی اپنی فوج و حکومت سے ناخوش رہتے ہیں۔ اسی لیے نوجوان بھارتی نسل اب افواج میں جانے سے کتراتی ہے۔

سابقہ فوجیوں کی ہیلتھ اسکیم ہی کو لیجیے۔ ایکس سروس مین کنٹری بیوٹری ہیلتھ اسکیم کی بنیاد اپریل 2003ء میں رکھی گئی۔ گیارہ سال بیت چکے' یہ سابق فوجیوں کی ناپسندیدہ بن گئی۔ وجہ یہ ہے کہ وفاقی بجٹ میں اس کے لیے بہت کم رقم رکھی جاتی ہے۔ مثلاً سابق سرکاری ملازم "سنٹرل گورنمنٹ ہیلتھ اسکیم" کے ذریعے مفت علاج کی سہولیات پاتے ہیں۔ 2013-14ء کے بجٹ میں اس اسکیم کے لیے فی آدمی 10,700 روپے رکھے گئے جبکہ سابق فوجیوں کی اسکیم کے واسطے فی آدمی 3150 روپے مختص ہوئے۔

چناں چہ سابق فوجیوں کی ہیلتھ اسکیم میں پہلے جو تمام بڑے معیاری اسپتال پینل پر تھے' وہ معمولی رقم ملنے پر رفتہ رفتہ نکل گئے۔ اب سابق فوجی مجبور ہیں کہ اگر ان کے قریب پاس کوئی ملٹری اسپتال نہیں' تو وہ غیرمعیاری اسپتال سے سستا علاج کرائیں یا پھر نجی اسپتال کو منہ مانگی رقم دیں۔ ایک اور مصیبت یہ ہے کہ فوج و حکومت اسپتالوں کے بل جلد ادا نہیں کرتی۔ عموماً بل ادا ہوتے برسوں لگ جاتے ہیں۔ اس خرابی نے بھی کئی اسپتالوں کو سابق فوجیوں کی ہیلتھ اسکیم سے دور کر دیا۔ چناں چہ اب یہ منصوبہ سابق فوجیوں کے لیے سودمند نہیں بلکہ وبالِ جان بن چکا ہے۔

تنخواہ میں عدم توازن

کئی سو سال قبل سیاسی حکمت عملی کے ہندو ماہر چانکیہ نے چندرگپت موریہ کو یہ نصیحت کی تھی: جس دن فوجی آپ سے تنخواہ مانگنے لگیں' یہ ریاست کے لیے

بہت افسوس ناک بات ہوگی۔ کیونکہ اگر فوج کو حق نہ ملے تو بادشاہ وپر اس کا اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے۔"

آج چانکیہ و چندر گپت موریہ کی وارث بھارتی حکومت کھلے عام درج بالا نصیحت کی دھجیاں اُڑا رہی ہے۔ بھارت میں فوجیوں کی مٹی پلید ہونے کا یہ عالم ہے کہ اب انھیں اپنے حقوق حاصل کرنے کی خاطر سپریم کورٹ سے مدد لینا پڑتی ہے اور حیرت انگیز بات یہ کہ بظاہر طاقتور سپریم کورٹ بھی افواج بھارت کو ان کا حق نہیں دلوا سکی۔

1973ء تک بھارتی افواج علیحدہ پے کمیشن یا تنخواہوں کے تعین کا نظام رکھتی تھیں۔ اس کمیشن کے تحت فوجی افسران و فوجیوں کی تنخواہیں خاصی معقول تھیں۔ مگر افسر شاہی یا بیوروکریسی کو پسند نہ آیا کہ افواج کی تنخواہیں اتنی زیادہ رہیں۔ چناں چہ اس نے 1973ء میں وزیراعظم اندرا گاندھی کو افواج کے خلاف اتنا بھڑکایا کہ انھوں نے فوجی پے کمیشن ہی ختم کر دیا۔

اسی دوران افسر شاہی چوتھا پے کمیشن تیار کر چکی تھی جو بیوروکریسی اور افواج' دونوں پر لاگو ہوا۔ افسر شاہی نے الفاظ کا روایتی گورکھ دھندا تیار کیا اور اس کے پردے میں افواج کی تنخواہیں کم کر ڈالیں۔ بیچارے فوجی افسر یہی سمجھے کہ ان کی تنخواہیں بیوروکریسی کے برابر آ گئی ہیں۔ حقیقتاً چالاک بھارتی افسر شاہی نے یہ چال چلی کہ فوجی افسروں اور جوانوں کی تنخواہ میں سالانہ اضافہ اپنے اضافے سے کم رکھا۔

آخر 1996ء میں اعلیٰ تعلیم یافتہ فوجی افسر میجر (ر) ایس کے دھن پالان پہ بیوروکریسی کی سازش افشا ہوئی۔ اس نے کیرالہ ہائی کورٹ میں حکومت کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تاکہ بیوروکریسی کے مانند فوجی افسروں کی تنخواہوں میں بھی اتنا ہی سالانہ اضافہ ہو سکے۔ اضافے کا مطالبہ جائز تھا سو میجر (ر) ایس کے دھن پالان نے مقدمہ جیت لیا۔

جب میڈیا کے ذریعے مقدمے کی تفصیل بھارت بھر میں پھیلی تو دیگر ریٹائرڈ فوجی افسروں و فوجیوں کو بھی احساس ہوا کہ انھیں بھی اپنا حق مانگنا چاہیے۔ سو ہزارہا فوجیوں نے ملک بھر کی ہائی کورٹس میں مقدمے دائر کر دیے۔ بھارتی حکومت کی درخواست پر ان تمام مقدمات کو ایک مقدمے کی شکل دے کر سپریم کورٹ بھجوا دیا گیا۔

8 مارچ 2010ء کو سپریم کورٹ نے ریٹائرڈ فوجی افسروں کے حق میں فیصلہ دیا۔ نتیجے میں حکومت کو حکم دیا گیا کہ وہ مع سود سالانہ ترقیوں کا معاوضہ افواج کے سبک دوش افسروں و جوانوں کو ادا کرے۔ اس فیصلے سے بیس ہزار سے زائد فوجیوں کو فائدہ پہنچا۔

لیکن افسر شاہی کی "مہارت" پھر جاگی اور فیصلے پر ایک اعتراض لگا کر اسے واپس بھجوا دیا گیا۔ اس کے بعد اعتراضات کا سلسلہ چل نکلا۔ ایک رفع ہوتا' تو دوسرا سامنے آ جاتا۔ چناں چہ پچھلے چار برس سے مقدمہ بدستور سپریم کورٹ میں اٹکا ہوا ہے۔

پچھلے دنوں بھارتی بری فوج کے ریٹائرڈ اعلیٰ افسر وزیر دفاع سے ملے۔ تب حکومت نے یہ مجبوری بیان کی کہ وہ بیس ہزار سے زائد فوجیوں کو معاوضہ دینے کا بھاری مالی بوجھ نہیں اُٹھا سکتی۔ سو اس معاملے میں بھی بات چیت چل رہی ہے۔ مگر یہ صورت حال سابقہ فوجیوں ہی کو نہیں اس نئی نسل کو بھی افواج سے متنفر کر

رہی ہے جو اپنا کیریئر بہ حیثیت فوجی بنانا چاہتے تھے۔

پنشن میں کٹوتی کی مصیبت

بھارتی فوجی جوانوں کو پنشن کے معاملات میں بھی کئی مسائل کا سامنا ہے۔ چھٹے بنیادی پے کمیشن کی رو سے سرکاری افسر کو دوران ملازمت ہر دس، بیس اور تیس سال بعد خودبخود (آٹومیٹک) ترقی مل جاتی ہے۔ جبکہ ایک فوجی کو ہر آٹھ، سولہ اور چوبیس سال بعد ترقی ملتی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ افواج میں زیادہ سے زیادہ جوان خون رکھنے کی خاطر بیشتر فوجیوں کو پندرہ تا انیس سال کی ملازمت کے بعد ریٹائر کر دیا جاتا ہے۔ سو وہ سرکاری افسروں کے برعکس کم از کم ایک کیریئر ترقی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ نقصان ان کی پنشن میں خاصی کمی کی صورت نمایاں ہوتا ہے۔ بھارتی افواج چاہتی ہیں کہ جو جوان قبل از وقت ریٹائر ہو اُسے خودبخود نائب صوبیدار کا عہدہ مل جائے۔ تاہم حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا۔

حکومت اور سبکدوش ہونے والے فوجی افسروں و جوانوں کے مابین پنشن سے متعلق ایک اور مسئلے پہ گھمسان کی لڑائی جاری ہے۔ سرکاری قوانین کے مطابق سبکدوش فوجی افسر یا جوان ساٹھ برس کی عمر تک سرکاری محکموں میں کام کر سکتا ہے۔ تاہم اس کے معاوضے سے پنشن کی رقم منہا کر لی جاتی ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ اگر پنشن بڑھ جائے، تو اتنی ہی رقم کاٹی جانے لگتی ہے۔

اس اقدام کو غیر قانونی سمجھتے ہوئے بہت سے فوجی افسر سپریم کورٹ پہنچ گئے۔ 8 دسمبر 1994ء کو جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس پی ایل ہانسریہ پہ مشتمل بنچ نے سبکدوش شدہ فوجی کی تنخواہ سے پنشن کاٹنے کا عمل غیر آئینی قرار دے ڈالا۔ نیز حکومت کو حکم دیا کہ وہ تمام متاثرہ فوجیوں کے واجبات ادا کرے۔ حکومت وقت نے فیصلے کے خلاف اپیل کی جو نامنظور ہوئی۔

اس عدالتی فیصلے کے بعد حکومت نے پنشن کی رقم منہا کرنا بند کر دی۔ لیکن دسمبر 1997ء سے پھر کاٹی جانے لگی۔ سابق فوجی افسر معاملہ دوبارہ عدالتوں میں لے گئے۔ اب تک دہلی ہائی کورٹ "دو دفعہ" فوجی افسروں کے حق میں فیصلہ دے چکی۔ لیکن حکومت مسلسل ان کی پنشن کی رقم کاٹ رہی ہے۔ اس حقیقت سے عیاں ہے کہ بھارتی حکومت قانون و انصاف کو قطعاً اہمیت نہیں دیتی اور سابق فوجی بدستور ناانصافی کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

اب پنشن کے معاملے میں ایک اور ظلم ملاحظہ فرمائیے۔ کوئی بھارتی فوجی چل بسے، تو اس کی بیوہ کو صرف 3500 روپے ماہانہ پنشن ملتی ہے۔ یہ اونٹ کے منہ میں زیرہ دینے کے مترادف ہے۔ حاضر و سابق فوجی افسر کئی بار اپنی حکومتوں سے درخواست کر چکے کہ وہ پنشن کی رقم کم از کم دس ہزار روپے مقرر کرے، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔ اُدھر بھارتی فوجی جوان سوچتے ہیں "حکومت ہماری خدمات کا یہ صلہ دیتی ہے؟"

فوجی ووٹ نہیں ڈال سکتے

یہ 1969ء کی بات ہے، ناگالینڈ کے ریاستی

انتخابات میں ایک امیدوار ہار گیا۔ بعدازاں اس نے گوہاٹی ہائی کورٹ میں یہ درخواست دی کہ اس کے حلقے کا نتیجہ کالعدم قرار دیا جائے۔ وجہ یہ بتائی کہ اس کے حلقے میں سیکڑوں فوجی تعینات تھے۔ سو انھوں نے مخالف امیدوار کو ووٹ دے کر اسے جتوا دیا۔

امیدوار کا استدلال یہ تھا کہ وہ فوجی حلقے کے رہائشی نہیں تھے۔ سو انھیں ووٹ ڈالنے کا حق بھی نہیں ملنا چاہیے۔ گو یہ استدلال بودا نہ تھا' مگر ہائی کورٹ نے انتخابی نتیجہ برقرار رکھا اور درخواست خارج کر دی۔ اس پر کانگریسی امیدوار سپریم کورٹ پہنچ گیا۔ وہاں بھی اس کی درخواست کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

مگر اندرا گاندھی حکومت عدلیہ کو کب خاطر میں لاتی تھی؟ وزیراعظم نے 1972ء میں "اسپیشل آرڈر" جاری کر کے فوجیوں کے ووٹ دینے پر پابندی لگا دی۔ اب صرف وہی فوجی پوسٹنگ کی جگہ ووٹ ڈال سکتے ہیں جو وہاں تین برس سے زیادہ عرصہ تعینات رہے ہوں۔ لیکن فوج میں کسی جگہ تین برس تک رہنا ناممکن کی بات ہے۔

چناں چہ آج بھارتی فوجی صرف بذریعہ ڈاک ہی ووٹ ڈال سکتے ہیں جو خاصا پیچیدگیوں سے پُرعمل ہے۔ اسی باعث لاکھوں فوجی اپنا حق رائے دہی استعمال نہیں کر پاتے اور جمہوری عمل سے کٹے ہوئے ہیں۔ فی الوقت بھارتی سپریم کورٹ میں یہ مقدمہ زیرسماعت ہے کہ فوجی جس جگہ تعینات ہوں' وہاں انھیں ووٹ ڈالنے کی اجازت دی جائے۔

ذہنی دباؤ کا شکار بھارتی فوجی

تنخواہ کی کمی سہولتیں نہ ہونے کے برابر اوپر سے افسروں کے نخرے..... یہ سب عوامل بھارتی فوجیوں کو ذہنی مریض بنا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے' آج بھارتی افواج کے اپنے اعداد و شمار انکشاف کرتے ہیں کہ اتنے فوجی میدان جنگ میں نہیں مرتے جتنے خودکشیاں کر کے خود کو ہلاک کروا لیتے ہیں۔

حقائق کے مطابق 2003ء سے ہر سال تقریباً "ایک سو" بھارتی فوجی خودکشی کر رہے ہیں۔ جب وہ ملازمت اور گھریلو حالات سے متعلق مسائل حل نہیں کر پاتے' تو ذہنی پریشانیاں انھیں اپنی جان لینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

افواج سے آنے والی منفی خبروں کے باعث ایک اور نئے عجوبے نے جنم لیا۔ وہ یہ کہ اب بھارتی نئی نسل کے لیے عسکری شعبہ پُرکشش شعبے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ چناں چہ خصوصاً بھارتی بری فوج میں افسروں اور جوانوں کی کمی واقع ہو چکی۔

اعداد و شمار کی رو سے بری فوج 10,100 افسروں اور 32,431 جوانوں کی کمی کا شکار ہے۔ مزید برآں صرف پچھلے تین برس میں "پچیس ہزار" سے زائد جوان قبل ازوقت ریٹائرمنٹ لے چکے۔

اب حال یہ ہے کہ بھارتی بری فوج کے بیشتر یونٹوں میں افسروں کی تعداد دس تا بارہ ہے۔ جبکہ معمول کے مطابق 22 تا 27 ہونی چاہیے۔ یاد رہے ایک یونٹ میں چھے سو تا آٹھ سو فوجی موجود ہوتے ہیں۔ افسروں کی کمی کے باعث بچے کھچے افسر جوانوں پر توجہ نہیں دے پاتے۔ سو افسروں اور جوانوں کے درمیان دوریاں بڑھ رہی ہیں۔ یہ ایک بڑی خرابی ہے جو بھارتی فوج کے پیشہ ورانہ امور پر اثرانداز ہوگی۔

●●●

امریکہ کے ممتاز سیاہ فام رہنما

میلکم ایکس کا قبولِ اسلام

اس امریکی رہنما کی زندگی سے ملنے والے 5 سبق ہماری دنیا و آخرت بھی سنوار سکتے ہیں

وائل حمزہ
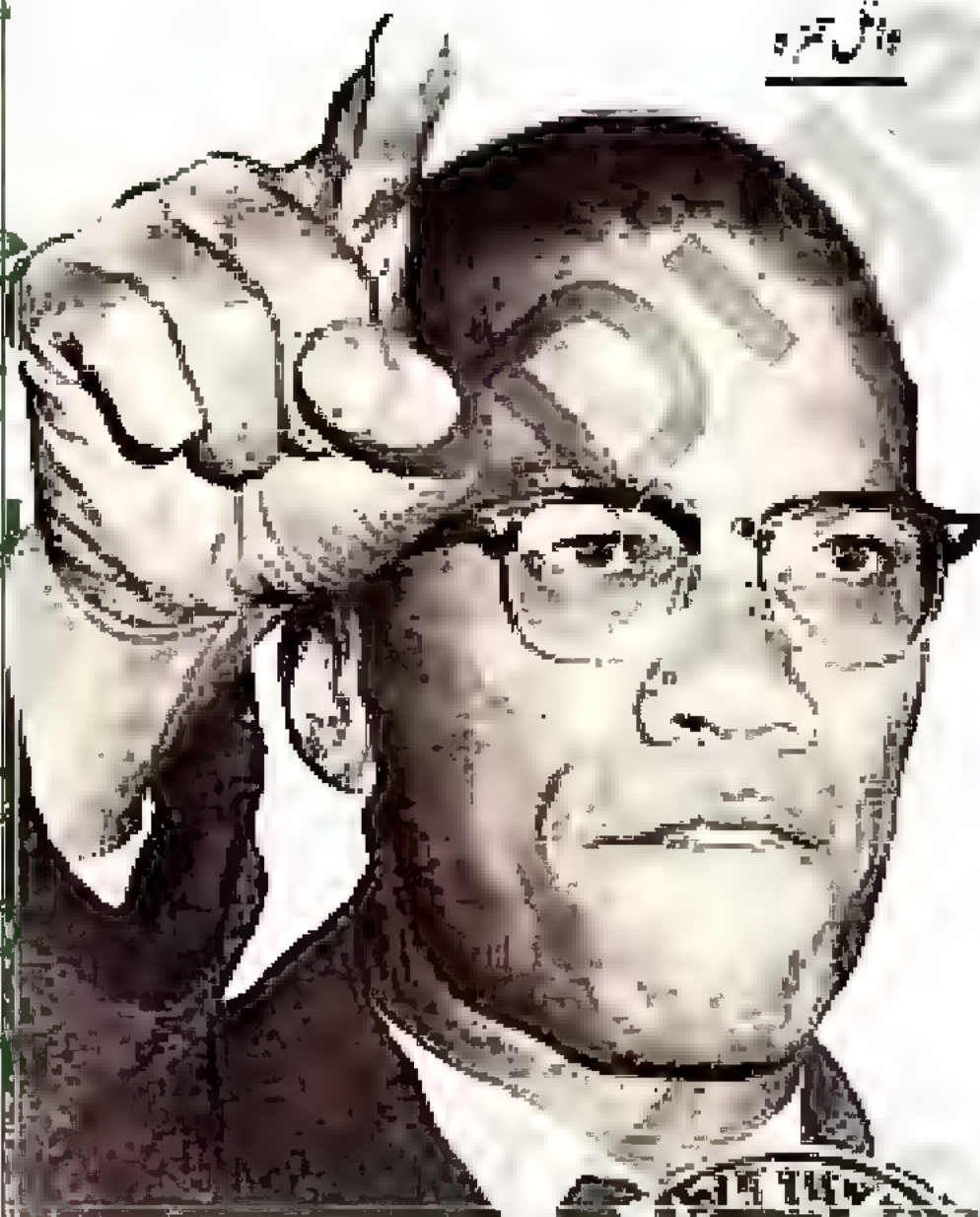
پچھلے سال میں امریکا گیا تو عام امریکیوں سے دوران گفتگو انکشاف ہوا کہ ان میں میلکم ایکس (Malcolm X) (19 مئی 1925ء تا 21 فروری 1965ء) بہت مشہور ہیں۔ گو اسلام قبول کر لینے کے بعد ان کا اسلامی نام ملک الشہباز رکھا گیا مگر وہ مقبول نہ ہو سکا۔

میلکم ایکس (1925ء-1965ء) ایک غیر معمولی انسان تھے۔ دنیا بھر میں انھیں ایسا رہنما سمجھا جاتا ہے جو امریکا میں سفید فاموں کی برتری کے خلاف کھڑے ہوئے۔ انھوں نے پھر سیاہ فاموں کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے بڑی جدوجہد کی اور آخرکار مخالفین کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

یہ امریکی راہنما اس لیے بھی اہم ہیں کہ ان کی داستانِ حیات میں سبھی انسانوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے بہت اہم اسباق پوشیدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سچی داستانوں کی بہت اہمیت ہے۔ قرآن پاک میں اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا: ''(لوگوں کو) قصے سنایئے تاکہ وہ غور و فکر کریں اور ان سے عبرت پکڑیں۔'' (7-176)

حقیقت یہ ہے کہ جب انسانوں کی سوانح حیات سچی ہوں، ان سے جدوجہد، محنت اور سچائی ظاہر ہو تو وہ ذاتی نشوونما کا بہترین ذریعہ بن جاتی ہیں۔ یہ دراصل تاریخ کا ایسا آئینہ ہے جس میں منظم طور پر مستقبل کو دیکھنا ممکن ہے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ زندگی کا نمونہ ایک ہی چلا آ رہا ہے، بس اسے دریافت کرنے کی

تعمیر شخصیت کے حوالے سے میلکم ایکس کی کہانی بڑی اہم ہے۔ وہ ہمارے لیے اجنبی نہیں بلکہ جانے پہچانے شخص ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جن مشکلات کا سامنا کیا اور جو مسائل انھیں پیش آئے، ہم سب بھی روزمرہ زندگی میں ان سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔

داستانِ حیات پر ایک نظر

میلکم ایکس کے والد پادری تھے۔ وہ صرف چھے سال کے تھے کہ والد قتل ہو گئے۔ ان کی والدہ نے بقیہ زندگی پاگل خانے میں گزاری۔ میلکم پھر مختلف گھروں میں پلے بڑھے۔ ہر جگہ انھیں نسلی تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی باعث وہ لڑکپن میں جرائم کی طرف راغب ہوئے اور 1945ء میں جیل پہنچ گئے۔ تب ان کی عمر بیس سال تھی۔

جیل میں ان کی ملاقات ایک انتہا پسند مسلم امریکی تنظیم، نیشن آف اسلام کے راہنماؤں سے ہوئی۔ یہ تنظیم جارحانہ انداز میں سیاہ فاموں کو سفید فام اکثریت کے ظلم وستم سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ سو اس کا ایجنڈا سیاہ فاموں کی برتری کی ترویج بن گیا۔

اگرچہ اس تنظیم کا نام اسلامی ہے، مگر اس کے نظریات دین اسلام کے تابع نہیں ہیں۔ بہرحال 1952ء میں رہائی کے بعد میلکم ایکس اس تنظیم کے پرجوش مبلغ بن گئے۔ وہ بہترین مقرر اور جاذب نظر انسان تھے اس لیے جلد ہی نیشن آف اسلام کے اہم راہنماؤں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

عوام میں ان کی شہرت و مقبولیت دیکھ کر بانی تنظیم عالیجاہ محمد سمیت دیگر راہنما میلکم ایکس سے حسد کرنے لگے۔ یہ حسد رنگ لایا اور مارچ 1964ء میں میلکم نیشن آف اسلام سے علیحدہ ہو گئے۔ انھوں نے پھر مسلم موسک (Muslim Mosque inc.) کے نام سے نئی مذہبی تنظیم کی بنیاد رکھی۔

انھی دنوں امریکا کے سنی مسلمانوں نے میلکم ایکس کو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے آگاہ کیا۔ چناں چہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے کے صرف ایک ماہ بعد وہ فریضۂ حج کی ادائی کے لیے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ شہزادہ فیصل بن عبدالعزیز (مستقبل کے شاہ فیصلؒ) کو جب ایک امریکی نومسلم کی آمد کا پتا چلا تو انھوں نے اسے شاہی مہمان بنا لیا۔

دورانِ حج میلکم نے جب یہ دیکھا کہ سفید، کالے، پیلے، گندمی..... غرض ہر رنگ کے انسان بلاتفریق رنگ ونسل اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہے ہیں تو انھیں یقین ہو گیا کہ دین اسلام ہی نسلی تعصب کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ انھوں نے پھر مختلف اسلامی ممالک کا دورہ کیا اور متفرق حکمرانوں مثلاً جمال عبدالناصر، احمد بن بیلا اور کوامے نکروما سے ملے۔ جب میلکم واپس امریکا پلٹے تو ایک مختلف شخصیت میں ڈھل چکے تھے۔

میلکم دوبارہ سیاہ فام امریکیوں کے حقوق حاصل کرنے کی خاطر سرگرم ہو گئے۔ لیکن اس بار انھوں نے نیشن آف اسلام سے بالکل علیحدہ طریق کار اختیار کیا۔ 21 فروری 1965ء کے دن نیشن آف اسلام

کے دہشت گردوں نے میلکم ایکس کو شہید کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی شہادت میں امریکی خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ تھا جو امریکی سیاہ فاموں میں اسلام کی مقبولیت اور اس کے پھیلاؤ سے خائف ہو چکی تھیں۔

ذیل میں ان پانچ اسباق کا بیان پیش ہے جو میلکم ایکس شہید کی زندگی سے ہمیں حاصل ہوتے ہیں۔

پہلا سبق: اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں، ہم نہیں۔

میلکم ایکس نوجوانی میں ایک غنڈے اور اچکے کے روپ میں مشہور ہوئے۔ لیکن ان کی زندگی کا خاتمہ ایک منفرد راہنما کی حیثیت سے ہوا۔ آج کئی لوگ اچھے الفاظ میں ان کا ذکر کرتے اور ان کی جدوجہد سے خود بھی تحریک پاتے ہیں۔ ان کی داستان حیات دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے لیے مختلف منصوبے تخلیق کرتے ہیں۔

یہ دیکھیے کہ اس سیاہ فام امریکی راہنما کی زندگی مشکلات اور چیلنجوں سے بھرپور رہی، لیکن انہی کے باعث وہ میلکم ایکس کی صورت میں ڈھلے۔ ''کالا'' ہونے کی وجہ سے انھیں امریکی معاشرے میں قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا تو انھیں مسئلے کا احساس ہوا۔ میلکم ایکس پھر جان توڑ کر نسلی تعصب کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔

گو نیشن آف اسلام کوئی اسلامی تنظیم نہیں تھی مگر اس میں رہتے ہوئے میلکم نے قیادت و راہنمائی کے گُر سیکھے مثلاً انھیں اعتماد ملا کہ عوام میں تقریر کر سکیں۔ نیز تنظیمی صلاحیتوں سے متصف ہوئے۔

نیشن کے راہنماؤں سے تصادم ہوا تو میلکم ایکس تنظیم سے علیحدہ ہو گئے۔ بعدازاں انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اس عمل نے ان کی کایا پلٹ ڈالی۔ اگر میلکم ایکس کی زندگی میں یہ اتفاقات نہ آتے تو یقیناً وہ بطور عام انسان دنیا سے رخصت ہو جاتے، ایک عالمی لیڈر نہ بن پاتے۔

میلکم ایکس کی مثالی زندگی عیاں کرتی ہے کہ انسان کو کبھی مشکلات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالنا چاہئیں۔ وہ جواں مردی سے مسائل کا مقابلہ کرے کیونکہ یونہی انسان کندن بنتا ہے۔ ہزارہا لوگ میلکم کے مانند تکالیف اور دکھوں سے گزرتے ہیں۔ چونکہ وہ انھیں برداشت نہیں کر پاتے، سو ہیرو بننے کا موقع بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

اس ضمن میں حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان بھی بڑی سبق آموز ہے۔ کوئی لڑکا نہیں چاہتا کہ اس کے اپنے ہی بھائی اس سے نفرت کریں اور آخر اسے اغوا کر لیں۔ نہ ہی کوئی غلام بننا اور قید ہونا چاہتا ہے۔ مگر حضرت یوسف علیہ السلام ان تمام آزمائشوں میں گرفتار ہوئے۔

داستان یوسف کا سبق یہ ہے کہ انھوں نے تمام پریشانیاں خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور صبر کا دامن تھامے رکھا۔ وجہ یہی کہ وہ راضی بہ رضا تھے۔ انھیں یقین تھا ''میرے لیے اللہ نے جو منصوبہ بنا رکھا ہے اسی میں بہتری ہو گی۔''

دوسرا سبق: نتیجہ سب سے اہم ہے

شاید آپ کو خیال آئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام

مسلمان غیر مسلموں کی نظر میں

میں کئی ماہ آسٹریلیا میں مقیم رہا ہوں۔ ایک بار میلبورن میں مجھے روٹری کلب کی طرف سے تاٹارا (Tatlara) کے قصبے میں بہ حیثیت مہمان بلایا گیا۔ میزبانوں میں ایک امیر کبیر زمیندار مسٹر لوری بھی تھے جن کے پاس ہزاروں مویشی اور ہزاروں ایکڑ زمین اور اپنا سینا جہاز تھا۔ جب ان کی والدہ (عمر 90 سال) کو پتا چلا کہ میں پاکستان سے تعلق رکھتا ہوں تو انھوں نے بیٹے کو حکم دیا کہ مجھے 3 بجے ان کے پاس چائے پر لے جائے۔

جب میں گھر پہنچا تو لوری کی والدہ نے مجھے خوش آمدید کہا۔ لوری کے خاندان میں کل ملا کر 64 لوگ تھے۔ سب ادب سے بیٹھے تھے۔ والدہ نے مجھے بہ عزت بچوں سے متعارف کرایا۔ پھر وہ مجھے باہر لے گئیں اور ایک اینٹوں کا کمرا دکھایا جہاں دو پاکستانی مسلمان مقیم تھے۔ وہ 40 سال پہلے 1964ء میں ان کے ہاں مزدور کے طور پر آئے۔ ان کا تعلق حافظ آباد سے تھا۔ والدہ نے بتایا "میں نے ان سے زیادہ مخلص اور ایماندار لوگ نہیں دیکھے، اسی لیے میں نے آپ کو بلایا۔ لوگ سخت گرمی میں محنت کرتے۔ روزہ رکھتے (رمضان المبارک میں) اور صبح صبح قرآن پڑھتے۔" میں یہ باتیں سن کر دم بخود رہ گیا۔ اللہ کی شان ہے! مسلمانوں نے کہاں کہاں قرآن اور دین کا نام روشن نہیں کیا اور اب ہمارا جو حال ہے، آپ سے پوشیدہ نہیں۔

سڈنی کے بہت بڑے اسٹور (Gowings) کا ایک سکھ مینیجر ہم پاکستانیوں کو خوب جانتا تھا۔ ہم 25-20 مسلمان نماز جمعہ ادا کرنے اسٹور کے قریب واقع مسجد آتے تھے۔ اس نے ایک روز ہمیں بلایا اور کہا "میرے بھائی کے دماغ کا آپریشن ہونے والا ہے، آپ لوگ دعا کیجیے کہ وہ کامیاب ہو جائے۔" دراصل اس کے بھائی سے ڈاکٹر نے بھی کہا تھا کہ اب دعا کرو۔ سو وہ کہنے لگا "ان لوگوں سے بہتر کون ہو سکتا ہے جو دعا کر سکے؟"

آسٹریلیا کے بعد ایک اہم صنعتی ادارے کی طرف سے مجھے سوئٹزرلینڈ اور جرمنی جانے کا موقع ملا۔ بائی ٹیک کرائی کنٹرول کی تربیت پانے کے لیے وہاں میں 8 ماہ رہا اور بہت کچھ سیکھا۔ دوران قیام مسجدوں میں نومسلموں سے ملاقات ہوئی جن میں ایک سوئس اور دوسرے جرمن تھے۔ وہ کہتے تھے، ہمارے پاس دولت اور آسائش کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن دل تاریک تھا۔ اندر کی روشنی کی تلاش میں ہم نے اسلام قبول کر لیا اور اب بہت خوش اور مطمئن ہیں۔

اور میلکم ایکس کا مواز نہ آپ سے نہیں ہے۔ اللہ کے نبی سے کبھی کوئی جرم سرزد نہیں ہوا بلکہ دوسروں نے ان پر ظلم کیا۔ جبکہ میلکم نے تو جوانی میں ہر قسم کی بدی انجام دی اور خود اپنے آپ کو مصیبت و بلا میں گرفتار کرایا۔

یہی خیال امر یکی راہنما کی حیات کا دوسرا سبق نمایاں کرتا ہے۔ یہ کہ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ آپ کیا تھے اہم بات یہ ہے کہ آپ نے خود کو کیسا بنایا اور کیا روپ اختیار کیا۔

حضرت عمر فاروقؓ ایک زمانے میں اسلام کے کٹر دشمن تھے۔ وہ غریب و لاچار مسلمانوں پر تشدد کرتے تھے تاکہ وہ آبائی مذہب سے دستبردار نہ ہوں۔ گویا حالت کفر میں آپ ظالم کے طور پر نمایاں ہوئے۔ آپ کی نسبت میلکم کے جرائم کی شدت کم تھی۔

لیکن جب حضرت عمر فاروقؓ نے حق کی راہ اپنائی تو ان کی کایا ہی پلٹ گئی۔ قبول اسلام ان کی حیات میں

انقلاب لے آیا۔ انھوں نے پھر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پانے کے لیے زندگی بتائی اور راہِ خدا ہی میں شہید ہوئے۔ چناں چہ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ حضرت عمر فاروقؓ نوجوانی میں کیسے تھے' بنیادی امر یہ ہے کہ آپؓ کی زندگی کا خاتمہ کس حیثیت سے ہوا۔

ایک اور مثال ملاحظہ فرمایئے۔ عکرمہ بن ابی جہل نوجوانی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب فتح شہر کے موقع پر رسول اللہؐ مکہ میں داخل ہوئے' تو صرف عکرمہ اور ان کے ساتھیوں نے مسلم سپاہ پر تلوار اٹھائی۔

نبی کریمؐ نے قتل کے چند مرد و زن کے سوا تمام اہل مکہ کو معاف فرما دیا۔ ان مٹھی بھر مجرموں میں عکرمہ بھی شامل تھے۔ لیکن ان کی اہلیہ نے رسول اللہؐ سے انھیں معافی دلوا دی۔

عکرمہ بن ابی جہل پھر رحمت للعالمین سے جا کر ملے۔ نبی کریمؐ سے گفتگو ہوئی تو اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ حضرت عکرمہؓ پھر اسلام کے بہادر سپاہی کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ انھوں نے کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی اور شہید کا انتہائی بلند درجہ پایا۔ آج بھی مسلمان ان کا ذکر عقیدت و احترام سے کرتے ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عکرمہؓ اور میلکم ایکس کی داستانِ حیات یہ حقیقت بھی اجاگر کرتی ہے کہ جب انسان کے سامنے سچائی آئے' تو ضروری ہے' وہ اسے سینے سے لگا لے۔ اگر میلکم تبدیل نہ ہوتے' تو آج ان کا شمار ہیروز کے بجائے مجرموں میں ہوتا۔ اسی طرح خدانخواستہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عکرمہؓ مخالف اسلام رہتے' تو تاریخ میں ان کا ذکر بھی مختلف انداز سے کیا جاتا۔

تیسرا سبق: سچ کی تلاش ضروری ہے

سچائی کی کھوج میں میلکم ایکس نے بڑی جدوجہد کی اور کئی مشکلات برداشت کیں۔ سو ان کی زندگی سب کے لیے بڑی "انسپائرنگ" ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں' ہم اپنے طریقے سے ان کی راہنمائی کرتے ہیں۔" (العنکبوت 69)

حق کی تلاش میں حضرت سلمان فارسیؓ کا سفر مثالی ہے۔ آپؓ آتش پرست تھے۔ باپ نے زمینوں کی دیکھ بھال کا کام سپرد کر رکھا تھا۔ ایک بار ان کی ملاقات پادری سے ہوئی جس نے انھیں خدا سے متعارف کرایا۔ وہ پھر سچائی کی کھوج میں قریہ قریہ گھومنے لگے۔ آخر ایک عارف نے انھیں خبر دی کہ وہ جن رسولﷺ کی تلاش میں ہیں' وہ کھجور کے درختوں کی سرزمین میں ملیں گے۔

حضرت سلمان فارسیؓ نے اپنا مال و سامان فروخت کیا اور ایک قافلے میں شامل ہو کر سوئے عرب چلے۔ قافلے والوں نے ظلم کیا اور انھیں غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ وہ پھر مختلف آقاؤں کے اسیر رہے۔ آخری آقا انھیں مدینہ منورہ لے آیا۔ یوں حضرت سلمان فارسیؓ آخر اپنی منزل تک پہنچ ہی گئے۔ انھوں نے پھر سچائی پانے میں

ایک لمحہ دیر نہیں لگائی۔ آج بھی مسلمان ان کا اسم گرامی احترام و تکریم سے لیتے ہیں۔

غرض ہر مسلم مرد و زن کو سچائی کی کھوج و جستجو ہونی چاہیے۔ آخر ہم روزانہ پانچ وقت نماز پڑھتے ہوئے یہی کہتے ہیں: "(اے اللہ) ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔" (الفاتحہ 6-5)

چوتھا سبق: سچ بولنے سے مت ہچکچایئے

میلکم ایکس کی داستانِ حیات کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ بعض لوگوں نے ان کی کایا پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کچھ افراد نے انھیں مجرمانہ زندگی سے نکالا۔ بعض نیشن آف اسلام کی طرف لائے اور دیگر نے اسلام قبول کرنے پر مائل کیا۔ یوں ان گمنام افراد نے میلکم کے دل و دماغ بدل ڈالے۔

گو یہ افراد عقل و دانش میں میلکم سے بدتر تھے لیکن وہ اس سیاہ فام راہنما کے لیے بہت قیمتی ثابت ہوئے۔ میلکم کو بعدازاں جو کامیابیاں ملیں، ان کا کچھ کریڈٹ انھیں بھی ملے گا۔

یہ گمنام اجنبی لوگ چاہتے تو میلکم کو نظرانداز کر دیتے۔ انھیں راہِ راست پر لانے والے امریکی مسلمان میلکم کو دشمن سمجھ سکتے تھے یا پھر نظریاتی مخالف! مگر انھوں نے میلکم کو ایسا بھٹکا ہوا انسان سمجھا جسے راہنمائی درکار تھی۔

ان کا مستحسن عمل افشا کرتا ہے کہ آپ کسی کو سچائی کی باتیں بتائیں تو اسے معمولی یا غیراہم کام نہ سمجھیے! کسی بھٹکے ہوئے انسان کو سیدھی راہ دکھانا کارِعظیم ہے... چاہے وہ اس پہ چلے یا نہیں۔

اسی حقیقت کی بنا پر سوتے وقت بچوں کو سنائی جانے والی اخلاقی و اسلامی کہانیاں بھی بچوں کی تشکیلِ سیرت و کردار میں بے پناہ اہمیت رکھتی ہیں۔ کیا خبر کہ ان میں کوئی اگلا ہیرو چھپا بیٹھا ہو۔

پانچواں سبق: اللہ تعالیٰ کی حکمت

میلکم ایکس کی زندگی میں سب سے بڑا انقلاب مکہ معظمہ پہنچ کر آیا جب انھوں نے دورانِ حج یہ دیکھا کہ ہر رنگ و نسل کے مرد و زن نے مل جل کر بڑے پیار اور امن سے حج کیا۔

وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سیاہ فام سفید فاموں کے شانہ بشانہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہے ہیں۔ اس عمل نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور میلکم کو احساس ہوا کہ صرف دینِ اسلام ہی رنگ و نسل کا تعصب ختم کر سکتا ہے۔ حج کا ایک پیغام یہی تو ہے۔

بعض مسلمان سوچتے ہیں کہ حج سال میں تین چار مرتبہ ہونا چاہیے تاکہ انسان بغیر بھیڑ کے حج کر سکے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ ہے کہ بموقع حج دنیا بھر سے لاکھوں مسلمان جمع ہو جائیں۔ اسی حکمت کی بنا پر سیاہ فاموں کی برتری کے مبلغ ایک امریکی کو احساس ہوا کہ تمام انسان برابر ہیں، صرف تقویٰ اور نیک عمل اچھے انسانوں کو ممتاز کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حاجی ملک الشہباز المعروف میلکم ایکس پہ رحم فرمائیں اور انھیں اپنے برگزیدہ بندوں میں شامل کریں۔

دوزخ کے در بند ہوئے

کھل گئے جنت کے دروازے

وہ مقدس ماہ صیام آ پہنچا جب انسان گناہوں سے بچ کر ڈھیروں ثواب کما سکتا ہے

[illegible]

رمضان شریف کے مبارک مہینے میں قرآن نازل ہوا اور اسی ماہ کے روزے ہر بالغ اور صحیح الدماغ مسلمان پر فرض کیے گئے۔ ان کا انکار کرنے والا کافر اور بلا عذر چھوڑنے والا گنہگار ہے۔ روزہ اسلام کا ایک اہم رکن ہے جس شخص کی زندگی میں یہ مہینہ آئے اسے روزے ضرور رکھنے چاہئیں۔ قرآن شریف میں روزے کے متعلق ارشاد ہے:

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے ان لوگوں پر فرض کیے گئے جو تم سے پہلے تھے۔ تاکہ تم ان حق کے دنوں میں پرہیزگاری حاصل کرو۔"

روزے سے مراد یہ ہے کہ صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانا پینا اور جنسی صحبت چھوڑ دے۔ بغیر

رویت ہلال کے بغیر نہ روزہ رکھنا چاہیے نہ چھوڑنا چاہیے۔ کیونکہ مہینا کبھی انتیس اور کبھی تیس کا ہوتا ہے لہٰذا چاند دیکھے بغیر (خواہ خود دیکھا جائے خواہ دو متقی مسلمانوں کی شہادت ہو) روزے شروع نہ کرے۔ اگر انتیس کو ابر ہو تو تیسواں روزہ بھی رکھنا چاہیے۔ لیکن قرب و جوار یا اور کہیں سے چاند دیکھنے کا ثبوت مل جائے یعنی چند معتبر آدمیوں نے امام وقت اور عالم دین کے سامنے شہادت دی کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا تو اس شہادت کو باور کرنے میں ذرا شبہ نہ ہونا چاہیے اور متقی حضرات بلا کھٹکے فتویٰ دے دیں۔ اگر آسمان پر ابر یا گرد و غبار کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا تو ایسے موقع پر ایک آدمی کی رویت بشرطیکہ متدین ہو معتبر ہو گی اور مطلع صاف ہونے پر خبر متواتر پر فیصلہ ہو گا۔

رمضان شریف اور روزوں کے متعلق آنحضرتؐ کے چند ارشادات یہ ہیں:

رمضان شروع ہونے پر جنت کے دروازے کھول اور دوزخ کے بند کر دیے جاتے ہیں۔ شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں۔ جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ ان میں ایک دروازے کا نام ریان ہے اور اس دروازے سے صرف روزے دار ہی گزریں گے۔ جس نے شخص ثواب اور ایمان کی خاطر روزے رکھے۔ اس کے سب گناہ بخش دیے جائیں گے۔ ہر نیک کام کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے: "لیکن روزے کی بات ہی الگ ہے۔ وہ تو صرف میرے لیے رکھا جاتا ہے۔ اس کا اجر بھی میں ہی دوں گا۔" جو شخص اس مہینا میں نوافل ادا کرے گا۔ اُسے دوسرے مہینوں کی فرض عبادتوں کے برابر ثواب ملے گا۔ جو شخص رمضان میں فرض ادا کرے گا وہ دوسرے مہینوں کے فرائض سے ستر گنا زیادہ ثواب حاصل کرے گا۔

یہ صبر کا مہینا ہے اور صابر کو جنت ملتی ہے۔ یہ مساکین اور غربا کی امداد کا مہینا ہے۔ اس میں مومن کے رزق میں کشادگی ہوتی ہے۔ جو شخص کسی روزے دار کا روزہ کھلوائے اس کو دوزخ کا منہ نہ دکھایا جائے گا اور اسے ویسا ہی اجر ملے گا جیسا روزے دار کو۔ مگر اس کے اپنے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی۔ اس مہینے کے پہلے عشرے میں رحمت الٰہی درمیانے عشرے میں بخشش الٰہی اور آخری عشرے میں دوزخ سے برأت ملتی ہے روزے دار کے منہ کی بُو خدا کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے۔

اگر کوئی شخص بغیر کسی مرض یا معقول وجہ کے ایک دن کا روزہ بھی توڑ دے اس کا کفارہ عمر بھر کے روزے رکھ کر بھی نہیں ادا کر سکتا۔ درمختار میں لکھا ہے کہ جو مسلمان رمضان میں دن کے وقت بلا عذر کھائے پیئے اس کا قتل کرنا واجب ہے۔ روزہ دار نہ کسی سے لڑے اور نہ کسی کو گالی دے۔ اگر کوئی گالی دے یا لڑے تو وہ کہہ دے میں روزے سے ہوں۔ جس روزے دار نے جھوٹ کہنا نہ چھوڑا اس کا روزہ ایک فعل عبث ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ کوئی بندہ بھوکا پیاسا رہے۔

روزے کی نیت کرنا ضروری ہے جو دل میں بھی کی جا سکتی ہے۔ زبان سے نیت کرنا مستحسن ہے گو ضروری نہیں۔ نیت کے لیے سحری کھانے کے بعد یہ الفاظ زبان سے ادا کرنے چاہئیں: وبصوم غد نویت من شہر رمضان۔ "میں نے رمضان کے آج کے دن کے روزے کی نیت کی۔" اگر یہ عربی الفاظ یاد نہ ہوں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ صرف دل میں نیت کر لینی کافی ہوگی۔ اگر دل میں بھی نیت نہ کی تو فرض روزہ

ادا نہ ہوگا۔ روزہ کھولنے کی نیت یہ ہے:

الھم انی لک صمت وبک امنت و علیک توکلت وعلی رزقک افطرت۔

"اے اللہ میں نے تیرے ہی لیے روزہ رکھا اور تجھ پر ایمان لایا اور تجھ پر توکل کیا اور تیرے دیے ہوئے رزق سے روزہ افطار کیا۔"

سحری کھانا سنت ہے خواہ چند لقمے ہی کھائے جائیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ سحری کھانے سے برکت ہوتی ہے لہٰذا سحری کھایا کرو۔

روزے میں غیبت سے خصوصی احتراز کرنا چاہیے۔ بعض احادیث کے مطابق روزے میں غیبت کرنے والے پر قضا لازم آتی ہے۔ غیبت سے روزہ ناقص ہو جاتا ہے اور علما کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس سے روزہ میں شدید قباحت پیدا ہوتی ہے۔

اگر بھول کر روزے میں کچھ کھا پی لے یا صحبت کر لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر غروب آفتاب سمجھ کر افطار کیا یا رات سمجھ کر سحری کھائی پھر معلوم ہوا کہ دن ہے تو روزے کی قضا لازم آتی ہے۔ کان میں پانی پڑنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن تیل ڈالنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ سر پر یا جسم پر تیل لگانے' خوشبو سونگھنے / لگانے یا سرمہ لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر اپنے آپ قے ہو جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا، جان بوجھ کر قے کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

اگر کلی کے دوران منہ میں پانی چلا گیا تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ روزے میں منجن استعمال کرنا مکروہ ہے البتہ مسواک کی اجازت ہے۔ اگر رات کو نہانے کی ضرورت پیش آئے اور اسی حالت میں صبح ہو جائے تو روزے میں قباحت نہیں ہوتی۔ علما کا فتویٰ ہے کہ روزے کی حالت میں انجکشن لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ مولانا عبدالحامد بدایونی کی رائے میں بازو میں انجکشن لگوایا جا سکتا ہے لیکن رگ میں نہیں۔ اشد ضرورت کی صورت ہی میں انجکشن لگوانا چاہیے۔

اگر کوئی شخص اچانک ایسا بیمار ہو جائے کہ اس کی جان پر بن جائے تو اس کے لیے روزہ توڑنا جائز ہے۔ اگر کوئی شخص بیمار ہو اور یہ ڈر ہو کہ روزہ رکھنا اس کے لیے مضر ہوگا تو جائز ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور قضا کر لے۔ حالت سفر میں بھی روزہ قضا کیا جا سکتا ہے۔ ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کی احادیث کے مطابق مسافر، دودھ پلانے والی حاملہ عورت کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے' لیکن بعد میں قضا ضروری ہے۔

حضور سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص رمضان شریف میں ثواب سمجھ کر قیام کرے اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ یہاں قیام سے مراد نماز تراویح ہے۔ اس میں بیس رکعتیں دو دو کر کے پڑھی جاتی ہیں۔ ہر چار رکعت کے بعد کچھ دیر خاموش بیٹھنا یا ذکر کرنا چاہیے۔ حسب ذیل تسبیح پڑھنا افضل ہے:

"سبحان ذی الملک و الملکوت سبحان ذی العزۃ والعظمۃ والھیبتہ والقدرۃ والکبریاء والجبروت سبحان الملک الحی الذی لاینام ولایموت سبوح قدوس ربنا ورب الملئکۃ والروح ط الھم اجرنا من النار یا مجیر یا مجیر یا مجیر۔"

"ترجمہ: اللہ جو ملک اور سلطنت کا مالک ہے پاک ہے وہ عزت اور عظمت والا، دبدبے اور قدرت والا، بڑائی اور غصہ والا پاک ہے، وہ بادشاہ ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے جو نہ سوتا ہے اور نہ مرتا ہے، پاک ہے،

اے ہمارے اور فرشتوں کے رب اور روحوں کے پروردگار تو بہت پاک اور مقدس ہے۔ اے اللہ ہمیں آگ سے بچانا، اے بچانے والے، اے بچانے والے اے بچانے والے!"

رمضان شریف میں شیطان کو بھی بند کر دیا جاتا ہے۔ روزے رکھنے سے ہزار سالہ عبادت کا ثواب ملتا ہے اور بہت سی برائیاں نامۂ اعمال سے حذف کر دی جاتی ہیں۔ شب قدر بھی اسی مہینے میں آتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس ماہ میں ایک ایسی طاق رات ہے جو ہزار راتوں سے افضل ہے۔ قرآن شریف میں بھی یہی ارشاد ہے۔ اس رات کو رمضان شریف کے آخری عشرے میں تلاش کرنا چاہیے۔ بیشتر علمائے دین کے نزدیک یہ ستائیسویں رات ہے۔

عام طور سے خیال ہے کہ لیلۃ القدر رمضان شریف کی ستائیسویں شب ہوتی ہے۔ اس رات کی عبادت کا بہت ثواب ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص شب قدر میں عبادت میں مشغول رہے اس کے سب سابقہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ شب قدر میں دعا قبول ہوتی ہے۔ ماہ رمضان المبارک بہت بابرکت ہے۔ اس میں جتنی بھی عبادت کی جائے کم ہے اور جتنی نیکیاں کی جائیں کم ہیں۔ افطار کے وقت روزے دار کی جائز دعا رد نہیں کی جاتی۔ نبی کریم ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ افطار میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تک لوگ افطار میں عجلت کریں بھلائی پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ جلد افطار کرنے والے کو زیادہ دوست رکھتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سورج ابھی پوری طرح غروب بھی نہ ہوا ہو اور روزہ افطار کر لیا جائے جیسے بعض لوگ کیا کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اس تاخیر سے گریز کیا جائے جو یہودیا کرتے تھے۔ وہ لوگ اس وقت روزہ افطار کرتے جب اندھیرا پھیل جاتا اور ستارے آسمان پر جھلملانے لگتے۔ کھجور یا چھوہارے سے روزہ کھولنا سنت ہے۔

اگر کوئی شخص روزے کی نیت کر کے توڑ دے یا بلا کسی معقول عذر کے روزہ توڑ دے یا روزے کی حالت میں صحبت کرے تو اس پر کفارہ لازم آتا ہے۔ کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو دو مہینے لگاتار روزے رکھے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلائے۔

فدیہ:

اگر کوئی شخص اتنا ضعیف اور کمزور ہو کہ اس میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو (شریعت کی اصطلاح میں ایسے شخص کو شیخ فانی کہتے ہیں) تو اسے اجازت ہے کہ وہ روزے نہ رکھے مگر اسے فدیہ دینا چاہیے۔ فدیہ کی صورت یہ ہے کہ کسی مسکین کو صدقہ فطر کے برابر غلہ دے۔ ہر روزے کے بدلے فدیہ دینا چاہیے۔ اگر کوئی شخص ایسی بیماری کی وجہ سے روزہ نہ رکھے جس میں اچھا ہونے کی امید نہ ہو اور فدیہ دیتا رہے مگر بعد میں وہ شخص صحت یاب ہو جائے تو اسے سب روزے قضا رکھنے پڑیں گے۔ فدیہ کا ثواب الگ ملے گا۔

اگر کسی شخص کے روزے قضا ہوں اور وہ مرتے وقت وصیت کر جائے کہ فدیہ دے دینا تو لواحقین کے لیے اسے پورا کرنا لازمی ہے۔ اگر وصیت نہ کرے تو فدیہ دینا جائز نہیں۔ اگر کسی کی نمازیں قضا ہو گئی ہیں اور وہ فدیے کے لیے وصیت کر جائے تو اس کے وارثوں کو ضرور فدیہ ادا کرنا چاہیے۔ ایک دن کی کل نمازوں کا فدیہ تقریباً بارہ سیر گیہوں ہے۔ ●●●

جنت کا داخلہ امتحان

دنیا کی زندگی میں کامیابی، عزت، شہرت اور دولت کے حصول کے طریقے ہم سب جانتے ہیں۔ کبھی آپ نے آخرت کی زندگی میں دائمی کامیابی کے طریقوں کو اپنانے پر غور کیا ہے؟

یوسف ثانی

ارسلان نے شعبہ انجینئرنگ میں پیشہ ورانہ تعلیم پانے کے لیے این ای ڈی انجینئرنگ یونیورسٹی کراچی کا انتخاب کیا۔ لہٰذا اُسے ایف ایس سی کے پرچے ختم ہوتے ہی پیشہ ورانہ اداروں میں داخلے کی اہلیت کے امتحان المعروف "انٹری ٹیسٹ" کی تیاری کے لیے شہر کے

پہلی میرٹ لسٹ صرف ایف ایس سی کے نمبروں کی بنیاد پر مرتب کی جاتی ہے یعنی اس میں داخلہ ٹیسٹ کے نمبر شامل نہیں ہوتے۔

ارسلان کی بہن عائشہ کو ڈاکٹر بننے کے لیے ڈاؤ میڈیکل یونیورسٹی میں داخل ہونا تھا۔ ہمارے ہاں انجینئرنگ کی نسبت میڈیکل کالجوں میں داخلہ ٹیسٹ کا معیار جدا اور نسبتاً مشکل ہے۔ گو وہاں بھی داخلہ ٹیسٹ ایم سی کیوز پر مبنی ہوتے ہیں لیکن منفی مارکنگ بھی کی جاتی ہے یعنی اگر طالب علم نے کسی سوال کا درست جواب دیا تو اسے ایک نمبر ملے گا۔ اگر غلط جواب دیا تو اسے منفی ایک چوتھائی نمبر ملے گا۔ گویا پرچے کے کل ایک سو سوالوں میں سے کسی طالب علم نے ساٹھ سوالوں کے درست اور چالیس کے غلط جواب دیے تو حاصل کردہ ساٹھ نمبروں میں سے چالیس غلط جوابات کے دس نمبر منہا بھی ہوں گے۔ یوں اسے عملاً پچاس نمبر ملتے ہیں۔

میڈیکل کالجوں میں داخلے کی میرٹ لسٹ میں انٹری ٹیسٹ کے نمبروں کا پچاس فیصد ایف ایس سی کے صرف چار مضامین یعنی انگریزی، طبیعات، کیمیا اور حیاتیات کے کل حاصل کردہ نمبروں کا چالیس فیصد اور میٹرک کے حاصل کردہ نمبروں کا دس فیصد شامل کیا جاتا ہے۔ گویا انجینئرنگ کے مقابلے میں میڈیکل کالج میں داخلے کا معیار مزید سخت ہے۔ اسی لیے عائشہ نے اپنے بھائی سے بھی زیادہ محنت و لگن سے داخلہ ٹیسٹ کی تیاری کی۔ دونوں نے مشق کی خاطر دیگر کالجوں اور جامعات میں بھی انٹری ٹیسٹ دیے۔ الحمدللہ دونوں کی محنت رنگ لائی اور وہ جامعہ این ای ڈی اور ڈاؤ یونیورسٹی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ واضح رہے کہ ایف ایس سی میں ساٹھ فیصد سے کم نمبر پانے والے طالب علموں کو انجینئرنگ اور میڈیکل کی میرٹ دوڑ سے پہلے ہی خارج کر دیا جاتا ہے۔

بڑے بہن بھائیوں کے برعکس فرقان کو بزنس ایڈمنسٹریشن کا شوق تھا۔ اس کی نگاہِ انتخاب مشہور تعلیمی ادارے انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن آئی بی اے پر تھی۔ آئی بی اے کے لیے درکار تعلیمی قابلیت کے مطابق کم از کم 65 فیصد نمبر ہونے ضروری ہیں۔ اس ادارے کا انٹری ٹیسٹ پیچیدہ اور مشکل ترین سمجھا جاتا ہے۔ انٹری ٹیسٹ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ تحریری حصے میں تین ذیلی پرچے ہوتے ہیں۔ تینوں پرچوں میں الگ الگ کامیاب ہونے کے علاوہ تینوں پرچوں کے مجموعی نمبر بھی مطلوبہ نمبروں کے برابر ہونا لازم ہے۔ گروپ ڈسکشن میں گروہ کے ہر رکن کو دیے گئے عنوان پر مقررہ وقت کے اندر اندر فی البدیہہ تقریر کرنا پڑتی ہے۔ پھر سارے ارکان مل کر اس موضوع پر اجتماعی بحث مباحثہ کرتے ہیں۔

اس سارے عمل کو ایک ممتحن مسلسل جانچتا اور ہر رکن کو انفرادی کارکردگی کی بنیاد پر نمبر دیتا ہے۔ آئی بی اے والے انٹری ٹیسٹ کے تیسرے مرحلے میں ہر طالب علم کا ذاتی انٹرویو لیا جاتا ہے۔ جب طالب علم تینوں مرحلوں اور ہر مرحلے کے تمام ذیلی حصوں میں علیحدہ علیحدہ کامیابی حاصل کر لے تبھی آئی بی اے میں داخلے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ فرقان نے آئی بی اے کا یہ پیچیدہ اور مشکل ترین داخلہ امتحان پاس کر لیا۔ ارسلان، عائشہ اور فرقان کی مختلف داخلہ امتحانوں میں کامیابی نے ساتویں جماعت میں زیرِ تعلیم سب سے چھوٹے بھائی عدنان کو ابھی سے اس فکر میں مبتلا کر دیا کہ چند برسوں بعد اسے بھی کوئی انٹری ٹیسٹ پاس کرنا ہو گا۔ عدنان فی الوقت اپنی تمام تر ذہانت اور قابلیت کے باوجود "نمبروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے" کے نازک مرحلے سے گزر رہا ہے۔

☆

دنیا میں کامیابی کی راہ ہموار کرنے میں مشہور و معروف تعلیمی ادارے اہم اور بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن ان اداروں میں داخلے کے لیے درکار تعلیمی قابلیت کے ساتھ ساتھ داخلہ امتحان میں کامیابی حاصل کرنا اولین شرط ہے۔ عموماً جب بچے انٹر پاس کر لیں تب ان کے والدین پوچھتے ہیں کہ بیٹا آگے کیا پڑھنا ہے؟ بچے حاصل کردہ نمبروں کی بنیاد پر جواب دیتا ہے کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے یا کیا کر سکتا ہے۔ ممتاز بھارتی ماہر تعلیم ڈاکٹر مبارک کاپڑیا کا کہنا ہے کہ والدین کا یہ رویہ سراسر غلط ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ والدین کو پہلے ہی باہم مشورہ کر کے یہ طے کر لینا چاہیے کہ بچہ انٹر کس مقصد کے تحت کرنا چاہتا ہے۔ نیز انٹر کے بعد اسے کن شعبے یا تعلیمی ادارے میں داخل ہونا ہے اور وہاں انٹری ٹیسٹ کے قواعد و ضوابط کیا ہیں۔ ارسلان عائشہ اور فرقان کے معاملے میں ایسا ہی کیا گیا چنانچہ تینوں نے مشہور تعلیمی اداروں کے انٹری ٹیسٹ میں آسان طریقے سے کامیابی حاصل کر لی۔

عموماً ہم سب یہ حقیقت مانتے ہیں کہ معروف تعلیمی اداروں کے انٹری ٹیسٹ میں کامیابی دنیا میں ترقی اور خوشحالی کی ضمانت ہے۔ لیکن کم ہی لوگ اس جانب توجہ دیتے ہیں کہ اوسطاً پچاس ساٹھ سالہ دنیوی کیریئر کے اختتام پر ہم سب کو ایک اور انٹری ٹیسٹ۔۔ جنت داخلہ امتحان کا بھی سامنا کرنا ہوتا ہے۔ کامیاب ترین دنیوی زندگی کے اختتام پر ہمارے سامنے ایک اور نئی خوبصورت دنیا موجود ہوتی ہے جسے "جنت" کہتے ہیں۔

جنت کا عیش و آرام دنیوی عیش و آرام سے بہت زیادہ ہے۔ دنیا میں کامیاب ترین امیر ترین اور بلند ترین منصب تک پہنچنے والے فرد کی کہانی زیادہ سے زیادہ ایک صدی پر محیط ہوتی ہے۔ جب کہ مرنے کے بعد آنے والی دنیا کی زندگی لامتناہی یعنی نہ ختم ہونے والی ہے اور اس اخروی زندگی کا سارا عیش و آرام اور مزہ جنت میں رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن جنت میں داخلے کے لیے بھی انٹری ٹیسٹ پاس کرنا ضروری ہے۔ جو لوگ اس داخلہ امتحان میں ناکام رہیں گے وہ نہ صرف جنت کے آرام و عیش سے محروم رہیں گے بلکہ محرومی کی صورت میں انھیں لازماً جہنم میں داخل ہونا پڑے گا۔

جہنم کے بارے میں تو سب جانتے ہیں کہ وہاں جنت کے برعکس ماحول پایا جاتا ہے۔ اسی لیے کوئی بھی فرد جہنم میں داخل ہونے کو تیار نہیں ہوتا۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ جہنم میں داخل نہ ہونے کے خواہشمند افراد بھی جنت کے داخلہ امتحان کی تیاری کرنا تو درکنار پرچوں اور قواعد و ضوابط تک سے ناآشنا ہیں۔ ابھی ہم نے میڈیکل انجینئرنگ اور بزنس ایڈمنسٹریشن کے اہم ترین تعلیمی اداروں کے انٹری ٹیسٹ کے طریقہ کار پر تفصیلی گفتگو کی تاکہ داخلے کے خواہشمند طالب علم نہ صرف قواعد و ضوابط سے آگاہ ہو جائیں بلکہ ذہنی طور پر بھی خود کو تیار کر لیں انٹری ٹیسٹ میں کامیاب ہو کر ہی وہ دنیا میں کامیابی و کامرانی حاصل کر سکتے ہیں۔

آئیے اب جنت کے انٹری ٹیسٹ کی بات کرتے ہیں تاکہ جب عمر کی نقدی ختم ہو اور جنت انٹری ٹیسٹ میں کامیابی کا پروانہ نامہ اعمال کی صورت ہمارے ہاتھ میں آئے تو ہم اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہوتے ہی جنت کی نعمتوں سے استفادہ کر سکیں۔ جنت انٹری ٹیسٹ کے متعلق سورۃ العصر میں زمانے کی قسم کھاتے ہوئے اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ بے شک تمام انسان خسارے میں ہیں سوائے اُن لوگوں کے جو چار باتوں یعنی ایمان عمل صالح حق کی تلقین اور صبر پر عمل پیرا ہے۔ یہ چار باتیں درحقیقت جنت انٹری ٹیسٹ کے چار الگ پرچے ہیں۔ جنت میں جانے کے لیے ان چاروں پرچوں میں الگ الگ

کامیابی حاصل کرنا لازمی ہے۔

ایمان کے پرچے میں اللہ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تمام باتوں پر اسی طرح ایمان لانا ضروری ہے جیسا کہ حکم دیا گیا ہے۔ اعمال صالحہ یعنی نیک اعمال والے پرچے میں وہ سب کچھ لازما کرنا ہے جن کا قرآن پاک اور حدیث میں امر بالمعروف کے ضمن میں حکم ملا اور ان تمام باتوں سے لازما رکنا ہے جن کا ذکر نہی عن المنکر کے ضمن میں کیا گیا۔ اگر ہم اپنے ایمان کا جائزہ لیں تو کم وبیش تمام مسلمان کسی نہ کسی حد تک اس پرچے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اسی طرح صالح اعمال والے پرچے میں بھی کچھ نہ کچھ کارکردگی ضرور دکھائیں گے۔ البتہ یہ جائزہ لینے کی ہر وقت ضرورت ہے کہ کہیں ہم ان پرچوں میں مطلوبہ نمبروں سے کم کارکردگی تو نہیں دکھا رہے؟ قرآن پاک کی اوامر ونواہی کی ربانی کسوٹی سے ہم بخوبی ان دو اولین پرچوں میں اپنی کارکردگی کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ہم بالعموم ایمان اور عمل صالح کے مرحلے ہی پر رک جاتے ہیں۔ اپنی ساری کاوشیں ان دونوں پرچوں میں خوب سے خوب تر کارکردگی دکھانے میں صرف کرتے اور بھول جاتے ہیں کہ جنت انٹری ٹیسٹ کے دو مزید مراحل حق کی تلقین اور صبر بھی ہیں۔ ایمان اور عمل صالح کے بعد جب تک ہم ان دو امور پر بھی مطلوبہ توجہ نہ دیں، جنت داخلہ امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیا آئی بی اے انٹری ٹیسٹ کے تین تحریری، دو بات چیت اور ایک انٹرویو یعنی کل چھے مراحل میں صرف تین مرحلوں میں اچھی کارکردگی دکھلانے والا طالب علم آئی بی اے میں داخل ہو سکتا ہے؟ جبکہ بقیہ تین مراحل میں اس نے کوئی کارکردگی ہی نہیں دکھائی یا ان میں ناکام رہا۔

جب ایک دنیوی تعلیمی ادارے میں داخل ہونے کے تمام مراحل میں کارکردگی دکھانا لازم ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جنت انٹری ٹیسٹ کے کل چار مراحل میں سے دو میں ہماری کوئی کارکردگی نہ ہو اور ہم جنت میں داخل بھی ہو جائیں؟ جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمام لوگ خسارے میں ہیں ماسوائے ان لوگوں کے جنھوں نے ایمان لا کر عمل صالح کیا، حق کی تلقین وتبلیغ کی اور ان مراحل کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر کرتے رہے۔

حق کی تلقین کے بعد خصوصاً صبر کرنے کا ذکر اس لیے بھی ہوا کہ فرامین قرآن وحدیث کی تبلیغ کا لازمی نتیجہ مشکلات ومصائب کو دعوت دینا ہے۔ حق کی تبلیغ کا بیشتر کام انبیا علیہ السلام نے کیا اور انھیں ہی سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ چناں چہ ہر مشکل اور تکلیف پر انھوں نے صبر سے کام لیا۔ اگر کوئی انسان جنت انٹری ٹیسٹ میں کامیاب ہو کر جنت میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ایمان لا کر عمل صالح اختیار کرے۔ ساتھ ساتھ اپنے گرد وپیش میں موجود لوگوں کو حق کی تلقین بھی کرتا رہے۔ اس تلقین وتبلیغ کی راہ میں جو مصائب ومشکلات پیش آئیں، ان پہ صبر بھی کرے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو جنت داخلہ امتحان کے چاروں پرچوں میں کامیابی عطا فرمائے تا کہ وہ ابدی خسارے سے بچ کر جنت میں داخلہ کا آئی ڈی کارڈ حاصل کر سکے۔ بالکل اسی طرح جیسے ارسلان، عائشہ اور فرقان نے اپنے اپنے انٹری ٹیسٹ میں کامیابی کے بعد متعلقہ تعلیمی ادارے میں داخلہ کا آئی ڈی کارڈ حاصل کیا اور جس کی تمنا عدنان اپنے دل میں لیے بیٹھا ہے۔

◆◆◆

حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حبیب اشرف صبوحی

ہمارے بزرگانِ دین، صوفیائے کرام اور علما نے معرفت کی منزلیں طے کرنے اور پاکیزہ زندگی گزارنے کے لیے جہاں بہت سی چیزیں بتائیں، وہاں دو چیزوں کی طرف زیادہ زور دیا۔ ایک خوفِ خدا اور دوسرا عشقِ رسول ﷺ۔ جس شخص میں یہ اوصاف پیدا نہیں ہوتے وہ کامل مسلمان نہیں ہو سکتا۔ وہ بڑا خوش نصیب ہے جس میں یہ دونوں خوبیاں ہیں۔

کائنات میں ایسے عظیم لوگ بھی ہیں جو صحیح معنوں میں عاشقِ رسول ﷺ ہوتے اور اپنے ہر عمل اور فعل سے یہ ثابت کرتے ہیں۔ میں یہاں کچھ ایسے واقعات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

آج سے تقریباً پندرہ سال قبل میرے ہاں ربیع الاول کے مہینے میں میلاد کی محفل تھی۔ اس میں خاصے لوگ شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے ایک بزرگ کا قول سنایا کہ اگر کوئی اپنے دل میں یہ ارادہ کرے کہ وہ ایک کروڑ دفعہ حضورِ اکرم ﷺ پر درود شریف بھیجے گا تو اسے اس وقت موت آئے گی جب تک ایک کروڑ دفعہ درود شریف پڑھ سکے۔ یہ بات میں نے روایتی طور پر بیان کر دی اور بالکل بھول گیا۔

چند سال قبل ایک بزرگ جو اس محفل میں بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے مجھے اپنے گھر بلوایا اور کہا کہ آپ نے آج سے پندرہ سال قبل اپنے گھر میں ایک بزرگ کا قول سنایا تھا۔ اس میں ایک کروڑ دفعہ درود شریف پڑھنے کا ذکر تھا۔ میں نے اسی دن سے ارادہ کر لیا کہ میں ان شا اللہ ایک کروڑ دفعہ درود شریف پڑھوں گا۔ چناں چہ اسی روز سے درود شریف پڑھنا شروع کر دیا اور ایک ڈائری میں نوٹ کرتا چلا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے 15 سال میں ایک کروڑ دفعہ درود شریف مکمل کر لیا ہے۔ میرے بیٹے نے بھی میرا ساتھ دیا۔ اللہ کا شکر ہے اس نے بھی ایک کروڑ دفعہ درود شریف مکمل کر لیا ہے۔ اس کا ثواب اگر مجھے ملے گا تو آپ کو بھی ملے گا کہ آپ نے مجھے نیکی کی راہ دکھائی۔ انھوں نے ایک ڈائری اور ایک قلم مجھے دیا کہ جو بات آپ نے کہی تھی، اس پر میں نے اور میرے بیٹے نے عمل کیا۔ اب آپ کا

بھی یہ فرض ہے کہ آپ بھی یہ وظیفہ پڑھیں اور جتنا پڑھیں، وہ اس ڈائری میں لکھ لیں۔

اور ایک واقعہ ہے جس کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ایک بزرگ کا نام محمد عالم چشتی تھا۔ اپنے گھر سوئی گیس لگوانے کے سلسلے میں میرے پاس آئے۔ میں نے ان کا ڈیمانڈ نوٹس تیار کرایا اور ان کو کہا کہ آپ تشریف لے آئیں اور دستخط کر کے سیکیورٹی جمع کرا دیں۔ میرے کہنے پر وہ دفتر تشریف لائے۔ میں نے ڈیمانڈ نوٹس ان کو دیا اور کہا کہ آپ یہاں دستخط کر دیں باقی کام میں کرا دوں گا۔ انھوں نے ڈیمانڈ نوٹس پڑھا اور کہا کہ وہ اس پر دستخط نہیں کریں گے کیونکہ لفظ محمد کے انگریزی سپیلنگ MOHD ہیں، میں اس نام کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔

اس کے انگریزی سپیلنگ ٹھیک کرائیں جو کہ Muhammad ہیں۔ صدر ضیاالحق نے اپنے دور میں ایک سرکاری حکم نامہ جاری کیا تھا کہ لفظ محمدﷺ کے انگریزی سپیلنگ Muhammad لکھے جائیں۔ جب میں نے دوبارہ اس ڈیمانڈ نوٹس کو ان کے صحیح نام سے ٹائپ کرایا تب انھوں نے دستخط کیے۔ اگر کوئی عام دنیادار شخص ہوتا تو شاید وہ بھی اس بات کو نوٹ نہ کرتا۔ اس کو اپنے کام سے غرض ہوتی۔

آخر میں ایک واقعہ ہندوستان کے ایک عظیم بادشاہ سلطان ناصر الدین محمود کے حوالے سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بادشاہ درویش صفت کا مالک تھا۔ اپنے ہاتھ سے قرآن شریف لکھتا۔ ٹوپیاں سیتا اور انھیں بیچ کر اپنا گزر بسر کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک ملازم محمد مشتاق تھا بہت مدت سے کام کر رہا تھا۔ وہ اس کو جب بھی بلاتا تو "محمد مشتاق" کہہ کر پکارتا۔ ایک دن بادشاہ نے اسے "مشتاق" کہہ کر بلایا اور کہا کہ فلاں کام کر دو۔ ملازم نے کام تو کر دیا لیکن اس کے بعد دربار میں حاضر نہیں ہوا۔ جب کئی روز گزر گئے تو بادشاہ نے اسے بلوایا۔ جب وہ آیا تو بادشاہ نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور چہرہ اترا ہوا ہے۔ بادشاہ نے اس کے دربار میں نہ آنے کی وجہ پوچھی اور اس کا حال دریافت کیا۔

اس نے کہا کہ بادشاہ سلامت میں بہت مدت سے آپ کے پاس ملازم ہوں۔ آپ مجھے جب بھی بلاتے ہیں تو میرا پورا نام لیتے ہیں لیکن چند روز قبل آپ نے مجھے "مشتاق" کے نام سے پکارا۔ میں نے سوچا کہ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے اور آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ اس خیال نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی اور میں پریشان رہنے لگا۔ بادشاہ نے کہا "میں تم سے ناراض نہیں ہوں اور نہ تم سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ میں اس روز بے وضو تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اتنا مقدس نام بے وضو لوں۔ اس وجہ سے میں نے تمھیں "مشتاق" کہہ کر پکارا تھا۔"

مشہور گلوکار محمد رفیع کو جب ان کی فنی خدمات کے صلے میں بھارت کا سب سے بڑا اعزاز "پدم بھوشن" پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ہاتھوں سے دیا تو پوچھا کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ مجھے کوئی کام بتائیں۔ محمد رفیع نے جواب دیا کہ آپ آج سرکاری طور پر اعلان کریں کہ مجھے میرے پورے نام سے پکارا جائے یعنی "محمد رفیع"۔ جب سے میں فلمی دنیا میں آیا ہوں مجھے رفیع کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آج مجھے جو عزت شہرت ملی ہے، وہ اس مقدس نام "محمدﷺ" کی وجہ سے ملی ہے۔

محمد رفیع حب رسولﷺ کا اس قدر قائل تھا کہ جب حج پر گیا تو مدینہ منورہ حاضری کے وقت لوگوں نے اسے نعت سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے کانپتے ہوئے جواب دیا: "کیا میں یہاں منہ کھولنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟" اس پر لوگوں نے کہا کہ کوئی نعت ہی سنا دیں۔ مگر محمد رفیع کی گھگی بندھ گئی کہ وہ لوگوں کی فرمائش پوری نہ کر سکا۔

خصوصی انٹرویو
تھرکوئلے سے نوسو سال تک
40 ہزار میگاواٹ بجلی بنانا ممکن ہے
"سوان ریوراسٹوریج" کی تعمیر کے بغیر کسان پانی کی بوند بوند کو ترسیں گے
ماہرارضیات مرزا عبدالصمد بیگ کے انکشافات
تحریر و ملاقات: پروفیسر محمد فاروق قریشی
شریک گفتگو: طیب اعجاز قریشی

پاکستان میں گزشتہ چند سالوں کے دوران توانائی کے بحران نے جو خوفناک صورت اختیار کر لی ہے اس نے ملک کے اندر کاروبارِ حیات کے تمام شعبوں میں زبردست بحران پیدا کر دیا ہے۔ پچھلے پچاس سال میں کسی بڑے ہائیڈل پاور پراجیکٹ کا تعمیر نہ ہونا اور کالاباغ ڈیم جیسے منصوبے پر اتفاق رائے کا فقدان ایک المیہ ہے۔ کالاباغ ڈیم اتنا بڑا پراجیکٹ ہے کہ اس کی تکمیل سے نہ صرف پاکستان میں بجلی اور آبپاشی کے مسائل حل ہوتے اور اس کے نتیجے میں زرعی اور صنعتی پیداوار اور برآمدات میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا۔ شہریوں کے معمولاتِ زندگی میں سکون اور اطمینان پیدا ہو جاتا۔ اور حکومت دوسرے اہم مسائل اور ترقیاتی منصوبوں کی طرف توجہ دینے کے قابل ہوتی۔

مقامِ استعجاب ہے کہ کالاباغ ڈیم کے تکنیکی پہلوؤں اور افادیت پر چاروں صوبوں کے ماہرین میں مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے، البتہ دو صوبوں کے سیاستدانوں کی طرف سے مخالفت اور احتجاج کا شوروغوغا بلند ہے۔ ضیاءالحق اور پرویز مشرف کی فوجی

اوسط قد، دوہری ساخت، عمر اور ڈاڑھی کے بال سفید، آنکھوں پر نظر کا چشمہ، موسم کے مطابق کوٹ پتلون یا سفاری سوٹ میں ملبوس، علم ارضیات کے مستند ماہر، تجربہ کار سائنس دان، بذوق مصنف اور شاعر، منکسر المزاج، دیکھنے میں خشک لیکن نہایت خوش اخلاق اور باغ و بہار شخصیت کے مالک، یہ تھے ہمارے ممدوح مرزا عبدالصمد بیگ:

بیچلر آف سائنس (آنرز ان جیالوجی)، گولڈ میڈلسٹ (پنجاب)، ایم ایس سی جیالوجی (پنجاب)، پروفیسر زاہد ایوارڈ۔ سابق ڈائریکٹر جنرل مائننگ پراجیکٹس، پاکستان اٹامک انرجی کمیشن۔ مختلف مائننگ پراجیکٹس پر مختلف حیثیتوں میں کام کیا۔ اس میں ان سیٹو سلیوشن مائننگ (In-Situ Solution Mining)، اوپن پٹ مائننگ (Open Pit Mining) اور زیر زمین مائننگ (Underground Mining) شامل ہیں۔ آپ نے یورینیم، ٹائٹینیم، زرکون، گولڈ، تھوریم، ایپاٹائٹ اور کاپر پر گرانقدر کام کیا۔ یورینیم کے تین ذخائر کو دریافت کیا اور ان کے پروسیسنگ میکینزم کو ڈیزائن کیا۔ ان کارناموں پر آپ کو حکومت پاکستان کی طرف سے گولڈ میڈل اور ستارۂ امتیاز کا اعزاز عطا کیا گیا۔ آپ کو ٹنلنگ (Tunneling) اور ڈرلنگ (Drilling) کا بھی وسیع تجربہ حاصل ہے۔ آپ نے معدنیات خصوصاً یورینیم کی تلاش پر امریکا اور چین کے اداروں میں تربیت بھی حاصل کی۔ تھرکول پاور پراجیکٹ پر بطور ڈائریکٹر انڈر گراؤنڈ کول گیسی فکیشن دو سال خدمات انجام دیں اور تھرکول فیلڈ اسلام کوٹ بلاک 5 پر انڈر گراؤنڈ گیسی فکیشن کا کامیاب تجربہ کیا۔ آپ نے سائتا پاکستان (Saita Pakistan) کے ساتھ ملک میں زلزلے کے علاقوں اور فالٹ لائنز کی نشاندہی اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں پر کام کیا۔ آپ وزٹنگ پروفیسر کے طور پر پنجاب یونیورسٹی اور آزاد کشمیر یونیورسٹی میں لیکچر دیتے رہے ہیں۔ آپ جیالوجی پر سات کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ نے ''اسلام، سائنس اور فلسفہ'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ آپ شاعر بھی ہیں اور بہت سی غیر مطبوعہ غزلوں اور نظموں کے خالق ہیں۔

کرائے پر منگوائے انٹرنیشنل پاور پلانٹس نے انتہائی مہنگی بجلی پیدا کر کے قومی معیشت کو نقصان پہنچایا

حکومتیں بھی، جن کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا اور انھوں نے اس کو طول اقتدار کے لیے بے دریغ استعمال بھی کیا" کالا باغ ڈیم تعمیر نہ کرا سکیں۔ سیاسی حکومتوں نے شدید سیاسی اختلاف کی بنیاد پر اس منصوبے کو ہمیشہ کے لیے سرد خانے کی نذر کر دیا۔

بجلی و پانی کے بحران پر قوالی کرنے والے مجرمانہ غفلت میں مدہوش رہے اور موہوم امیدوں پر وقت گزاری کرتے رہے۔ انھوں نے متبادل آبی منصوبوں پر کوئی کام نہ کیا جو سستی بجلی پیدا کرنے میں مدد کر سکتے۔ جب متاثرہ عوام اور فیکٹری کارکنوں نے گھیراؤ جلاؤ کے ذریعے احتجاج شروع کیا تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور انھوں نے ہنگامی حالت کا اعلان کرتے ہوئے انٹرنیشنل پاور پلانٹس (IPP's) کرائے پر منگوا لیے۔ یہ گیس اور تیل پر چلنے والے پلانٹس انتہائی مہنگی بجلی پیدا کرتے تھے لیکن مہنگائی کی کس کو پروا تھی؟ ارباب اقتدار نے ان ٹھیکوں کی بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے اور اقتدار سے محرومی کے بعد عدالتوں کا سامنا بھی کر رہے ہیں۔

ان ہنگامی اقدامات کے باوجود بجلی کی کمی پوری نہیں ہو سکی اور پاکستان کے شہر، دیہات اور فیکٹریاں لوڈشیڈنگ کے عذاب مسلسل میں مبتلا ہیں۔ ایک حماقت یہ بھی کی گئی کہ ملک میں پائی جانے والی قدرتی گیس پاور پلانٹس اور نجی ٹرانسپورٹ کو فراہم کر دی گئی جس سے ملک قدرتی گیس کی قلت کا شکار ہو گیا اور اب گیس کی بھی لوڈشیڈنگ ہو رہی ہے۔

بجلی و گیس کے اس پرآشوب ہنگامے میں کچھ محب وطن افراد کو سندھ میں تھر کے صحراؤں میں پائے جانے والے زیرزمین کوئلے کے وسیع ذخائر کا خیال آ گیا کہ کیوں نہ اس قدرتی دولت کو بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ حکومت نے بھی اس بات کا نوٹس لیا اور اس طرح ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر ثمر مبارک مند کی قیادت میں تھر کول پاور پراجیکٹ پر کام کا آغاز ہوا۔ مرزا عبدالصمد بیگ کو بھی وہاں بطور وائس پریذیڈنٹ، انڈر گراؤنڈ کول گیسیفیکیشن کام کرنے کا موقع ملا۔ اہل پاکستان نے اس پراجیکٹ سے بڑی امیدیں لگا رکھی ہیں کہ شاید یہ معدنی دولت ان کی قسمت سنوار دے اور پاکستان کے اندھیرے اجالوں میں بدل جائیں۔ اس تناظر میں ہماری جو گفتگو مرزا عبدالصمد بیگ سے ہوئی، وہ قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے یہاں پیش کی جا رہی ہے۔

سوال: ہمارے قارئین کی اطلاع کے لیے بتائیے کہ ارضیات (Geology) کیا ہے اور اس کا جغرافیے اور کان کنی (Mining) سے کیا تعلق ہے؟

جواب: ارضیات بنیادی طور پر چٹانوں کی سائنس (Science of Rocks) ہے۔ ماہر ارضیات زمین کی اوپری سطح یعنی قشر الارض کے معائنے اور تجزیے سے معلوم کرتا ہے کہ زمین کے اندر کتنی گہرائی پر کونسی معدنیات پائی جاتی ہیں۔ مٹی کے اندر دھاتوں کے ذرات پائے جاتے ہیں جہاں کسی ایک چیز کی Concentration یعنی زیادہ مقدار موجود ہو، وہاں یقیناً زیرزمین اس چیز کا ذخیرہ ہو گا۔ مثلاً اگر کسی جگہ چٹانوں میں 40 سے 60 فیصد لوہے کے مرکبات موجود

ہوں تو وہ اس دھات کو حاصل کرنے کا قابل قدر ذریعہ بن سکتا ہے۔

جیالوجسٹ پتھروں کی بناوٹ رنگ اور مختلف تجربات سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ زیر زمین کتنی گہرائی پر پانی یا تیل موجود ہو سکتا ہے۔ ایک پتھر سے ہم اس کی تاریخ، وزن، کیمسٹری اور بننے کا درجہ حرارت سب معلوم کر سکتے ہیں۔ پتھر اگر گول شکل کا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ دریا کے پانی میں کافی سفر کر کے وہاں آیا ہے اور کس چٹان سے ٹوٹ کے آیا ہے تو اس کے منبع کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جنوبی افریقا میں اسی طرح جیالوجسٹوں نے دریا کے کنارے پائی جانے والی ریت (Placer) میں ہیرے اور سونے کے ذرات دریافت کیے۔ کیونکہ سورج کی روشنی ان سے منعکس ہو رہی تھی۔ پھر انھوں نے ان ذرات کے ماخذات کو تلاش کیا۔

اس طرح کیپ ٹاؤن، کمبرلے اور جوہانسبرگ میں سونے اور ہیرے کی کانیں نکل آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کہ زمین اور آسمان کی پیدائش میں غور کرو۔ میرے خیال میں جیالوجسٹ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی ہوئی زمین میں غور و خوض کرتا ہے۔ اس طرح وہ فطرت کے بہت قریب ہوتا ہے اور جو فطرت کے قریب ہوتا ہے وہ اللہ کے قریب ہوتا ہے اور اس کی نعمتوں کو گننا شروع کر دیتا ہے۔ جیالوجی کی سرحدیں جغرافیہ اور کان کنی سے ملتی ہیں۔ زمین کی سطح پر جو کچھ ہے یعنی میدان، صحرا، پہاڑ، دریا، سمندر ان کا مطالعہ جغرافیہ ہے۔ زیر زمین معدنیات کو باہر نکالنا، ان کو قابل استعمال بنانا کان کنی کہلاتا ہے۔

سوال: ہیرا کس قسم کی چٹانوں میں پایا جاتا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ ہیرا کاربن سے بنتا ہے۔ کاربن تو سیاہ ہوتی ہے۔

جواب: ہیرا صرف ایک قسم کی چٹان میں پایا جاتا ہے جس کو کمبرلائٹ (Kimberlite) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک خاص چٹان ہے جو بہت زیادہ درجہ حرارت اور دباؤ پر وجود میں آتی ہے۔ اس چٹان میں کاربن موجود ہوتی ہے۔ ہیرا کاربن کی سب سے خالص چمکدار اور شفاف شکل ہے اور کوئلہ سب سے کثیف۔ لکڑی سے کوئلہ بنتا ہے، کوئلہ سے گریفائٹ اور گریفائٹ سے ہیرا۔ یہ سارا عمل طویل عرصے تک انتہائی بلند درجہ حرارت اور دباؤ کے نتیجے میں تکمیل پذیر ہوتا ہے۔ دنیا میں اصلی قدرتی ہیرے بہت کم ہیں۔ زیادہ تر ہیرے جو آپ کو انڈسٹری میں نظر آتے ہیں، غیر قدرتی طور پر تجربہ گاہ میں بنیادی اجزا کے کیمیائی ملاپ سے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کام میں اتنی مہارت پیدا کر لی گئی ہے کہ تجربہ گاہ میں تیار کردہ ہیرے اور دوسرے جواہرات اپنی خصوصیات میں اصل کے اتنا قریب ہوتے ہیں کہ ہیروں کے ماہرین خصوصی ہی ان میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

سوال: نایاب زمینی (Rare Earth Metals) کیا چیز ہیں اور کیا یہ پاکستان میں پائی جاتی ہیں؟

جواب: یہ بھی دوسرے عناصر کی طرح دھاتی عناصر ہیں جو بہت قلیل مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ہم نے ان پر بھی کام کیا ہے۔ یہ نادر زمینی معدنیات سترہ قسم کے کیمیائی عناصر کا ایک سیٹ ہے۔ یہ عناصر دوسری معدنیات کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ان کو زمین سے نکالنے اور قابل استعمال بنانے کا عمل مشکل بھی ہے۔

عناصر خاص طور پر جدید ٹیکنیکل اور دفاعی آلات جیسے میزائل، بم، ایئر کرافٹ، موبائل فون اور ہائبرڈ کاروں کی ساخت میں اہم جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوال: کیا سمندر کی تہ کے نیچے بھی معدنیات موجود ہیں؟

جواب: بالکل! سمندر کے نیچے بھی زمین کی سطح ہے۔ جیالوجسٹ کا کام ہے کہ آپ کو بتا دے کہ اس جگہ پر اس جیومیٹری کے ساتھ، اتنی گہرائی پہ یہ چیز پڑی ہے۔ اب یہ کام کان کن کا ہے۔ وہ دیکھے گا کہ وہ سطح زمین سے اتنی گہرائی پہ کیسے جائے گا اور کیسے اس چیز کو باہر نکالے گا۔

سوال: خدا نے انسان کے دماغ میں بھی بہت صلاحیتیں رکھ دی ہیں تاکہ وہ یہ کام کر سکے۔

جواب: قدرت نے انسان کو بنیادی اصول اور آلات دیے ہیں۔ کشش ثقل، مقناطیس اور بجلی خدا نے پیدا کی۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ان سے کام لے کر وسائل کو تلاش کریں اور اپنے قابو میں لا کر ان سے استفادہ کریں۔ توانائی کی ایک قسم کو دوسری قسم میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے پانی کو بلندی پر ذخیرہ کر کے نیچے گرایا۔ اس سے ٹربائن چلائی اور بجلی پیدا کر لی۔ مقناطیسی توانائی سے آپ ہر قسم کی مشین چلاتے ہیں۔

سوال: بیگ صاحب! آپ اٹامک انرجی کمیشن میں بڑا طویل عرصہ رہے۔ وہاں آپ کے کام کی نوعیت کیا تھی؟

مہمان: میں 1968ء میں بطور جیالوجسٹ اٹامک انرجی کمیشن میں آیا۔ وہاں میرا کام تھا معدنیات کو ڈھونڈنا، ایسی معدنیات جو اٹامک انرجی میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان میں یورینیم، ریڈیم، تھوریم آتی ہیں۔ ان کو نیوکلیئر منرلز (Nuclear Minerals) کہا جاتا ہے۔ ان کا تعلق نیوکلیئر انرجی سے ہے۔ ہمارا کام یہ ہوتا تھا کہ ہم نے ان کو ڈھونڈنا ہوتا تھا جہاں سے بھی یہ ملیں۔ ان میں یورینیم سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اس دھات کو صفائی کے بعد ایٹمی ایندھن کے طور پر کام میں لایا جاتا ہے۔ آپ کو حرارت چاہیے تو آپ کوئلہ جلاتے ہیں۔ آپ نے اٹامک انرجی پلانٹ لگانا ہے تو آپ کو یورینیم چاہیے۔ ایٹمی نقطہ نظر سے U235 سب سے اہم ہے۔ عناصر دو طرح کے ہیں۔ غیر قیام پذیر یا قیام پذیر (Fissile Element) اور (Stable Element)۔

سوال: یہ غیر قیام پذیر (Fissile Element) کیا ہوتا ہے؟

جواب: ہر عنصر کے ایٹم میں مرکزہ ہوتا ہے۔ مرکزے میں مثبت چارج والے پروٹان اور چارج کے بغیر نیوٹران ہوتے ہیں۔ مثبت چارج کو برابر کرنے

انڈر گراؤنڈ کول گیسی فکیشن کا عمل

تکسیدی عامل

Overburden

Coal

Ash

کے لیے مرکزے کے گرد الیکٹران ہوتے ہیں جن پر منفی چارج ہوتا ہے۔ پروٹان اور الیکٹران کی تعداد برابر ہوتی ہے تاکہ چارج برابر رہے۔ بعض عناصر کے ایٹموں میں مرکزے کے اندر پروٹان اور نیوٹران کی تعداد گنجائش سے زیادہ ہوتی ہے تو وہ ٹوٹنا شروع ہو جاتے ہیں اور ان سے توانائی کا اخراج ہوتا ہے۔ ایسے عناصر کو قیام پذیر کہتے ہیں۔ ان سے الفا، بیٹا، پارٹیکلز (Particles) اور گاما شعاعیں نکلتی ہیں۔ ایسے عناصر کو ریڈیو ایکٹو عناصر (Radio Active Elements) کہتے ہیں۔ یورینیم ایسے عناصر میں سے ایک ہے۔ اس میں دو آئسوٹوپس (Isotopes) ہوتے ہیں: U235 اور U238۔ نیوکلیئر انڈسٹری میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا U235 ہے جو اٹامک ری ایکٹر میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ نیوکلیئر پاور پلانٹ چلانے والا گھوڑا ہے۔ اس کو اپ گریڈ (Upgrade) کر کے ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

سوال: یورینیم کو اپ گریڈ اور افزودہ (Enrich) کرنا بڑا تکنیکی اور ماہرانہ کام ہے۔ اس عمل میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا بھی نام آتا ہے۔

جواب: یورینیم کو اپ گریڈ اور افزودہ کرنے کا شعبہ بہت وسیع ہے۔ پہلے ہم یورینیم کو ڈھونڈتے پھر کان کنی کے ذریعے باہر نکالتے ہیں۔ پھر یورینیم کو الگ کر کے دھات میں تبدیل کرتے ہیں۔ اس کے بعد یورینیم دھات کو گیس میں تبدیل کرتے ہیں۔ گیس کو اپ گریڈ کیا جاتا ہے۔ پھر اس کو دوبارہ دھات میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ یہ عمل کوئی ساٹھ ستر مراحل (Stages) میں مکمل ہوتا ہے۔ اس میں ایک اہم سینٹری فیوجز (Centrifuge) کی آتی ہے۔ جس کے ذریعے U238 کو U235 سے گیس کی حالت میں ایک دوسرے سے الگ کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر اس شعبے کے انچارج تھے۔ یورینیم گیس کو نہایت تیز رفتاری سے چلنے والے ایک ہزار سینٹری فیوجز میں سے گزارا جاتا ہے۔ تب جا کر بھاری اور ہلکی گیسوں کو الگ کرنا ممکن ہوتا ہے۔

سوال: یہ تو بڑا طویل اور پیچیدہ اہم کام ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ ڈاکٹر قدیر خان نے اکیلے ہی یہ کارنامہ سرانجام دیا۔

جواب: یہ واقعی طویل عمل ہے جس میں سیکڑوں سائنس دان شریک تھے۔ بہت سارے ایسے قابل سائنس دانوں کا لوگ نام تک نہیں جانتے جن کی محنت اس میں شامل ہے۔ عوام کو صرف چند افراد کے نام بتائے گئے ہیں۔

سوال: ایٹم بم بنانے کا کام کب شروع ہوا تھا؟

جواب: یہ ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں 1974ء میں شروع ہو گیا تھا جب بھارت نے پوکھران میں اپنا پہلا ایٹمی دھماکا کیا۔ اس میں بے شمار لوگوں نے کام کیا۔ میں اس عمل میں 1968ء میں شامل ہوا۔ 1970ء میں جب بھارت نے ایٹمی دھماکا کر دیا تو ہمارے کام میں تیزی آ گئی۔ بعد میں آنے والی سب حکومتوں نے اس کو جاری رکھا حتیٰ کہ

ہم نے قدرتی گیس کو ٹرانسپورٹ میں جلا دیا۔ اس کی قلت تو پیدا ہونا ہی تھی۔

1998ء میں مزید بھارتی ایٹمی دھماکوں کے جواب میں پاکستان نے بھی ایٹمی دھماکا کیا۔

سوال: پاکستان میں یورینیم کہاں دستیاب ہے؟

جواب: ہماری سرچ پارٹیاں (Search Parties) ہوتی تھیں۔ جہاں انھیں آثار ملتے، وہاں چھان بین کرتے تھے۔ نمونے لے کر اس کا کیمیائی تجزیہ کیا جاتا تھا۔ جہاں اس کی معقول مقدار ملتی، وہاں سے اس کو کان کنی کے ذریعے نکالتے تھے۔ ہم نے اس کو ڈیرہ غازی خان اور میانوالی کے علاقوں سے حاصل کیا۔

سوال: کیا پاکستان میں پائی جانے والی یورینیم اچھی کوالٹی کی ہے؟

جواب: ہاں اچھی ہے! ہم اس کو ضرورت کے مطابق اپ گریڈ کر لیتے ہیں۔

سوال: کیا پاکستان میں سوئی گیس کی واقعی قلت پیدا ہو گئی ہے؟ ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ گیس لمبے عرصے تک چلے گی۔

جواب: پاکستان کے پاس قدرتی گیس کا بہت بڑا ذخیرہ تھا لیکن حکومتوں نے غلط پالیسی اپنائی۔ دنیا میں بہت کم ممالک ہیں جو گیس سے بجلی بناتے یا ٹرانسپورٹ چلاتے ہیں۔ پھر جو لوگ گیس سے بجلی بناتے ہیں وہ کمبائنڈ سائیکل کے ذریعے سو فیصد بجلی پیدا کرتے ہیں۔ 62 فیصد بجلی گیس جلا کر ٹربائن چلانے سے بناتے ہیں اور اس حرارت سے پانی کو گرم کر کے بھاپ بناتے ہیں پھر بھاپ سے بھی 38 فیصد بجلی بنا لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اس طریقہ کار کو اختیار نہیں کیا گیا۔ جب ہم گیس کو آگ لگا دیں گے تو ذخیرہ جتنا بڑا بھی ہو جلد ختم ہو جائے گا۔ ہمیں چاہیے کہ اس کو صرف ضرورت کے مطابق استعمال کریں۔ بنیادی طور پر گیس آرگینک انڈسٹری کے لیے استعمال کی جانی چاہیے۔ گیس میں ہائیڈروجن ہے، کاربن ہے، ہائیڈروجن ہے تو اس سے فرٹیلائزر یعنی کھاد بنائیں، یوریا بنائیں۔ انڈسٹری میں کام کرنے والے بے شمار کیمیکل آپ گیس کی مدد سے بنا سکتے ہیں جو ان بنیادی عناصر کا قدرتی ذخیرہ ہے۔

سوال: ہائیڈل پاور پراجیکٹ کے ساتھ ڈیم بھی تعمیر ہوتا ہے جس میں پانی جمع ہوتا ہے جو بجلی پیدا کرنے کے بعد آبپاشی کے بھی کام آتا ہے۔ چونکہ پاکستان میں کوئی نیا ڈیم تعمیر نہیں ہو رہا اس لیے پاکستان پانی کی کمی کا بھی شکار ہے۔ اس کا ہمارے پاس کیا حل ہے؟

جواب: یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر نہیں ہو سکی۔ ہمارے پاس دو بڑے ڈیم ہیں: تربیلا اور منگلا۔ ان میں صرف منگلا موڈن سوان کا ڈیم ہے۔ ہمیں فوری طور پر ایک موڈن سوان ڈیم بنانے کی ضرورت ہے جس میں بارشوں کا پانی جمع ہو اور جسے بوقت ضرورت آبپاشی کے لیے استعمال کیا جائے۔ جن علاقوں میں بارشیں زیادہ ہوتی ہیں وہاں ایسے ڈیم بنا کر اس قدرتی وسیلے کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ پوٹھوہار کے علاقے میں سوان ریور سٹوریج (Swan River Storige) کا منصوبہ موجود ہے۔ اگر اس کو فوری طور پر تعمیر نہ کیا گیا تو بہت جلد کسان پانی کی بوند بوند کو ترسیں گے۔

سوال: آپ نے تھرکول پاور پراجیکٹ پر کام کیا ہے۔ سنتے ہیں کہ وہاں کوئلے کے بڑے ذخائر موجود ہیں اور یہ پراجیکٹ پاکستان کے اندھیروں کو اجالوں

میں بدل سکتا ہے۔ ہمیں اس بارے میں کچھ بتائیے۔

جواب: پاکستان خوش قسمت ہے کہ صوبہ سندھ کے صحرائے تھرپارکر کے مشرقی حصے میں 9100 مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلے ہوئے زیرزمین 175 ارب ٹن لگنائٹ کوئلے کے ذخائر موجود ہیں۔ یہ ذخائر پچھلے تیس سال سے معلوم ہیں لیکن ابھی تک ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ یہ ذخائر سطح زمین سے 120 سے 180 میٹر کی گہرائی پر واقع ہیں۔

ان ذخائر کے ایک حصے بلاک 5 جو 64 مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل ہے، پر تجرباتی طور پر زیرزمین کوئلے کو گیس میں تبدیل کرنے کا کام ڈاکٹر ثمر مبارک مند کی سربراہی میں شروع کیا گیا ہے۔ یہاں اندازاً 4 ارب ٹن لگنائٹ کوئلہ موجود ہے جس کو تیس سال تک دس ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بجلی کے علاوہ اس سے کچھ ضمنی کیمیکلز جیسے ڈیزل، سلفر اور [illegible] بھی حاصل ہوں گے۔ یہاں کوئلے کی تہ 71 فٹ موٹی ہے اور اس میں 16.5 فیصد نمی موجود ہے۔ یہ ذخائر 65 ملین سال پہلے بارا فارمیشن (Bara Formation) کے نتیجے کے دوران وجود میں آئے۔ اس علاقے میں زیرزمین پانی کھارا ہے۔ یہاں کوئلے کے ذخیرے کی تہ 54 فٹ موٹی ہے۔ تھر میں کوئلے کا مجموعی ذخیرہ نو سو سال تک پاکستان کی توانائی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے۔

سوال: اس پراجیکٹ پر آپ نے کیا کام کیا؟

جواب: میں وہاں ڈائریکٹر انڈرگراؤنڈ کول گیسیفکیشن (UCG) تھا۔ میں نے 2011ء سے 2012ء تک وہاں کام کیا۔ یہ ایک [illegible] پر زیرزمین کوئلے سے اسی جگہ گیس پیدا کرنے کا عمل ہے۔

کوئلے سے بنی گیس، قدرتی گیس کا بہترین نعم البدل ہے اور وہ سستی بھی پڑتی ہے

اس میں کان کھودے بغیر زیرِ زمین کوئلے کو آگ لگائی جاتی ہے اور اس سے احتراق پذیر گیس حاصل کی جاتی ہے۔ اس عمل میں ہم زمین کے اندر کوئلے تک ایک کنواں کھودتے ہیں جس میں ہوا یا آکسیجن جیسے تکسیدی عامل داخل کیے جاتے ہیں اور کنٹرولڈ حالات میں اس کو جلایا جاتا ہے اور دوسرے قریبی کنویں سے گیس حاصل کی جاتی ہے۔ تکسیدی عامل داخل کرنے اور گیس حاصل کرنے کے لیے دو علیحدہ علیحدہ کنویں کھودے جاتے ہیں۔ انتہائی بلند دباؤ کے تحت احتراق پذیری کا یہ عمل 700 سے 900 درجے سینٹی گریڈ پر کیا جاتا ہے لیکن درجہ حرارت 1500 درجے سینٹی گریڈ تک پہنچ سکتا ہے۔ گیس کو کاربن اسٹیل پائپوں کے ذریعے باہر لایا جاتا ہے اور سطح زمین پر گیس کا درجہ حرارت مختلف ہوسکتا ہے۔

سوال: کیا یہ طریقہ کار دنیا میں کہیں اور بھی استعمال کیا جارہا ہے؟

جواب: انڈر گراؤنڈ کول گیسی فکیشن کا طریقہ سر ولیم سیمنز نے 1868ء میں کیمیکل سوسائٹی آف لندن میں پیش کیا تھا۔ پہلا تجرباتی کام برطانیہ میں 1912ء میں نوبل انعام یافتہ سر ولیم ریمزے کی قیادت میں کیا گیا۔ یہ طریقہ کار جنوبی افریقہ اور روس میں بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ اب چین، آسٹریلیا، امریکا، برطانیہ، بھارت اور پاکستان میں متبادل طور پر پائے جانے والے 2کھرب روپے کے کوئلے کے وسائل کو قابلِ استعمال بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس عمل میں کوئلے کو موقع ہی پر کاربن ڈائی آکسائیڈ

(CO_2) ہائیڈروجن (H_2)، کاربن مونو آکسائیڈ (CO)، میتھین (CH_4) میں تحلیل کردیا جاتا ہے۔ زیرِ زمین کوئلے پر ہونے والے اس عمل کو سطح زمین پر مختلف عوامل سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ یہ عمل کوئلے کے ذخیرے کی زیرِ زمین گہرائی، موٹائی اور راکھ کے تناسب پر بھی مطلوبہ شرائط کے پورا ہونے ہی پر کیا جاتا ہے۔ اور تبھی یہ معاشی لحاظ سے قابلِ عمل بنتا ہے۔ کول گیس قدرتی گیس سے زیادہ مؤثر اور کارآمد ہوتی ہے اور ماحول کے لیے ضرر رساں گرین ہاؤس گیس کے اخراج کو کم کرتی ہے۔ کول گیس پاور پلانٹس میں کمبائنڈ سائیکل گیس ٹربائن (CCGT) کو چلانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ نیز اس کے استعمال سے سطح زمین پر ماحولیاتی نقصان اور فضلے کو ٹھکانے لگانے کے مسائل کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑتا۔ کول گیس قدرتی گیس کا عمدہ نعم البدل ہے۔ اس میں کان کنی اور ٹرانسپورٹ کے اخراجات کی بچت بھی ہوجاتی ہے۔

سوال: کول گیس اور قدرتی گیس سے بجلی کی پیداواری لاگت میں کتنا فرق ہے؟

جواب: بہت فرق ہے۔ سطح زمین پر قدرتی گیس سے بجلی پیدا کرنے کی لاگت (60) ڈالر فی میگاواٹ اور کول گیس سے 116 ڈالر فی میگاواٹ آتی ہے۔ سرفیس گیسی فکیشن (Surface Gassification) سے فی مکعب میٹر گیس کی لاگت پانچ سے 8 روپے اور انڈر گراؤنڈ کول گیسی فکیشن (UCG) سے فی مکعب میٹر 2 سے 3.50 روپے لاگت آتی ہے۔ مختصراً UCG

بدقسمتی سے تھرکول پاور پراجیکٹ سست روی کا شکار ہو چکا ہے۔

بمعہ بہاو بہتر، سستا اور ماحول دوست عمل ہے۔

سوال: تھرکول پاور پراجیکٹ پر کتنی پیش قدمی ہو چکی ہے اور بجلی پیدا کرنے کا عمل کب تک شروع ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے؟

جواب: ابھی تو یہ تجرباتی مرحلے سے گزر رہا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے بھی اس میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ دسمبر 2011ء میں گیس حاصل کرنے کے کامیاب تجربے کے بعد سائنس دانوں کی ٹیم کو امید ہے کہ وہ 2015ء کے آخر تک 100 میگاواٹ کی پیداوار شروع کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ منصوبہ سست روی کا شکار ہو چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے اشی سائنس دانوں کے بجائے علم ارضیات کے ماہرین کے ہاتھوں میں دیا جائے جو اس پیچیدہ عمل کی باریکیوں کو سمجھتے ہیں۔ ورنہ خدشہ ہے کہ یہ منصوبہ ناکام نہ ہو جائے۔

سوال: سنا ہے چنیوٹ کے قریب لوہے کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ میاں شہباز شریف نے وہاں اسٹیل مل لگانے کا بھی اعلان کیا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: جی ہاں! وہاں 200 ملین ٹن لوہے کا اچھا ذخیرہ موجود ہے جس میں تقریباً 60 فیصد لوہا ہے۔ وہاں پہلے بھی تجرباتی کام جرمن فرم کے ذریعے کیا جا چکا ہے۔ اس سے یقیناً ایک اسٹیل مل چل سکتی ہے۔ تھر کالا باغ کے مقام پر بھی 14 کروڑ ٹن لوہے کا ذخیرہ موجود ہے۔

سوال: بیگ صاحب! آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟

جواب: آج کل میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ جیالوجی میں زلزلے کے موضوع پر لیکچر دیتا ہوں اور اسی شعبے میں پی ایچ ڈی بھی کر رہا ہوں۔

سوال: یہ تو بڑا اہم موضوع ہے۔ کیا اس کا تعلق سونامی سے بھی ہے؟

مہمان: جہاں پر براعظمی پلیٹیں (Continental Plates) آپس میں ملتی ہیں اس لائن کو فالٹ لائن کہتے ہیں۔ جب زمین کے اندر کا لاوا اوپر اٹھتا ہے تو وہ ان پلیٹوں کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ اس سے زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوتے ہیں۔ جو زلزلہ سمندر کے اندر آتا ہے اس کو سونامی کہتے ہیں۔ اس سے پانی کی لہر پیدا ہوتی ہے جو ساحلوں پر تباہی مچا رہی ہے۔

سوال: پاکستان میں کون سے علاقے فالٹ لائن پر ہیں جہاں زلزلے کا خطرہ زیادہ ہے؟

جواب: آزاد کشمیر اور اسلام آباد کا علاقہ فالٹ لائن کے قریب ہے۔ کوئٹہ بھی فالٹ لائن پر ہے۔ یہ علاقے زلزلے کی زد میں آتے ہیں اور آئندہ بھی آ سکتے ہیں۔ یہاں پر عمارتیں تعمیر کرتے وقت جھٹکے کے اثر (Shock Factor) کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ لاہور، ملتان، سرگودھا، فیصل آباد، کراچی کو کوئی خاص خطرہ نہیں۔

سوال: بیگ صاحب! آپ مصنف اور شاعر بھی ہیں۔ اپنی تصنیفات کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟

جواب: میں نے پورٹیم ارضیات پر سات کتابیں

لکھی ہیں۔ میرے آٹھ پیشہ ورانہ تحقیقی مقالے پاکستان، چین اور دبئی کانفرنسوں میں پڑھے گئے۔ شیخ اکبر کی رسالۃ الحمیدیہ (عربی) کا انگریزی ترجمہ ''اسلام سائنس اور فلسفہ کے نام سے کیا ہے۔ بہت سی غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں۔

سوال: آپ کو کن کامیابیوں پر گولڈ میڈل اور ستارۂ امتیاز دیے گئے؟ ان کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی ہے کہ مجھے بہت سے ایوارڈز سے نوازا گیا۔

بی ایس سی (آنرز) میں اوّل پوزیشن پر گولڈ میڈل۔ ایم ایس سی جیالوجی میں دوم پوزیشن پر پروفیسرز تمغہ ایوارڈ۔ معدنیات کی چھان بین اور کان کنی میں عمدہ کارکردگی پر گولڈ میڈل۔

یورینیم کی تلاش، کان کنی اور عمل تحلیل میں غیر معمولی انفرادی کامیابی پر حکومت پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز عطا کیا گیا۔

سوال: اپنی شاعری کا کوئی نمونہ عنایت کرنا پسند کریں گے؟

جواب: ایک غیر مطبوعہ غزل پیش خدمت ہے۔

میں مہر سے کلام کر لوں گا
تم ستاروں سے بات کر لینا
آسمانوں سے توڑ کر تارے
شام کا اہتمام کر لینا
میں خزاؤں سے جھولی بھر لوں گا
تم بہاروں کو رام کر لینا
تم پہ تو اعتماد ہے مجھ کو
مجھ پہ کچھ اعتماد کر لینا
خود فراموش اپنی ہستی سے
مجھ کو آسان شکار کر لینا
سب ثمر شجر بوجھ دنیا پہ
سوختوں میں شمار کر لینا
اک نگاہِ کرم ادھر ساقی
کچھ تو بااختیار کر لینا
سامنے آؤ تو میرے جاناں
پھر نگاہوں سے وار کر لینا
اب ہے یہ آرزو ہم اپنی
ان کی خو اختیار کر لینا

ایک آزاد نظم پیش خدمت ہے:

اس اونچے پربت پر رہنے والے
وہ ننھے منے اداس بچے
اداس ہونٹوں سے کہہ رہے تھے
کبھی ہمیں بھی
یہ بیت بھر غذا ملے گی
ہمارے جسموں میں بھی
چنیں گی
وہ برف اجلے لہو کی نہریں
میں گنگ ہوں
شرمسار سا ہو کے سوچتا ہوں
میرے پاس تو کچھ نہیں ہے پیارو! جو تم کو دے پاؤں
تازہ روٹی، چمکتے سکے، نہ جھوٹے موٹے اداس وعدے
میں مضطرب ہوں اداس بھی ہوں
کہ زندگی کی
اداس نگری میں ناامیدی پنپ رہی ہے
نہ کوئی امید آج کی ہے
نہ کوئی امید کل کی ساقی
اداس بچے یونہی رہیں گے۔

◆◆◆

شاندار روایات کا امین

سڑسٹھ برس قبل برصغیر میں غلامی کی طویل سیاہ رات ختم ہوئی اور ہم آزاد فضاؤں میں سانس لینے لگے۔ آزادی کا یہ قیمتی تحفہ ہمارے شہدا کے نذرانے، جان اور لاکھوں مسلمانوں کی قربانیوں کا ثمر ہے۔ اردو ڈائجسٹ ہر سال تحریک پاکستان کے دوران دی گئی انمول بیش بہا قربانیوں اور جہد مسلسل کی یادیں تازہ کرنے کے لیے "آزادی نمبر" شائع کرتا ہے۔ یوں نئی نسل پر بھی آشکار ہوتا ہے کہ کن کٹھن مراحل سے گزر کر ہم آزادی کی عظیم الشان نعمت سے سرفراز ہوئے۔

اردو ڈائجسٹ رواں سال بھی اپنی دیرینہ روایت کے مطابق "آزادی نمبر" شائع کر رہا ہے۔ یہ خوبصورت اور کامیاب پاکستانیوں کی آپ بیتیوں، تحریک پاکستان کی قد آور شخصیات کے تذکروں، جذبہ حب الوطنی کی مہک میں بسی کہانیوں اور ہجرت کی دلدوز داستانوں سے مزین ہوگا۔ قارئین اور مصنفین اپنی تحریریں 30 جون تک بذریعہ اردو ڈائجسٹ جوہر ٹاؤن بھجوا سکتے ہیں۔

اردو ڈائجسٹ کا ہر "آزادی نمبر" نادر و منفرد دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ اندرون و بیرون ملک لاکھوں مرد و زن اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی باعث اس کی خصوصی اشاعت اور ویب سائٹ آپ کی مصنوعات کی تشہیر کا نہایت موثر ذریعہ ہے۔ یوں مصنوعات کا تعارف لاکھوں خواتین و حضرات تک پہنچتا ہے۔ کمپنیاں اور ادارے "آزادی نمبر" میں اپنے اشتہار کی جگہ جلد از جلد مخصوص کروائیں۔ نیز ایڈ ایجنٹ حضرات بھی اپنے آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

ادارہ

اردو ڈائجسٹ

اپنی تحریریں اس پتے پر بھجوائیے 325 جی تھری جوہر ٹاؤن اردو ڈائجسٹ آفس لاہور

یا پھر ای میل کریں editor@urdu-digest.com

گٹھڑی

ایک دیہاتی باپ کی پُراثر کہانی

وہ گھر سے فرار ہوئے بیٹے کو خلوص، محبت اور نرمی کا اثاثہ دینا چاہتا تھا

محمد حسنین آزاد

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر 2 پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ ہر طرف گہما گہمی اور شور تھا۔ ریلوے کے پرانے لیمپ پوسٹ میں لگا زرد روشنی بکھیرنے والا بلب بمشکل اپنا حلقہ روشن کر رہا تھا۔ بلب پر دھواں اور گرد کی اتنی دبیز تہ جم چکی تھی کہ کم روشنی کے باعث ماحول نیم تاریک تھا۔ بلند کھمبوں پر ڈبوں میں رکھے ٹی وی سے نیوز بلیٹن نشر ہو رہا تھا۔ سگریٹ اور ہوٹل کے دھوئیں نے فضا کو کثافت آلودہ کیا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم پر بلغم اور پان کی پچکاریاں فائن آرٹس کا نقش پیش کر رہی تھیں۔ دکانوں پر مکھیوں اور مچھروں نے قبضہ گروپ کی طرح روشنیوں اور بسکٹوں کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ ہجوم اتنا تھا کہ دھکم پیل ہو رہی تھی۔ رفتار اور ترقی گزیدہ عجلت کا شکار مسافر تیز تیز قدم اُٹھاتے، گرتے پڑتے، اپنی اپنی بوگی کی طرف لپک رہے تھے۔

مسافروں کے ساتھ ساتھ جیب تراش، اُچکے اور بردہ فروش بھی تاک میں تھے۔ نائٹ ڈیوٹی کرکے واپس جانے والے ٹکٹ چیکر اور دیگر عملہ خیدہ سے بوجھل تھکے تھکے قدموں کے ساتھ ڈگمگاتے قدموں سے گھر

اس ہنگامہ خیز ماحول میں ایک عمر رسیدہ بوڑھا ہاتھ میں لاٹھی، دوسرے میں ایک بڑی اور بھاری گٹھڑی اٹھائے ہوئے عدسوں کی گول عینک لگائے، لڑکھڑاتا، بمشکل ہجوم کو چیرتا، ایک ایک بوگی کے قریب جاکر کھڑکی سے اندر جھانک کر آواز دیتا: "عبداللہ بیٹا! عبداللہ بیٹا!" جب چار پانچ مرتبہ آواز دینے کے بعد جواب نہ ملتا، تو اپنی عینک درست کرتے ہوئے مسافروں اور پولیس والوں سے دھکے کھاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔

بوڑھا نہایت بے چینی اور فکر مندی سے بیٹے کی جدائی کے صدمے سے کپکپاتی آواز سے اگلی کھڑکی میں جھانک کر پکارتا: "سونے جیسا! میرے بیٹے! میں تجھے روکنے یا واپس لینے نہیں آیا۔ بیٹا تو نے جانا ہے تو جا، لیکن یہ دیکھ میں تیرے لیے کیا کیا چیزیں لایا ہوں۔ بیٹا! تو جلدی اور ناراضی میں یہ قیمتی سامان گھر بھول آیا تھا۔ میں سامان دینے آیا ہوں۔"

اسی دوران ایک ٹکٹ چیکر نے بابا کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے پوچھا: "بزرگو! کسے تلاش کر رہے ہو؟"

بوڑھا عینک اور گٹھڑی سنبھالتے ہوئے بولا: "بابو جی! میرا بیٹا اعلیٰ تعلیم اور ترقی کے لیے بڑے شہر جا رہا ہے۔ وہ گھر سے روانہ ہوتے وقت یہ سامان جو اس گٹھڑی میں بندھا ہوا ہے، بھول آیا تھا، میں اسے دینے آیا ہوں۔"

ٹکٹ چیکر نے کہا: "بابا جی! آپ ایک طرف کھڑے ہو جائیں۔ اتنے ہجوم میں آپ گر پڑیں گے۔ آپ کو چوٹ لگ جائے گی۔ آپ گھر واپس چلے جائیں، اس گٹھڑی کو رہنے دیں۔ جو سامان وہ لے گیا ہے وہی کافی ہوگا۔ اگر ضرورت ہوئی تو باقی چیزیں شہر سے خرید لے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں، آرام کریں، گھر جائیں۔"

بوڑھے نے نہایت عجز اور منت سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا: "بابو جی! ٹھیک ہے، وہ سارا سامان اس کے کام آئے گا۔ لیکن جو سامان اس گٹھڑی میں ہے، وہ اسے کسی دکان سے نہیں مل سکتا۔ آپ کسی طرح میرے بیٹے کو تلاش کر دیں۔ اس تک یہ سامان پہنچا دیں۔ اس کے بغیر وہ سفر اور پردیس میں کیسے گزارہ کرے گا؟ اس کا ایک ایک دن گزارنا مشکل ہو جائے گا۔"

آخر کار ٹکٹ چیکر نے بوڑھے سے اس کے بیٹے کا نام اور حلیہ پوچھا تاکہ اسے تلاش کر سکے۔ بوڑھے نے بتایا: "میرا پتر لمبا چوڑا، گبرو جوان ہے۔ کھلا ماتھا ہے، گندمی رنگ ہے۔ چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی ہے۔ اس کا نام عبداللہ ہے اور آدم پور کا رہنے والا ہے۔ بس تم ڈبے میں جاکر آواز دینا، بھئی عبداللہ کون ہے؟ اس کا باپ محمد دین اس کا سامان دینے آیا ہے۔ پلیٹ فارم پر انتظار کر رہا ہے۔ وہ فوراً آ جائے گا۔ بڑا فرمانبردار ہے میرا بیٹا!"

ٹکٹ چیکر کار خیر سمجھتے ہوئے ثواب کمانے کی نیت سے مختلف بوگیوں میں عبداللہ کو تلاش کرتا رہا، آواز دیتا رہا مگر اتنے مسافروں میں اسے تلاش کرنا ناممکن تھا۔ کافی دیر انتظار کے بعد ٹکٹ چیکر واپس نہ آیا تو بوڑھے کو سخت پریشانی ہوئی۔

گاڑی کی روانگی کا وقت ہو گیا۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کو چھوڑتے

ہوئے آگے کی طرف رینگنے لگی۔ بوڑھا، بے چینی اور فکر سے بار بار اِدھر اُدھر آنے جانے والے لوگوں میں اس ٹکٹ چیکر کو تلاش کر رہا تھا... لیکن وہ واپس نہ آیا۔ اب گاڑی کی رفتار دھیرے دھیرے بڑھنا شروع ہوئی۔ بوڑھا ناامید ہو کر ایک بوگی کی طرف بڑھا اور ساتھ ساتھ چلتا ہوا ڈبوں کے اندر جھانک کر پھر آواز دینے لگا: "عبداللہ بیٹا! یہ اپنا سامان لے لو۔" لیکن اسے عبداللہ نہ ملا۔

گاڑی کی رفتار بڑھ گئی۔ ضعیف بزرگ اپنی رعشہ زدہ، کمزور، کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ گاڑی کے ساتھ ساتھ مسافروں سے ٹکراتا، چیختا ہوا دوڑنے لگا۔ اب وہ تقریباً چیختے ہوئے عبداللہ کو آوازیں دے رہا تھا: "بیٹا! اپنا زادِ راہ لے جاؤ۔ اپنا قیمتی اثاثہ لے لو۔ یہ تمھاری امانت ہے۔"

گاڑی کی رفتار اور تیز ہو گئی تھی۔ بوڑھا بھی تیز دوڑنے کی پوری کوشش کر رہا تھا، لیکن اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اس رفتار کا ساتھ نہ دے سکے گا۔ ایک پولیس والے نے اس کو پکڑ کر روکنا چاہا، مگر وہ اپنا بازو چھڑا کر دوڑتا رہا۔

اچانک سامنے سے اُسے ایک نوجوان دوڑتا ہوا گاڑی کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر اس نوجوان کو روکا اور کہا: "بیٹا! خدا کے لیے یہ گٹھڑی کسی طرح میرے بیٹے عبداللہ تک پہنچا دو۔ وہ اسی گاڑی میں سوار ہے۔" نوجوان کو اس پر رحم آ گیا اور گٹھڑی لیتے ہوئے بولا: "بابا جی! ٹھیک ہے۔ اگر مجھے راستے میں کہیں آپ کا بیٹا ملا تو یہ سامان اس کو ضرور دے دوں گا۔"

یہ نوجوان بھی اس گاڑی میں سوار ہونے کے لیے آیا تھا۔ اسے بہت جلدی تھی۔ گاڑی نے پلیٹ فارم تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ نوجوان بمشکل آخری بوگی کے پائیدان پہ اپنا قدم رکھ سکا۔ گاڑی کا دروازہ پکڑنے کی کوشش میں اس کے ہاتھ سے گٹھڑی چھوٹ گئی۔ گاڑی ہوا کے دوش پر سوار ہو چکی تھی اور وہ نوجوان معجزانہ طور پہ بچتے ہوئے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گٹھڑی چھٹتے ہی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ فارم پہ گری، تین اُچکے جو کافی دیر سے مسلسل بابا جی کی گٹھڑی پہ نظر رکھے ہوئے تھے، چیل، کووں کی طرح جھپٹے اور پلک جھپکتے ہی پلیٹ فارم کے عقب میں ٹکٹ گھر کے سامنے ٹکٹ لینے والوں کے ہجوم میں غائب ہو گئے۔ بوڑھا جو پیچھے رہ گیا تھا، لڑکھڑاتا ہوا آ رہا تھا اور شور مچا رہا تھا: "میں لٹ گیا۔ بچاؤ! میرا قیمتی سامان اُچکے لیے جا رہے ہیں۔" پھر وہ چلایا: "او ظالمو! اس میں تمھارے کام کی کوئی شے نہیں ہے۔ یہ میری عمر بھر کی پونجی ہے۔ یہ میرے بیٹے کا اثاثہ ہے۔ خدا کے لیے اسے کچھ نہ کرنا۔ میری گٹھڑی واپس کر دو۔ مجھے لوٹا دو۔"

اُنھوں نے بوڑھے کی ایک نہ سنی۔ کچھ دور جا کر جب اُنھوں نے گٹھڑی کھول کر دیکھی تو اس میں ان کو اپنے مطلب کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ چناں چہ وہ اُسے وہیں پھینک کر ریلوے لائن پھلانگتے ہوئے، اسٹیشن کی دوسری طرف غائب ہو گئے۔ وہ چیختا، ہانپتا، لڑکھڑاتا ہوا، جب وہاں تک پہنچا تو دیکھا کہ اس کا سارا اثاثہ بکھرا پڑا تھا۔ راہگیر ان اشیا کو پیروں تلے روندتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کسی کو پروا نہیں تھی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

کسی نیک دل خاتون نے اس کی حالت زار دیکھی تو از راہِ ترحم پوچھا: "بابا جی! کیا بات ہے؟ کیوں رو رہے ہو؟"

"کیا بتاؤں بیٹی!" وہ اپنے صافے سے آنسو پونچھتا ہوا بولا: "میرا بیٹا گاؤں سے بڑے شہر گیا ہے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے۔ گھر سے چلتے وقت وہ اپنا قیمتی سامان گھر ہی بھول آیا تھا۔ میں وہ سامان اس تک پہنچانے کے لیے آیا تھا۔ گاڑی روانہ ہوگئی پر میرا بیٹا مجھے نہ مل سکا۔ دوسری قیامت مجھ پہ یہ گزری کہ تین چار اُچکے میری گٹھڑی لے اُڑے، لیکن ان کم بختوں نے اپنے مطلب کی چیز نہ پاتے ہوئے میری دیسی اور خالص چیزیں زمین پر پھینک دیں۔

اُس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا: "بیٹی! کیا بتاؤں۔ میں نے اپنی زندگی کے سنہرے سال اس سامان کو جمع کرتے ہوئے صرف کیے۔ یہ میری عمر بھر کی پونجی تھی۔ میں نے زندگی اور عمر کے پاٹوں میں اپنی خوشیوں اور غموں کو پیس کر محبت اور متانت کا ستو تیار کر کے اس گٹھڑی میں رکھا تھا۔ عبداللہ کی ماں نے خاص اپنے ہاتھوں سے متانت کے گھی میں تل کر شرم و حیا کی پنیاں تیار کی تھیں، وہ اسی میں تھیں۔ ہم دونوں کی دعاؤں کے بسکٹ تھے۔ صبر و استقامت کے دانے تھے۔ مدینے کے تاجدار کے اعلیٰ اقوال کے لعل و جواہر تھے اور بہشتی زیور تھا اس میں۔ ہائے ہائے! ان ظالم اُچکوں نے میرے بیٹے کا زادِ راہ لوٹ کر بکھیر دیا۔"

وہ نڈھال سا ہو کر بیٹھا اور حسرت سے اس سامان کو دیکھنے لگا۔ خاتون کے چہرے پر حیرت اور تاسف کے ملے جلے جذبات تھے۔ "یہ گٹھڑی میرے بیٹے تک ضرور پہنچنا چاہیے تھی کیوں کہ جس سفر پر وہ گیا ہے، راستے میں "مدرسہ نگر، اسکول سٹاپ، جامعہ جنکشن، میسیت گڑھ (مسجد گڑھ)، مرشد آباد میں، یہ ساری دیسی اور خالص چیزیں جو نہیں تھیں جو انسانی صحت کو لاحق ہر بیماری کا شافی و کافی علاج ہیں۔

شہر جانے والے کا دل جو ہے نا، وہ پتھر کا ہو جاتا ہے اور اللہ نہ کرے، شہر میں کسی کو نمائش اور امارت کا اژدھا ڈس لے، تو بندے کا خون بیلا پڑ جاتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے سفید ہو جاتا ہے۔ بندے میں سانپ والی خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کسی کی بھی عزت، جان، مال اور اپنے پرائے کسی کو معاف نہیں کرتا۔"

وہ نیک سیرت خاتون بابا جی کی حالت اور باتیں سن کر دم بخود رہ گئی۔ لیکن اسے بھی اپنے گھر جانے کی جلدی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو روک سکی۔ بابا کی دلجوئی کے لیے اس نے حوصلہ کر کے کہا: "بابا جی! اب آپ اپنے بیٹے کے لیے خیر و عافیت کی دعا کریں۔ اوپر والا سب سے بہترین نگران ہے۔" یہ کہہ کر وہ رخصت ہوگئی، لیکن بوڑھے دین محمد کے آنسوؤں کی نمی کو اپنی آنکھوں میں اور گٹھڑی کی بھینی بھینی خوشبو اپنے وجدان میں محسوس کر رہی تھی۔ دین محمد اس سے بے خبر، گرد آلود اور پیروں تلے روندی ہوئی چیزیں اپنے صافے میں، جس کا ایک سرا آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا، باندھ کر واپس گاؤں کی طرف اپنی کمزور اور تھکی تھکی ٹانگوں سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا جا رہا تھا۔

اُس کے الفاظ: "عبداللہ..... ! عبداللہ بیٹے..... ! یہ گٹھڑی، اپنا قیمتی اثاثہ لے جاؤ....." فضا میں چاروں طرف گونجتے محسوس ہوتے۔

گھروں میں اکثر پوچھا جانے والا سوال

کیا جوس بچوں کے لیے مفید ہیں؟

جدید طبی تحقیق نے متفکر ماؤں کا یہ دیرینہ مسئلہ حل کر دیا کہ وہ اپنے بچوں کو جوس پلائیں یا نہیں!

ڈاکٹر شائستہ خان

زیشان کے بیٹے کھانے کے معاملے میں بڑا "چوزی" تھا۔ خصوصاً جو پھل اُسے پسند آتا، وہی کھاتا اور اس کی فہرست پسند میں دو تین پھل ہی شامل تھے۔ گو کہ انار، انگور وغیرہ میز پر سارا دن دھرے رہتے اور وہ انھیں ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ چونکہ زیشان کی باشعور ماں پھلوں کی غذائی اہمیت سے واقف تھی، لہٰذا وہ پریشان ہو گئی۔

ایک دن وہ ماہر امراض بچگان کے پاس گئی اور اُسے اپنے بیٹے کا مسئلہ بتایا۔ ڈاکٹر نے تجویز دی کہ وہ متلون مزاج بیٹے کو ان پھلوں کا جوس یا رس پلائے۔ یوں اُسے پھلوں کی غذائیت مل جائے گی۔ ماں کو یہ مشورہ پسند آیا۔ چناں چہ اس نے مالٹے، انار اور دیگر ایسے پھلوں کا جوس نکال کر زیشان کو دیا۔ اس نے شروع میں چوں چرا کی، پھر وہ یہ رس رغبت سے پینے لگا۔

یہ واقعہ خصوصاً ان ماؤں کی نظر میں جوس کی اہمیت واضح کرتا ہے جن کے بچے پھل نہیں کھاتے۔ تاہم کئی مائیں یہ سوچ کر اپنے بچوں کو رس نہیں پلاتیں کہ بعض ڈاکٹروں کا کہنا ہے، جوس میں پھل کی ساری غذائیت نہیں موجود ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ اس مسئلے کے بارے میں جدید طب کیا کہتی ہے؟

ڈاکٹر ڈیانا ویلمز امریکا کی مشہور ماہر غذائیات ہے۔ وہ کہتی ہے کہ پھلوں کا 100 فیصد خالص جوس غذائیت سے مالا مال ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں ضروری غذائی مادے مثلاً وٹامن اے، وٹامن سی، فولیٹ، پوٹاشیم، میگنیشیم وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ بعض بڑی کمپنیاں اپنے ڈبا بند جوسوں میں کیلشیم اور وٹامن ڈی بھی شامل کرتی ہیں۔ ڈاکٹر ڈیانا کہتی ہے:

"یہ تمام غذائی عناصر بچوں کو ضرور ملنے چاہئیں۔ لیکن جو بچہ خصوصاً ریشے پھل نہیں کھاتا، وہ ان سے محروم رہتا ہے۔ نتیجتاً اس کی صحت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بعض بچے تو سبزیاں بھی نہیں کھاتے اور یوں نباتاتی غذائیت سے محروم رہتے ہیں۔ لہٰذا ایسے بچوں کے لیے صرف جوس ہی غذائی عناصر فراہم کرنے والی شے بن جاتی ہے۔"

یاد رہے، بمطابق عمر بچوں کو روزانہ ایک تا دو پیالی پھل کھانے چاہئیں۔ کوئی بچہ مطلوبہ پھل نہیں کھاتا، تو چار اونس (تقریباً 118 ملی لیٹر) جوس اسے مطلوبہ غذائیت فراہم کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے ضدی بچوں کے لیے جوس کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ تحقیق سے بھی ثابت ہو چکا کہ جوس پینے والے بچے ان بچوں سے زیادہ تندرست ہوتے ہیں جو نہ تو جوس پیتے ہیں نہ پھل کھاتے ہیں۔

بچوں کی صحت کے حوالے سے جوس دو اور فوائد رکھتا ہے۔ اول یہ کہ آج کی تیز رفتار زندگی میں کئی بچوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ آرام سے بیٹھ کر پھل کھائیں۔ دوسرے کئی بچے پھل چھیلنے کو بھی کٹھن کام سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ایسے بچے بھی پھلوں کا رس پی کر مطلوبہ غذائیت پا سکتے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ ایک اور امریکی ماہر غذائیت، ڈاکٹر رچرڈ سکارپا پیش کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جوس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ اس کی بدولت بچے کو زائد شکر، حرارے اور کاربوہائیڈریٹ مل جاتے ہیں۔ کیونکہ عموماً پھل کم کھایا جاتا ہے۔ جبکہ ایک گلاس رس میں کئی پھلوں کا جوہر موجود ہوتا ہے۔ یوں ضرورت سے زیادہ حرارے بچے کو فربہ کر سکتے ہیں۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ جوس پھل کے ریشے (پھوک یا فائبر) سے محروم ہوتا ہے۔ چنانچہ جو بچے روزانہ غذا سے ریشہ نہیں پا رہے، وہ اس اہم غذائی عنصر کی کمی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ بعض بچے صرف جوس سے پیٹ بھرنے لگتے ہیں۔ یہ رجحان بھی نقصان دہ ہے۔

گویا جدید تحقیق جوس سے وابستہ نیا نقص بھی سامنے لے آئی... یہ کہ وہ انسان کو فربہ کر سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جوس اور دیگر مائع مواد دماغ کو یہ سگنل نہیں بھجواتے کہ پیٹ بھر گیا ہے۔ اس سے کئی بچے اور بڑے ضرورت سے زیادہ جوس پی کر خود کو فربہ کر لیتے ہیں۔ مزید برآں رس پینے سے خون میں شکر کی سطح تیزی سے بڑھتی ہے۔ یہ عمل بھی بچوں کو موٹاپے اور ذیابیطس سے دوچار کر سکتا ہے۔

درج بالا بحث سے امریکی ماہرین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بچوں کو سالم پھلوں ہی سے مطلوبہ غذائیت ملنی چاہیے۔ اگر وہ پھل رغبت سے نہیں کھاتے تو بحالت مجبوری انھیں جوس پلایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسے رس 100 فیصد خالص ہونے چاہئیں اور ان میں کیمیائی مادے بھی نہ ہوں۔ البتہ ماں چاہے تو 4 اونس جوس میں 4 اونس پانی ملا سکتی ہے تاکہ اس میں شکر کی مقدار کم ہو جائے۔

یہ امر اہم ہے کہ روزانہ بچوں کو کتنا جوس پینا چاہیے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ایک سال سے کم عمر بچے کو جوس نہ دیجیے۔ 1 تا 6 سال کے بچے روزانہ چار تا چھے اونس رس استعمال کریں۔ جبکہ 7 تا 18 سال کے بچے (لڑکے اور لڑکیاں) 8 تا 12 اونس (236 تا 354 ملی لیٹر) جوس پی سکتے ہیں۔

◆◆◆

اربوں انسانوں کی دلچسپی کا مرکز

فٹ بال کا عالمی میلا سجنے والا ہے

انجم نیاز

چار برس بعد جوش و جذبے، ذوق اور محبت کے لازوال جذبوں کو سموئے لہو گرما دینے والے مقابلے شائقین کی دید کے منتظر ہیں

ڈیوائٹ آئزن ہاور 1953ء تا 1961ء امریکا کے صدر رہے۔ اس سے قبل دوسری جنگ عظیم میں سرگرم حصہ لے چکے تھے۔ ان کا قول ہے "قیادت کی اعلیٰ ترین خصوصیت دیانت داری ہے۔ اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔۔۔۔ چاہے فٹ بال کا کھیل ہو، میدان جنگ یا دفتر۔" یہ حقیقت ہے کہ فٹ بال کا میچ ہو یا جنگ کا میدان' جو فریق جان لڑا کر مقابلہ کرے وہی فتح

Brazil 2014

یاب ہوتا ہے۔ سو تیار ہو جائیے' 12 جون تا 13 جولائی برازیلی اسٹیڈیمز میں دنیا کی بہترین بتیس فٹ بال ٹیموں کے مابین کانٹے دار مقابلے دیکھنے کے لیے۔

بیس واں عالمی کپ

یہ 2007ء کی بات ہے جب فٹ بال کی عالمی تنظیم فیفا کے ایک اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ 2014ء کا بیس واں عالمی کپ برازیل میں منعقد کیا جائے۔ اس موقع پر قدرتاً برازیلیوں نے خوب خوشیاں منائیں۔ یاد رہے برازیل میں فٹ بال کو مذہب کے مانند مقدس درجہ حاصل ہے۔ اسی باعث ننھے منے بچے بھی بہت عمدہ فٹ بال کھیلتے نظر آتے ہیں۔

فٹ بال سے حد درجہ الفت رکھنے کے باوجود یہ امر باعث تعجب ہے کہ اب تک صرف ایک بار (1950ء) میں عالمی کپ برازیل میں منعقد ہوا۔ گویا فٹ بال کی اس سب سے بڑی چیمپئن شپ نے 64 سال بعد برازیل کا رخ کیا ہے۔ اسی لیے برازیلی بڑی بے تابی سے اس کے منتظر ہیں۔ عالمی کپ 14ء میں 32 ممالک کی فٹ بال ٹیمیں حصہ لے رہی ہیں۔ دنیا کے اربوں شائقین فٹ بال ان کے مابین کھیلے جانے والے 64 مقابلے دیکھ سکیں گے۔ یہ مقابلے بارہ مختلف برازیلی شہروں میں کھیلے جائیں گے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ فٹ بال کے مقابلے اتنے زیادہ شہروں میں منعقد ہو رہے ہیں۔

برازیل ہی اب تک سب سے زیادہ یعنی پانچ بار عالمی کپ جیت چکا۔ اس کے بعد اٹلی چار مرتبہ' جرمنی تین بار' یوراگوائے اور ارجنٹائن دو دو بار اور برطانیہ' فرانس اور اسپین ایک ایک بار ورلڈ کپ جیت چکے ہیں۔

ٹیموں کے مابین مقابلہ

عالمی کپ میں شرکت کے لیے فیفا کی رکن ٹیمیں باہم مقابلہ کرتی ہیں۔ فی الوقت 209 ممالک کی فٹ بال ٹیمیں فیفا کی رکن ہیں۔ ان ممالک کو چھے جغرافیائی خطوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

عالمی کپ 14ء میں جگہ بنانے کی خاطر 15 جون 2011ء تا 20 نومبر 2013ء دو سو سات ٹیموں کے مابین کل آٹھ سو بیس میچ ہوئے۔ دو میچوں میں پاکستانی قومی فٹ بال ٹیم بھی بنگلہ دیش کی ٹیم سے ٹکرائی۔ تاہم اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

برازیل میزبان ملک کی حیثیت سے خودبخود عالمی کپ 14ء کا حصہ بن گیا۔ بقیہ 31 ٹیمیں کوالیفائنگ مقابلوں کے ذریعے منتخب ہوئیں۔ ان میں بوسنیا ہرزیگووینیا کو پہلی بار عالمی کپ کھیلنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان ٹیموں میں فیفا کی درجہ بندی کے مطابق پہلی دس بہترین ٹیمیں یہ ہیں:

اسپین' جرمنی' ارجنٹائن' کولمبیا' بیلجیم' یوراگوئے' سوئٹزرلینڈ' ہالینڈ' اٹلی اور برطانیہ جبکہ برازیل گیارہویں نمبر پر فائز ہے۔

کپ کون جیتے گا؟

ماہرین اور جوئے بازوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ اس بار کپ جیتنے کے سلسلے میں برازیل "ہاٹ فیورٹ" ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ اب تک

برازیل میں عوامی احتجاج

2010ء کے بعد عالمی معاشی بحران برازیل پر بھی حملہ آور ہوا۔ کئی لوگ اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ہزارہا کے کاروبار تباہ ہوئے۔ اسی دوران برازیلی حکومت ورلڈکپ کی تیاریوں کے سلسلے میں کروڑوں ڈالر خرچ کرنے لگی۔ اس امر نے برازیلی عوام کو چراغ پا کر دیا۔

گو برازیل معاشی طور پر ابھرتا ملک ہے، مگر وہاں نظام حکومت میں اب بھی کرپشن موجود ہے۔ نیز حکمران طبقہ پرتعیش زندگی گزارتا اور آئے دن خود کو سہولتوں سے سرفراز کرتا ہے۔ چناں چہ پچھلے سال سے برازیلی شہروں میں ورلڈکپ کے خلاف زبردست مظاہرے شروع ہو گئے۔

برازیل میں اب بھی فٹ بال کے لاکھوں چاہنے والے بستے ہیں۔ مگر وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بیشتر سرکاری اسکول ٹوٹے پھوٹے اور بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ اسپتالوں میں بھی طبی سہولیات کی کمی ہے۔ بیشتر سرکاری محکموں میں تنخواہیں بھی کم ہیں۔ مگر اسی دوران برازیلی حکومت نے ورلڈکپ منعقد کرنے کی خاطر کروڑوں ڈالر (ہمارے حساب سے اربوں روپے) خرچ کر ڈالے۔

برازیلی عوام کا کہنا ہے کہ اس رقم سے کئی سو اسکولوں، اسپتالوں اور دیگر عوامی عمارتوں کی مرمت و تعمیر ممکن تھی۔ بےگھروں کو گھر میسر آ جاتے۔ اسی لیے انھوں نے ورلڈکپ کو حکمران طبقے کی خواہشوں کا آئینہ دار قرار دیا جو دنیا میں برازیل کو بہ حیثیت ”سپر پاور“ پیش کرنا چاہتا ہے۔ مگر حقیقت میں بھارت کے مانند برازیل میں بھی لاکھوں انسان غربت، مسائل اور تکالیف میں مبتلا ہیں۔

برازیل میں بھی عوامی احتجاج اس امر کا ثبوت ہیں کہ حکومت عوام کی امنگوں پر پورا نہیں اتر سکی۔ مشہور امریکی راہنما تھامس جیفرسن کا قول ہے: جو حکومت اپنے عوام کا اعتماد کھو بیٹھے، وہ زوال پذیر ہونے لگتی ہے۔ عوامی اعتماد ہی ہر حکومت کا بہترین (سیف) ڈپازٹ ہوتا ہے۔

صرف برازیل اور ارجنٹائن ہی نے کسی دوسرے براعظم میں جا کر ورلڈکپ جیتا ہے۔ لہٰذا برازیلی فٹ بال ٹیم اپنے ملک میں اپنے ہی شائقین کے سامنے کھیلے گی تو جیت کی خاطر جان لڑا دے گی۔

بہرحال برازیلیوں کو کپ پلیٹ میں رکھا نہیں ملے گا۔ انھیں مضبوط ٹیموں سے کٹھن مقابلہ کرنا ہے۔ ان ٹیموں میں جرمنی، ہالینڈ، اسپین اور ارجنٹائن سرفہرست ہیں۔ اٹلی اور بیلجیم کی ٹیمیں بھی مدمقابل کو ”ٹف ٹائم“ دیں گی۔

انعامی رقم

اس بار فیفا نے عالمی کپ 2014ء کے لیے مجموعی طور پر ستاون کروڑ چھپن لاکھ ڈالر مختص کیے ہیں جو اخراجات کا نیا ریکارڈ ہے۔ جنوبی افریقہ میں ہونے والے پچھلے عالمی کپ 2010ء کی خاطر 42 کروڑ

ڈالر مختص ہوئے تھے۔

اس بار ورلڈ کپ میں شریک ہونے والی ہر ٹیم کو 80لاکھ ڈالر(77 کروڑ60لاکھ روپے) ملیں گے۔ جبکہ کپ جیتنے والی ٹیم تین کروڑ پچاس لاکھ ڈالر پائے گی۔ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم قریباً ساڑھے تین ارب روپے بنتی ہے۔ فائنل کھیلنے والی دوسری ٹیم کو ڈھائی کروڑ ڈالر ملیں گے۔ جن کلبوں کے کھلاڑی ورلڈ کپ میں شریک ہیں' وہ بھی بطور ہرجانہ 70لاکھ ڈالر وصول کریں گی۔

کپ کی اختراعات

اس ورلڈ کپ میں پہلی بار گول-لائن ٹیکنالوجی (Goal-line Technology) متعارف کروائی جائے گی۔ اس میں الیکٹرونک آلات کے ذریعے دیکھا جاتا ہے کہ گیند گول پوسٹ کی لکیر پار کر گئی ہے یا نہیں۔ یوں ریفری کو فیصلہ کرنے میں آسانی رہتی ہے۔

اسی عالمی کپ میں غائب ہو جانے والا اسپرے بھی پہلی بار استعمال ہوگا۔ ریفری فری کک کا نشان لگانے کی خاطر یہ سپرے برتے گا جو چھڑکنے کے دس منٹ بعد غائب ہو جائے گا۔

سرکاری نشان اور نعرہ

ورلڈ کپ 2014ء کے نشان (Logo) کا نام "انسپائریشن" یا دل میں جنم لینے والا جذبہ ہے۔ نشان میں تین ہاتھوں کی شکل میں ٹرافی بنی ہوئی ہے۔ ٹرافی کے سبز اور زرد رنگ عیاں کرتے ہیں کہ برازیلی جوش و جذبے سے دنیا والوں کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔

عالمی کپ کا سرکاری نعرہ (Slogan) "سب ایک لے میں" (All in one Rhythm) قرار پایا۔ یہ بھی موسیقی سے رغبت رکھنے والے برازیلیوں کی خصوصیت عیاں کرتا ہے۔ 1962ء کے فٹ بال عالمی کپ سے "سرکاری گیت" بھی تخلیق ہوتا آ رہا ہے۔ حالیہ ورلڈ کپ کا گیت "ہم ایک ہیں" (we are one) بنایا گیا۔ اسے مشہور گلوکاروں' پٹ بل' جینیفر لوپاز اور کلاڈیا لیٹی کی آوازوں میں ریکارڈ کیا گیا۔

میچوں کی بال

ورلڈ کپ 2014ء کے میچ ایڈی ڈاس کمپنی کی تیار کردہ گیند "برازوکا" (Brazuca) سے کھیلے جائیں گے۔ یہ دو الفاظ برازیلی اور پرتگالی لفظ بولا کا امتزاج ہے۔ برازوکا کے معنی ہیں: برازیلی طرز حیات۔ یہ فٹ بال سے برازیلیوں کی الفت' جذبات' فخر اور نیک نیتی کو ظاہر کرتا ہے۔

واضح رہے ماضی کے ورلڈ کپ میں ہمارے شہر اقبال سیالکوٹ میں بنی گیندیں استعمال ہو چکی ہیں۔ اب بھی 2000ء سے یورپ میں فٹ بال کے سب سے بڑے مقابلے چیمپئنز لیگ میں پاکستان میں بنائی گئی گیندیں "ایڈی ڈاس فائنل" (Adidas Finale) استعمال ہوتی ہیں۔ ایڈی ڈاس کمپنی یہ گیندیں سیالکوٹ سے تیار کراتی ہے۔

نئی تعمیرات

ورلڈ کپ 2014ء شایان شان طریقے سے منعقد

کرنے کی خاطر برازیلی حکومت نے انفرا اسٹرکچر پر اربوں روپے خرچ کیے۔ مثلاً بارہ اسٹیڈیمز کی تزئین و آرائش ہوئی، نیز انھیں کشادہ کیا گیا۔

ملک بھر میں نئے ہوائی اڈے تعمیر ہوئے تاکہ بیرون ممالک سے آنے والی قریباً چھ لاکھ سیاحوں کو آمد و رفت میں مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ٹرانسپورٹیشن کے مراحل آسان بنانے کے لیے سڑکیں پٹریاں اور بسوں کے راستے بھی تعمیر کیے گئے۔ نیز نئے ہوٹل بھی بنائے گئے ہیں۔

واضح رہے تعمیراتی کاموں سے برازیلیوں کو روزگار ملا۔ مزید برآں معاشی سرگرمی میں اضافہ ہوا۔ تاہم برازیلی عوام کو ورلڈ کپ پر اربوں ڈالر کا خرچ پسند نہیں آیا۔ یہی نہیں کہ وہ ورلڈ کپ کے خلاف ہیں۔ انھیں غصہ اس امر پر آیا کہ حکومت نے ان کی حالت زار سنوارنے پر معمولی تک خرچ نہیں کی۔

یاد رہے معاشی ترقی ہونے کے باوجود آج بھی قریباً چالیس فیصد برازیلی غربت میں مبتلا ہیں۔ انھیں صحت و تعلیم کی سہولیات میسر نہیں اور آمدن اتنی ہے کہ جسم و روح کا رشتہ برقرار رکھا جا سکے۔ انہی لوگوں نے برازیلی حکومت کے خلاف مظاہرے بھی کیے۔ عوام کا مطالبہ تھا کہ ان کا معیار زندگی بہتر بنانے کے لیے بھی اربوں روپے خرچ کیے جائیں۔ اس امر نے بہرحال ورلڈ کپ 2014ء کو کسی حد تک متنازع بنا دیا۔

اس کے باوجود جن ممالک میں فٹ بال کے کھیل کو مقبولیت درجہ حاصل ہے، وہاں ورلڈ کپ کا بخار

طبی اقوال

☆ جس کی خوراک کم ہو، اس کی عمر زیادہ ہوگی۔ (لقمان حکیم)

☆ تلوار سے اتنے آدمی نہیں مرتے جتنے بسیار خوری سے مر جاتے ہیں۔ (بوعلی سینا)

☆ پُرخور اپنی قبر اپنے دانتوں سے کھودتے ہیں۔ (ابن الہیثم)

☆ قدرت کی پکار پر جو لوگ دھیان نہیں دیتے انھیں طرح طرح کی بیماریاں گھیر لیتی ہیں۔ (مارشل)

☆ دور تک پیدل گھومنے سے جتنی بیماریاں دور ہوتی ہیں اتنی کسی بھی دوا اور پرہیز سے دور نہیں ہوتیں۔ (سمتھ)

☆ شکم سیری نہ صرف پیٹ کی بیماریاں بڑھاتی بلکہ انسان کے دل کو بھی بیمار کر دیتی ہے۔

☆ جس طرح تندرستی اس آدمی کو ڈھونڈتی ہے جو پیٹ خالی ہونے پر ہی کھانا کھاتا ہے، ٹھیک اسی طرح بیماری اس کو ڈھونڈتی ہے جو حد سے زیادہ کھاتا ہے۔ (رشی)

☆ زیادہ گرم کھانا کھانا، سر پر گرم پانی ڈالنا، سورج کی طرف دیکھنا اور ترش چیزوں کا استعمال بینائی کو کمزور کر دیتا ہے۔ (بقراط)

(مراسلہ: تحریم حسین، چاروال)

چڑھ چکا۔ کھیلوں کی دنیا کے اس سب سے بڑے مقابلے کو اربوں لوگ دیکھیں گے۔ جوش و جذبے سے بھرپور شائقین تماشائیوں کی دید کے منتظر ہیں۔

اسلامی ممالک کی ٹیمیں

ورلڈکپ 2014ء میں چار اسلامی ممالک ایران، الجزائر، بوسنیا ہرزیگووینیا اور نائیجیریا کی فٹ بال ٹیمیں شریک ہیں۔ ان میں بوسنیا کی ٹیم پہلی بار ورلڈکپ میں شرکت کر رہی ہے۔

بوسنیا ہرزیگووینیا

کوالیفائنگ مقابلوں میں بوسنیا گروپ جی میں تھا۔ بوسنیا اور یونان کے پوائنٹ برابر تھے، مگر صرف ایک گول زیادہ کرنے کی وجہ سے اول الذکر ورلڈکپ میں پہنچ گیا۔ اس اسلامی ملک کی ٹیم نوجوان کھلاڑیوں پر مشتمل ہے۔ ٹیم کے دو کھلاڑی آسمیر بیگووچ اور ادین ژیکو بالترتیب مشہور یورپی فٹ بال کلبوں اسٹوک سٹی اور مانچسٹر سٹی سے منسلک ہیں۔ فی الوقت فیفا کی درجہ بندی کے مطابق بوسنیائی ٹیم کا رینک 25 ہے۔ گویا یہ ٹیم ورلڈکپ میں اپ سیٹ کر سکتی ہے۔

الجزائر

اس افریقی مسلم ملک کی فٹ بال ٹیم کا شمار براعظم افریقا کی بہترین ٹیموں میں ہوتا ہے۔ ابھی اس کا رینک 25 ہے۔ نومبر 2012ء میں یہ دنیا کی 19ویں فٹ بال ٹیم تھی۔ چار ورلڈکپ کھیل چکی، یہ پانچواں ہے۔ 1990ء میں اسے افریقا کپ آف نیشنز جیتنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

اسد جبلکم، ایڈیسن گورییا اور جمال عبدون الجزائری ٹیم کے نامور کھلاڑی ہیں۔ یہ یورپی ٹیموں میں کھیلتے اور وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ الجزائری ٹیم سے عوام کی امیدیں وابستہ ہیں کہ شاید وہ ورلڈکپ میں کوئی کارہائے نمایاں دکھا سکے۔

ایران

ایرانی فٹ بال ٹیم ایشیا میں نمبرون جبکہ دنیا میں 37ویں مقام پر فائز ہے۔ ایشیائی فٹ بال کا بہترین کھیل پیش کرتی ہے۔ چار بار ورلڈکپ میں حصہ لے چکی۔ تین بار ایشیائی کپ جیتنے میں کامیاب رہی۔

1998ء کے ورلڈکپ میں ایرانی ٹیم نے امریکی ٹیم کو ایک گول سے ہرایا تو میدان میں جشن منایا گیا تھا۔ تب آیت اللہ خامنہ ای نے بیان دیا: ''آج ہمارے ہاتھوں متکبر اور طاقتور حریف کو شکست کی ذلت سے دوچار ہونا پڑا۔'' اشکان دژآگہ موجودہ ٹیم کا بہترین کھلاڑی ہے۔ وہ برطانوی کلب فلہم کی طرف سے کھیلتا ہے۔ ایرانی عوام کو یقین ہے کہ کریم انصاری فرد بھی عمدہ کارکردگی دکھائے گا۔

نائیجیریا

اس افریقی مملکت کی نصف سے زائد آبادی مسلمان ہے۔ نائیجیرین فٹ بال ٹیم کا شمار بھی بہترین افریقی ٹیموں میں ہوتا ہے۔ یہ چار بار ورلڈکپ جیت چکی ہے تاہم اگلے مرحلوں میں نہیں جا سکی۔ تین بار افریقن نیشنز کپ جیت چکی۔ موجودہ ٹیم مسلمان اور عیسائی کھلاڑیوں پر مشتمل ہے۔ فیفا کی درجہ بندی میں اس کا نمبر 45 ہے۔

پاکستانی بچوں نے میدان مار لیا

چند سال قبل کی بات ہے، گلیوں میں آوارہ پھرنے والے لڑکوں کو راہ راست پر لانے والی ایک برطانوی سماجی تنظیم آموس ٹرسٹ (Amos Trust) کو انوکھا خیال آیا۔ وہ یہ کہ آوارہ پھرنے والے لڑکوں کے لیے فٹ بال کا عالمی مقابلہ منعقد کیا جائے۔ اس میں دنیا بھر کے ممالک سے ایسی فٹ بال ٹیمیں شرکت کریں جن کے کھلاڑی گلیوں میں پھرنے والے سابقہ نوجوان ہوں۔ یوں انھیں زندگی گزارنے کا مقصد اور حوصلہ دینا مقصود تھا۔

اسی تجویز کو مخیر حضرات میں مقبولیت ملی اور یوں "دی اسٹریٹ چائلڈ ورلڈ کپ" کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کا پہلا ورلڈ کپ مارچ 2010ء میں جنوبی افریقن شہر ڈربن میں منعقد ہوا۔ 2014ء کے عالمی کپ میں پاکستانی ٹیم بھی شریک ہوئی جو برازیلی شہر ریو دے جنیرو میں کھیلا گیا۔

پاکستانی ٹیم لیاری کی گلیوں میں گھومنے والے سولہ سترہ سالہ آوارہ منش لڑکوں پر مشتمل تھی۔ ان سب کا تعلق غریب گھرانوں سے تھا۔ کراچی کی ایک سماجی تنظیم آزاد فاؤنڈیشن نے انھیں جمع کیا اور انھیں زندگی کا مثبت رخ دے کر اور فٹ بال ٹیم کی صورت متحد کر دیا۔ آزاد فاؤنڈیشن نے پھر برٹش کونسل کے مالی تعاون سے اپنی تیار کردہ

برازیل ایک نظر میں

رقبے و آبادی کے لحاظ سے دنیا کا یہ پانچواں بڑا ملک جنوبی امریکا کے 47 فیصد رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کا رقبہ پچاسی لاکھ پندرہ ہزار مربع کلومیٹر سے زیادہ ہے۔ ملک میں بیس کروڑ افراد بستے ہیں۔ یہ ملک متنوع جنگلی حیات اور رنگارنگ قدرتی ماحولیات رکھتا ہے۔

برازیل کا ماضی و حال

ماضی میں برازیل متفرق گندمی رنگ قبائل کا مسکن تھا۔ 1500ء میں ملک پر پرتگیزیوں نے قبضہ کر لیا۔ دیگر یورپی غاصبوں کے مانند انھوں نے بھی برازیلیوں کا استحصال کیا اور ملکی وسائل لوٹتے رہے۔ آخر 1822ء میں برازیل آزاد ہو گیا۔ ملک 1965ء تا 1985ء فوجی جنتا کے قبضے میں رہا۔ 1985ء سے جمہوری حکومت چلی آ رہی ہے۔

تین سو سالہ یورپی اقتدار کے دوران ملک میں سفید فام باشندوں کی کثرت ہو گئی۔ اسی باعث 47.7 فیصد برازیلی سفید فام نسل سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ 43.1 فیصد گندمی نسل کے ہیں۔ 86 فیصد آبادی عیسائی ہے۔ تھوڑے بہت مسلمان بھی بستے ہیں۔ ساؤ پاؤلو (آبادی ایک کروڑ تیرہ لاکھ)، ریو ڈی جنیرو (63 لاکھ) اور سلواڈور (31 لاکھ) بڑے شہر ہیں۔ 86 فیصد برازیلی شہروں میں بستے ہیں۔ سرکاری زبان پرتگیزی ہے۔

اسٹریٹ چائلڈ ٹیم کو ریو سے جنیرو بھجوا دیا۔

2014ء کے اسٹریٹ چائلڈ ورلڈ کپ میں پاکستان، بھارت، مصر، امریکا سمیت پندرہ ممالک کی ٹیمیں شریک ہوئیں۔ پاکستانی ٹیم کا پہلا میچ تیم اپریل کو بھارتی ٹیم سے ہوا۔ اس میں شاہینوں نے گول مار کر مخالفین کا بھرکس نکال دیا۔ پاکستانی ٹیم نے 13 گول کیے جبکہ بھارتی ایک بھی نہ کر پائے۔

اس کے بعد پاکستانی شاہینوں نے کینیا، ماریشس، امریکا اور فلپائن کی ٹیموں کو ہرایا اور سیمی فائنل میں پہنچ گئی۔ 15 اپریل کو سیمی فائنل میں وہ برونڈی کی ٹیم سے ٹکرائی۔ کانٹے دار میچ ہوا اور کھلاڑیوں نے جیتنے کے لیے جان لڑا دی۔ برونڈی کی ٹیم میں زیادہ تجربے کار لڑکے شامل تھے سو وہ صرف ایک گول سے جیت گئی۔

فائنل مقابلہ تنزانیہ اور برونڈی کے مابین ہوا۔ یہ مقابلہ بھی برونڈی نے جیت لیا۔ یوں وہ اسٹریٹ چائلڈ ورلڈ کپ چیمپئن بن گئی۔ کانسی کے تمغے کی خاطر دنیا کی اکلوتی سپر پاور امریکا اور پاکستان کی ٹیمیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ اب پھر شائقین کو زبردست مقابلہ دیکھنے کو ملا۔ آخر پنلٹی اسٹروک پر پاکستانی ٹیم مقابلہ جیت گئی۔

ورلڈ کپ کے دس اہم کھلاڑی

فٹ بال کے ہر عالمی کپ میں بعض کھلاڑی اپنے خوبصورت کھیل، جسمانی چستی، پھرتی اور پرکشش شخصیت کے باعث دوسروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ چند نئے کھلاڑی دوران ورلڈ کپ سامنے آتے اور اپنی کارکردگی سے دوسروں کو چونکا دیتے ہیں۔ مگر ایسے کھلاڑیوں کی نشان دہی کرنا خاصا کٹھن مرحلہ ہے۔ ذیل میں ان کھلاڑیوں کا تعارف درج ذیل ہے جو اپنے کھیل سے شائقین کا دل موہ سکتے ہیں۔

ماضی میں برازیل طویل عرصہ ترقی پذیر ملک رہا۔ سیاسی ہنگاموں کے باعث معیشت ترقی نہیں کر سکی۔ رفتہ رفتہ حالات میں ٹھہراؤ آیا اور تعلیم پھیلی تو برازیلی معیشت بھی پنپنے لگی۔ آج برازیل دنیا کی ساتویں بڑی معیشت بن چکا ہے اور اس کا شمار چار بڑی ابھرتی معیشتوں میں ہوتا ہے۔ (دیگر تین روس، جنوبی افریقا اور بھارت ہیں۔) تاہم بین الاقوامی معاشی بحران کے باعث اس کی معاشی ترقی میں بھی ٹھہراؤ آ گیا ہے۔

ورلڈ کپ کے دس اہم کھلاڑی

(1) کرسٹیانو رونالڈو

پرتگال کا یہ 28 سالہ کھلاڑی دنیا کا بہترین فٹ بالر سمجھا جاتا ہے۔ ہسپانوی فٹ بال کلب ریئل میڈرڈ کی طرف سے کھیلتا ہے۔ اس چست اور پھرتیلے کھلاڑی کا کھیل عروج پر رہا تو پرتگال اگلے مراحل میں پہنچ سکتا ہے۔ کرسٹیانو اپنے کھیل سے سبھی کا دل شاد کام کرتا ہے۔

یوں اسٹریٹ چائلڈ ورلڈ کپ میں تیسری پوزیشن لینے سے ثابت ہو گیا کہ پاکستان میں بہترین فٹ بال کھیلنے والے لڑکے اور نوجوان موجود ہیں' لیکن ان جوہر قابل کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس کوتاہی کی ذمے دار پاکستان فٹ بال فیڈریشن ہی ہے۔

پاکستان فٹ بال فیڈریشن 1947ء میں قائم ہوئی تھی۔ لیکن پچھلے سڑسٹھ برس کے دوران وہ کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دے پائی۔ اسے جو سرکاری فنڈز ملتے ہیں، وہ اندرون خانہ ہی ہضم کر لیے جاتے ہیں۔ ملک میں فٹ بال کی سرگرمیوں پر بہت کم رقم خرچ ہوتی ہے۔ قومی فٹ بال ٹیم میں بھی سفارشیوں کا تقرر ہوتا ہے سو وہ خاص کارکردگی نہیں دکھا پاتی۔ آج اس کا شمار دنیا کی کمزور ترین فٹ بال ٹیموں میں ہوتا ہے۔ فیفا کی درجہ بندی میں اس کا "168" واں نمبر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر پاکستان فٹ بال فیڈریشن کو مخلص اور محب وطن عہدے دار میسر آ جائیں تو وہ کم از کم ایشیائی سطح پر پاکستانی ٹیم کو بہتر حیثیت دلوا سکتے ہیں۔ اسٹریٹ چائلڈ ورلڈ کپ میں نوجوان پاکستانی فٹ بالروں کی بے مثال کارکردگی اس امر کا ثبوت ہے کہ یہاں ٹیلنٹ نہیں جذبے و خلوص کی کمی ہے۔

(2) لیونل میسی

ارجنٹائن کا یہ 26 سالہ کھلاڑی طویل عرصے سے یورپ کے فٹ بال کلبوں میں بہترین کارکردگی دکھا رہا ہے۔ افسوس کہ وہ اپنے ملک کی قومی ٹیم کے لیے خاص کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکا۔ لیکن حالیہ ورلڈ کپ میں بھی زبردست فارم میں ہے۔ سو ارجنٹائن عوام کو امید ہے کہ وہ عالمی کپ ان کی جھولی میں ڈال سکتا ہے۔
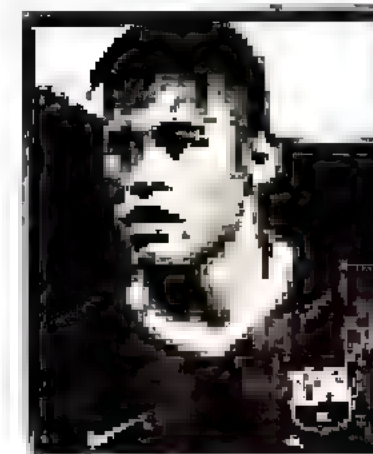
(3) نیمار

برازیل کا نیا ہیرو۔ یہ 21 سالہ نوجوان وہ تمام خوبیاں رکھتا ہے جو ایک کھلاڑی کو بہترین فٹ بالر بناتی ہیں مثلاً تیزی و طراری' ذہانت اور ڈربلنگ اسٹائل۔ (گیند کو پاؤں سے ہلکے ہلکے ٹھوکے ہوئے لے جانا) کروڑوں برازیلیوں کی اس سے بہت توقعات وابستہ ہیں۔ ان کے سامنے نیمار کی صلاحیتیں مزید چمک سکتی ہیں۔

(4) وائن رونی

برطانیہ کے 28 سالہ کھلاڑی کا شمار دنیا کے بہترین فٹ بالروں میں ہوتا ہے۔ افسوس کہ یہ اب تک کے ورلڈ کپوں میں قومی ٹیم کی خاطر عمدہ کارکردگی نہیں دکھا سکا۔ لیکن جب بھی رونی کے اندر پوشیدہ شعلہ بھڑکا تو وہ نہ صرف ایک مقابلے بلکہ پوری

شمپئن شپ کا پانسا پلٹ سکتا ہے۔

(5) جیمز روڈ ریگز

کولمبیا کا 22 سالہ ابھرتا فٹ بالر۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ کولمبین ٹیم بھی ورلڈ کپ جیت سکتی ہے اور اس ٹیم میں جیمز ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ محنتی کھلاڑی ہے اور جیت کے لیے جان لڑانے کو تیار رہتا ہے۔

(6) لوئس سواریز
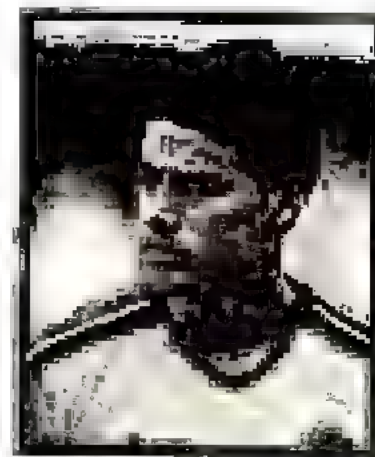
یوراگوئے کا مشہور 27 سالہ فٹ بالر۔ پچھلے ورلڈ کپ میں اس نے اپنے شاندار کھیل سے سبھی کو متاثر کیا۔ اب یوراگوئے کے عوام کو امید ہے کہ وہ قومی ٹیم کی عظمت رفتہ واپس لا سکتا ہے۔ لوئس کھیلتے ہوئے فطری انداز اپناتا ہے۔
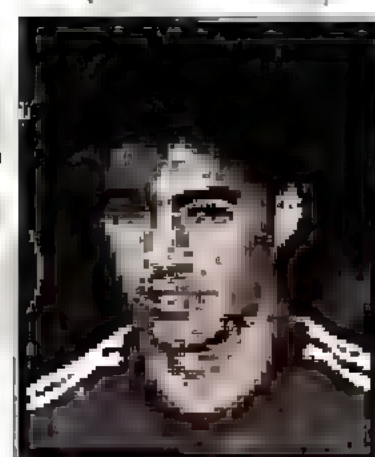
(7) تھامس میولر

چوبیس سالہ ممتاز جرمن کھلاڑی۔ موصوف اپنے احسن اور ذہانت کے باعث مقبول ہے۔ بڑی نفاست سے گول کرتا ہے۔ یورپی فٹ بال کلبوں میں بہترین کھیل دکھاتا ہے۔ افسوس کہ قومی ٹیم کو ورلڈ کپ میں کامیابی نہیں دلوا سکا۔ بہرحال فٹ بال کے دیوانے جرمنوں کو اس سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

(8) آندریس انیسٹا

اسپین کا مشہور 29 سالہ کھلاڑی۔ یہ تواتر سے گول کرنے کے باعث شہرت رکھتا ہے۔ بہترین یورپی کھلاڑی ہونے کے کئی ایوارڈ جیت چکا ہے۔ اسے فٹ بال کی تاریخ کے بہترین مڈفیلڈروں میں سے سمجھا جاتا ہے۔ اگر اسپین اپنے ٹائٹل کا دفاع کرنے میں کامیاب رہا تو یقیناً اس کامیابی میں انیسٹا کا اہم کردار ہوگا۔

(9) ارجن روبن

مشہور ولندیزی 30 سالہ مڈفیلڈر۔ پچھلے ورلڈ کپ کے فائنل میں ارجن نے ہسپانوی علاقے میں تابڑ توڑ حملے کیے تھے مگر ہالینڈ کی ٹیم کامیابی نہ پا سکی۔ حالیہ ورلڈ کپ میں بھی روبن جارحانہ اور دفاعی کھیل دکھانے کو تیار ہے۔

(10) ولفرید زاہا

برطانیہ کا 21 سالہ ابھرتا ہوا فٹ بالر۔ آئیوری کوسٹ سے ہجرت کر کے برطانیہ آیا اور اب وہاں کی قومی ٹیم کا اہم حصہ ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ وہ ورلڈ کپ میں برطانوی ٹیم کا خفیہ ہتھیار ثابت ہو سکتا ہے۔ فارورڈ پوزیشن میں کھیلتا ہے۔ ◆◆◆

اور وھیل کشتی سے ٹکراگئی

ایک خوفناک بحری حادثہ
جس کے نتیجے میں کشتی سمندر میں ڈوب گئی
عظیم الجثہ وھیل موت کا شکار ہوگئی
لیکن خوش قسمت کشتی ران میکس کو بچا لیا گیا

عبداللہ خان

بارہ سال قبل میکس ینگ نے دنیا کے گرد چکر لگانے کا اپنا جو طلسماتی سفر شروع کیا تھا اس کا اختتامی مرحلہ انجام کو پہنچنے والا تھا۔ میکس نے میکسیکو کے ساحلی شہر کابو سان لوکاس سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس کی منزل 850 میل دور واقع امریکی ساحلی شہر سان ڈیاگو تھی۔ وہاں سے پھر وہ اپنے آبائی شہر، سان فرانسسکو کی سمت چل پڑتا۔ یہ آخری مرحلہ 500 میل کے سمندری سفر پر محیط تھا۔

یہ جون 2012ء کی رات تھی۔ موسم خوشگوار تھا، مگر چاند نہ نکلنے کے باعث چہار سو تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

اس کی 50 فٹ لمبی کشتی سبک رفتاری سے شمال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہوا تیز رفتار تھی لہذا خودکار پائلٹ کشتی کا پتوار آرام سے چلائے جا رہا تھا۔

قطرت اپنے جوبن پر تھی۔ دور دور تک پھیلا سمندر تاریکی میں بھی شاندار معلوم ہوتا تھا۔ 67 سالہ میکس کو خیال آیا کہ اس کی بیگم بھی ساتھ ہوتی تو لطف آجاتا۔ مگر ایک ضروری کام کے باعث وہ اس سفر میں شوہر کے ساتھ نہ آسکی تھی۔

میکس ینگ ریٹائرڈ اسکول ٹیچر تھا۔ فارغ وقت میں اس نے کشتی رانی کو بطور مشغلہ اپنا لیا۔ اب وہ پچھلے برسوں سے بیسیوں چھوٹے بڑے سمندری اسفار کے ذریعے تقریباً پوری دنیا گھوم چکا تھا۔

اچانک ایک جمائی نے اُسے آن لیا۔ میکس جب سفر کرتا، تو عموماً دن بھر اپنے کیبن میں پڑا سوتا رہتا۔ مدعا یہ ہوتا کہ یوں وہ رات کو سفر کے چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے تیار ہو جائے۔

لیکن آج اُسے سارا دن جاگنا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ سمندر میں جا بجا گرے (Gray) وہیل مچھلیاں تیرتی

نظر آ رہی تھیں۔ دراصل گرمیاں آنے پر وہ ہجرت کرکے الاسکا جا رہی تھیں تاکہ وہاں کا سرد موسم پا سکیں۔ سو اُسے ہر دم چوکنا رہنا پڑا۔ کوئی بھی وہیل کشتی سے ٹکرا کر بڑا حادثہ جنم دے سکتی تھی۔

میکس دن بھر وہیلوں کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اتنی زیادہ اکٹھی وہیلیں دیکھی تھیں۔ وہ اپنے پر (Flipper) ہوا میں بلند کیے تیرتے ہوئے عظیم الجثہ حیوان نظر آئیں۔ اب کافی دیر سے کوئی وہیل نظر نہیں آئی تھی۔ میکس نے سکون کا سانس لیا اور خودکار پائلٹ کے آلات کی سمت دیکھا، کرونومیٹر سوا دس بجے کا وقت دکھا رہا تھا۔

اچانک کشتی کے پیندے سے زوردار آواز آئی اور وہ لرز کر رہ گئی۔ میکس خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد تقریباً کشتی جتنی لمبی ایک گرے وہیل ہوا میں پانی کے فوارے چھوڑتی بلند کرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اسے دیکھ کر میکس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

وہیل تھوڑی دیر ہوا میں معلق رہی۔ کشتی میں نصب بلبوں کی روشنی میں اس کا جسم لشکارے مار رہا تھا۔ لیکن جب وہ گری، تو 40 ٹن وزنی جانور کا بھاری بھرکم سر اور بالائی جسم کشتی کے اگلے عرشے سے جا ٹکرایا۔

یہ ٹکراؤ اتنا شدید تھا کہ کشتی کی کمان (Bow) آسمان کی سمت اٹھ گئی۔ میکس اچھل کر کیبن میں پڑے تھیلوں پر جا پڑا۔ عرشے پر گری وہیل تھوڑی اچھلی اور پھر آن واحد میں دوبارہ سمندر میں اتر گئی۔

یہ سارا عمل بڑی تیزی سے رونما ہوا اور کشتی میں زلزلہ سا مچ گیا۔ وہیل نے وہ ٹاور سمندر میں گرا دیا تھا جس میں ہوا سے بجلی پیدا کرنے والا جنریٹر اور ریڈیو کا انٹینا نصب تھا۔ عرشے کی ریلنگ ٹوٹ گئی...... لیکن کشتی تیر رہی تھی۔ میکس جان گیا کہ کشتی کے مضبوط فولادی ڈھانچے نے وہیل کا وزن سہار لیا۔

میکس اب فوراً صورت حال معمول پر لانا چاہتا تھا۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ کشتی کا رخ جنوب مغرب کی طرف ہو گیا تھا۔ گویا اب وہ آسٹریلیا کی جانب سفر کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہیل سے ٹکراؤ نے خودکار پائلٹ نظام میں کوئی خرابی پیدا کر دی تھی۔ میکس نے اُسے درست کرنے کی بہت کوشش کی مگر کشتی کا رخ امریکی ساحل کی جانب نہیں ہو سکا۔

اس نے سوچا کہ شاید اسٹیئرنگ کا کوئی مسئلہ ہے۔ سو میکس تاروں کی پڑتال کرنے کشتی کے نچلے حصے میں پہنچا۔ لیکن سبھی تاریں بظاہر ٹھیک تھیں۔ جب وہ دنبالے (Stem) کے کیبن میں پہنچا، تو اُسے محسوس ہوا کہ فرش گیلا ہے۔ پھر اسے نیچے سے پانی کے شرشر بہنے کی آواز آئی۔

میکس نے ایک تختہ اٹھا کر نیچے دیکھا، وہ حیران رہ گیا کہ بلج میں تین فٹ پانی کھڑا تھا۔ (پیندے اور کشتی کے فرش کا درمیانی حصہ بلج کہلاتا ہے۔) اس حصے میں دوران سفر پانی بھر جاتا تھا۔ مگر وہاں وہ پمپ نصب تھے جو مسلسل چلتے ہوئے پانی باہر نکالتے رہتے۔ یوں پانی کی سطح چند انچ اوپر ہی رہتی۔

اب میکس کے سامنے نئی مصیبت آ گئی۔ وہ یہ پڑتال کرنے لگا کہ بلج میں کہاں سے پانی داخل ہو رہا ہے۔ اس نے غسل خانے، کچن اور کمرے میں جانے والے پانی کے تمام پائپ چیک کیے، کسی میں خرابی نہ پائی۔ وہ دوبارہ بلج پہنچا، پانی کی سطح بدستور بلند ہو رہی تھی۔ وہ پھر بالائی عرشے پر پہنچا اور ہاتھ سے کشتی کا پہیہ چلانے کی سعی کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔

حالات دیکھ کر میکس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے فوراً دونوں ایمرجنسی راہنما ٹرانسمیٹر

(Beacons) چالو کر دیے۔ مزید احتیاطی قدم اٹھاتے ہوئے اپنی جیب میں پڑا راہنما ٹرانسمیٹر بھی چلا دیا۔ اس ٹرانسمیٹر کی رینج زیادہ نہ تھی، مگر وہ ڈھونڈنے والوں کو میکس کی درست جگہ سے آگاہ کر سکتا تھا۔

ان راہنما ٹرانسمیٹروں کی فریکوئنسی امریکی ساحلوں پر نصب کوسٹ گارڈ کے ریڈار ہی پکڑ سکتے تھے اور تب میکس کی کشتی سے نزدیک ترین ریڈار 450 میل دور سان ڈیاگو میں نصب تھا۔ میکس کو شک تھا کہ راہنما ٹرانسمیٹر اتنی دور مدد کا پیغام نہیں پہنچا سکیں گے۔ پھر یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ مدد آنے سے قبل کشتی ڈوب جائے گی۔

آخری چارہ کار کے طور پر میکس نے وی ایچ ایف ریڈیو کا مائیک سنبھال لیا۔ یہ ریڈیو چند میل تک پیغام نشر کر سکتا تھا۔ وہ چلایا "مے ڈے، مے ڈے!" کئی منٹ گزر گئے، کوئی جواب نہ آیا۔

میکس تھک ہار کر بیٹھ گیا اور گہرا سانس لیا۔ جلد ہی گزری زندگی کی تلخ و شیریں یادوں نے اس کے ذہن کا احاطہ کر لیا۔ اس نے خدا سے دعا مانگی "اے خدا! میں نوجوان آدمی نہیں۔ لیکن صرف دو ہفتے بعد میری شادی کی 23 ویں سالگرہ آنے والی ہے۔ مجھے تب تک زندہ رکھو۔ میری پوتی کی تیسری سالگرہ بھی اسی دن ہے...... جو کینسر کی مریضہ ہے۔ اے خدا! مجھے یہ حفاظت گھر پہنچا دے۔"

میکس ینگ کا باپ ایک ہوا باز اور ماں ویٹرس تھی۔ جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی، تو اس کا باپ ٹرالر ڈرائیور بن گیا۔ وہ اکثر اسفار میں میکس کو ساتھ لے جاتا۔ یوں وہ بچپن ہی سے سیر و سیاحت کا شوقین ہو گیا۔

جب میکس عملی زندگی میں داخل ہوا، تو تعلیم پا کر اسکولوں میں سائنس پڑھانے لگا۔ جب چھٹیاں ہوتیں، تو وہ کشتی رانی سے لطف اٹھاتا۔ یوں کشتی چلا چلا کر وہ تجربے کار ملاح بن چکا تھا۔

1987ء میں اس کے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی۔ سو اس نے ایک لمبی اور بڑی کشتی خرید لی۔ اب وہ اس پر پوری دنیا کا سمندری سفر کر سکتا تھا۔ یہ موقع 2000ء میں میکس کو ملا جب وہ ریٹائر ہو گیا۔ اب وہ آرام و اطمینان سے عالمی سیاحت کر سکتا تھا۔

میکس پھر بحرالکاہل کے جزائر میں گھوما پھرا۔ بیگم کے ساتھ دو برس آسٹریلیا میں رہا۔ پھر مشرق وسطی اور افریقا کے ممالک میں سیاحت کی۔ جب رقم کم ہوتی، تو وہ جز وقتی ملازمتیں کر لیتا۔ یوں پچھلے بارہ برس اس نے بڑے بھرپور انداز میں گزارے۔

ان برسوں کے دوران بھی خوشیوں بھرے لمحے آئے، کبھی پریشانیوں نے بھی حملہ کیا۔ حسین و جمیل فطری مناظر اُسے خوشی سے باغ باغ کر دیتے۔ پھر نئی دوستیاں اُسے نئے نظریات و خیالات سے روشناس کراتیں۔

ایک بار اس کی کشتی زبردست طوفان میں گھر گئی۔ دوسری بار کشتی کا انجن فیل ہو گیا۔ انجن کی مرمت کرتے کرتے دو دن لگ گئے تھے۔ افریقی سمندروں میں قزاق بھی اس پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن وہ پہلے کبھی اسی خطرناک اور جان لیوا صورت حال سے دوچار نہیں ہوا تھا...... اسٹیئرنگ ناکارہ ہو چکا تھا، کشتی میں پانی بھر رہا تھا اور مدد کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔

رات کے ڈیڑھ بجے میکس کھلے سمندر میں پروردگار کے حضور دعائیں مانگنے میں مصروف تھا کہ اُسے ایک ہوائی جہاز کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں بعد اس کا ریڈیو بول اٹھا "میں امریکی کوسٹ گارڈز کا لفٹنٹ ایمی کینفرل ہوں۔ کیا آپ میری آواز سن رہے ہیں؟"

میکس کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ مسرت سے بولا "خوش آمدید کوسٹ گارڈز! اور آپ لوگوں کا

بہت بہت شکریہ۔ میں تو سمجھا تھا کہ میرا آخری وقت آن پہنچا۔

اُسے بعد میں پتا چلا کہ ایک ایمرجنسی راہنما ٹرانسمیٹر کا سگنل سان فرانسسکو کے نزدیک نصب ریڈار نے پکڑ لیا۔ وہ سگنل کشتی کی تقریباً درست جگہ اور میکس کی بیوی کے فون نمبر پر مشتمل تھا۔ چناں چہ کوسٹ گارڈ افسر نے میکس کی بیگم، ڈیبی سے رابطہ کیا۔ اس نے بتایا کہ شوہر سمندری سفر پہ نکلا ہوا ہے۔ چناں چہ میکس کی تلاش میں ہوائی جہاز روانہ کر دیا گیا۔ جنگ کے جیبی ٹرانسمیٹر سے نشر ہونے والے سگنل کی مدد سے وہ کشتی تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔

میکس نے لفٹنٹ کیفرل کو ساری داستان سنائی اور کہا کہ شاید وہیل نے دشمن سمجھ کر اس کی کشتی کو ٹکر مار دی۔ تب کیفرل نے اُسے خوش خبری سنائی: ”ہم نے ایک بحری جہاز ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ تمھیں اٹھا لے گا۔“

یہ سن کر میکس کی جان میں جان آئی کیونکہ کوسٹ گارڈ کے ہوائی جہاز میں ایسا سامان موجود نہ تھا کہ اُسے اوپر اٹھا لیا جاتا۔ لیکن کیفرل کی اگلی بات سن کر میکس پھر پریشان ہو گیا۔ وہ بتا رہا تھا: ”بحری جہاز 45 میل دور ہے۔ امید ہے وہ ساڑھے پانچ گھنٹوں تک تمھارے پاس پہنچ جائے گا۔“

میکس چلایا ”ارے بھئی، میرے پاس اتنا وقت نہیں، کشتی میں تیزی سے پانی بھر رہا ہے۔“

تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر لفٹنٹ کیفرل بولا ”آپ نے کشتی کے سارے پمپ چیک کر لیے ہیں؟“

تب میکس کو خیال آیا کہ اس نے کشتی پمپوں کی پڑتال نہیں کی تھی۔ تب تک پانی کے وزن سے کشتی سطح آب پہ ڈولنے لگی تھی۔ بچھولے کھاتی کشتی میں بیٹھے میکس کو محسوس ہونے لگا کہ وہ عنقریب ڈوب سکتی ہے۔ یوں موت سر پر آن کھڑی ہوئی۔ اس نے آخری چارہ کار کے طور پر پمپوں کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

جب میکس پمپوں کے قریب گیا، تو دیکھا کہ وہ سمندری کائی سے لت پت ہیں۔ کائی نے انھیں جام کر دیا تھا۔ صفائی کے بعد میکس ایک پمپ چلانے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسے ہی پمپ چلا، زندگی کی امید بھی میکس میں لشکارے مارنے لگی۔ اُسے یقین تھا کہ اب کم از کم مزید پانی کشتی میں نہیں بھرے گا۔

لیکن کچھ پتا نہ تھا کہ پمپ کب دغا دے جائے۔ سو وہ کشتی میں بکھری اپنی اشیا سمیٹنے لگا..... دیواروں پہ نصب پیاروں کی تصویریں، بچوں کی بنائی ڈرائنگز، دوستوں کے تحفے تحائف۔ ان چیزوں سے دو تھیلے بھر گئے۔ وہ انھیں عرشے پر لے آیا۔

وہ ابھی کیبن میں داخل ہوا ہی تھا کہ ریڈیو پھر کھڑکھڑایا اور کیفرل کی آواز آئی: ”آپ لائف بوٹ (زندگی بچاؤ) سمندر میں اُتار دیں۔ یوں بہ وقت ضرورت فوراً اس میں سوار ہو سکیں گے۔“

میکس کو یہ مشورہ پسند آیا۔ وہ عرشے کے پچھلے حصے جا پہنچا جہاں زندگی بچاؤ بوٹ بندھی تھی۔ اس میں ہوا بھر کے اُسے پھلایا جاتا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جابجا وہیل کا گوشت ٹکڑوں کی صورت پڑا تھا۔

گوشت کے بعض ٹکڑے ڈبل روٹی جتنے تھے۔ میکس نے ایک ٹکڑا اٹھایا، تو وہ اُسے ربڑ کا محسوس ہوا۔ وہ بڑی مصیبت میں گرفتار تھا، مگر بیچاری وہیل کا سوچ کر اس کا دل ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا۔ وہ سوچنے لگا، زخمی ہو کر وہیل نجانے کس حال میں ہوگی۔ کاش وہ میری کشتی سے نہ ٹکرائی ہوتی، تو ہم دونوں اس عذاب سے محفوظ رہتے۔

میکس وہیل کی سلامتی کی دعائیں مانگتا بوٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میکس نے بوٹ کا وہ لیور دبایا جس کے ذریعے اس میں ہوا بھرتی تھی، لیکن کچھ نہ ہوا۔ میکس نے کئی بار لیور ہلایا جلایا مگر زندگی بچاؤ کشتی جوں کی توں رہی۔ شاید وہیل سے ٹکراؤ نے اُسے ناکارہ بنا دیا تھا۔ یہ ایک اور دھچکا تھا جو میکس کو لگا۔

کشتی میں ایک چھوٹی ڈنگی بھی موجود تھی۔ کیفرل نے تجویز دی کہ اُسے تیار کر لو۔ اس میں پمپ سے ہوا بھری جاتی تھی۔ بدقسمتی سے میکس کو تلاش بسیار کے باوجود پمپ نہیں مل سکا۔ یہ اُسے پہنچنے والا ایک اور صدمہ تھا۔

اب پھر موت کے سائے اس پر لہرانے لگے۔ اس نے حفاظتی لباس پہن رکھا تھا۔ خدانخواستہ کشتی ڈوب جاتی، تو لباس اُسے سطح آب پر رکھتا۔ لیکن وہ اُسے سمندری شارکوں یا شدید سردی سے محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ گویا امدادی بحری جہاز پہنچنے سے قبل کشتی ڈوبتی، تو یہ خطرہ موجود تھا کہ وہ موت کے منہ میں پہنچ جائے۔

فرشتہ اجل سے آمنا سامنا ہونے کے امکان نے میکس کو دوبارہ یادوں کے سمندر میں دھکیل دیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے والد کے ساتھ پہلی بار مچھلیاں پکڑنے جا رہا ہے۔ پھر خود کو سائیکل اور کشتی چلانا سیکھتے دیکھا۔ پھر اُسے اپنی پہلی کار اور پہلی محبت یاد آئی۔ اس نے اپنے بچوں کو پہلے قدم اُٹھاتے دیکھا۔

حسین یادوں میں کھو کر میکس کو گزرتے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ اُسے ہوش تب آیا جب مشرق سے سورج نے سر ابھارا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے مشکل وقت گزار دیا تھا۔ اُسے دور ایک سیاہ نقطہ دکھائی دیا جو رفتہ رفتہ بڑا ہو رہا تھا۔۔۔۔ یہ بھارتی جہاز تھا۔

آدھ گھنٹے بعد بحری جہاز کشتی کے قریب پہنچ گیا۔ اس سے کشتی پر رسی لٹکائی گئی جو اب بری طرح ڈول رہی تھی۔ بحری جہاز کے عرشے پر پہنچتے ہی میکس گر پڑا۔ ذہنی و جسمانی مشقت نے اُسے تھکا دیا تھا۔

میکس کو اُمید تھی کہ کسی طرح اس کی چہیتی کشتی بچ جائے گی۔ مگر وہ اس کے بحری جہاز میں سوار ہونے کے تین منٹ بعد ہی ڈوب گئی۔۔۔۔ شاید وہ اپنے مالک کی زندگی بچنے کا انتظار کر رہی تھی۔ بعد ازاں جہاز کے ملاحوں سے میکس کو علم ہوا، وہیل کی ٹکر سے کشتی کے دنبالے (Stren)، پنکھے (پروپیلر) اور پتوار (Rudder) کو بہت نقصان پہنچا تھا جس کے باعث کشتی ناکارہ ہو گئی۔

بحری جہاز آٹھ دن بعد پاناما پہنچا۔ اس دوران میکس بھارتی عملے کے ساتھ گھل مل گیا۔ پھر ہندوستانی کھانے کھا کھا کر وہ انھیں پسند بھی کرنے لگا۔ پاناما سے وہ بذریعہ ہوائی جہاز اپنی شادی اور پوتی کی سالگرہ سے قبل گھر پہنچ گیا۔

لیکن اس کی کشتی سے ٹکرانے والی وہیل خوش قسمت نہ تھی۔ دو ہفتے بعد ایک 65 فٹ وہیل باجہ کے ساحل سے آن لگی۔ اس کے سر پر موٹے موٹے گومڑ پڑے ہوئے تھے، جیسے وہیل کسی بھاری بھرکم شے سے ٹکرائی ہے۔ میکس کو یقین ہے کہ وہی اس کی کشتی سے ٹکر کھانے والی وہیل تھی جو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے آخر جاں بحق ہو گئی۔ یوں ایک خوب صورت حیوان اپنی غلطی کے باعث جان ہار گیا۔

میکس کو اپنی پسندیدہ کشتی کھونے کا بھی غم ہے۔ اُسے اُمید ہے کہ رقم اکٹھی ہونے کے بعد وہ نئی کشتی خرید لے گا۔ مالی نقصان کے باوجود وہ اپنی یادوں کا بھی شکر گزار ہے جنھوں نے اس رات میکس کی ہمت بندھائی رکھی۔ وہ کہتا ہے: ''آپ کی یادیں خوشگوار ہوں یا تلخ، انھیں سنبھال کر رکھیے۔ وہ کبھی نہ کبھی تاریکی میں آپ کے لیے روشنی بن جائیں گی۔

آم

پھلوں کا بادشاہ

تندرستی کی لازوال دولت عطا کرنے والا موسم گرما کا میٹھا رسیلا انمول تحفہ

حکیم انصاری

ایک بار آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر باغ کی سیر فرما رہے تھے۔ مرزا غالب بھی ہمراہ تھے جو بڑی تجسس نظروں سے آم کے درختوں کو دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا صاحب! آپ درختوں کو گہری نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" مرزا گویا ہوئے "میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ جو شے جس کی ہو اس کے دانے دانے پر اسی کے نام کی مہر لگی ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ کسی پر میرے نام کی مہر بھی لگی ہے یا نہیں؟"

یہ سن کر بہادر شاہ ظفر مسکرائے اور مرزا صاحب کا مدعا سمجھ گئے۔ انھوں نے آموں کی ایک پیٹی مرزا صاحب کو بطور تحفہ بھجوائی۔

اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب کو آم سے کتنی رغبت تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بیسویں صدی میں اردو کے عظیم ترین شاعر علامہ اقبال بھی آموں کے شوقین تھے۔ نوجوانی میں آپ کا دستور تھا کہ آموں کی دعوتوں میں شریک ہوتے۔ ان دعوتوں میں اہل لاہور سیروں آم کھا جاتے تھے۔ مرزا غالب کے بقول آم میں دو خصوصیات ہونی چاہئیں: "اول وہ میٹھے ہوں دوم بہ کثرت ہوں۔"

آم برصغیر پاک و ہند کا قومی پھل ہے۔ اسی باعث اسے پاکستان و بھارت میں پھلوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ خطہ ہی آم کا مولد و وطن ہے۔ وہ پھر جنوبی ایشیا سے نکل کر برازیل اور افریقی ممالک

تک پھیل گیا۔

مرد و زن آم کے میٹھے ذائقے اور اس کی خوشبو پر جان چھڑکتے ہیں۔ طبی لحاظ سے بھی یہ بڑا مفید پھل ہے۔ مالٹے کے مانند یہ بھی وٹامن سی کا خزانہ ہے۔ صرف ایک پیالی آم کھانے سے وٹامن سی کی سو فیصد ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ وٹامن سی ہمارا مامون نظام مضبوط کرتا اور کئی امراض سے بچاتا ہے۔ ایک پیالی آم میں پچاس ملی گرام وٹامن سی ملتا ہے۔

آم میں ایک اور اہم وٹامن اے بھی خوب ملتا ہے۔ ایک پیالی آم ہماری روزانہ کی "35 فیصد" ضرورت پوری کرتا ہے۔ وٹامن اے بینائی مضبوط کرتا ہے۔ نیز وہ جلد کے لیے بھی مفید ہے۔

آم میں وٹامن بی 12 کے علاوہ بی اور وٹامن ای کے تھیامین، ربوفلاوین، نائسین اور فولیٹ بھی ملتے ہیں۔ یہ بھی انسانی تندرستی کے لیے ضروری ہیں۔

معدنیات میں سب سے زیادہ تانبا آم میں ملتا ہے۔ اس کے بعد پوٹاشیم، میگنیشیم، کیلشیم، مینگنیز اور فولاد کا نمبر ہے۔ یہ بھی معدنیات اپنے اپنے طور پر انسان کو تندرست و توانا رکھتے ہیں۔

طب مشرق کے مطابق آم کھانے سے خون بڑھتا ہے۔ چنانچہ خون کی کمی کے مریض اس سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آم کی تاثیر گرم ہے۔ اس لیے آم کھانے کے بعد اکثر لوگ دودھ کی لسی پیتے ہیں۔

اطبا کی رو سے آم دل، دماغ، پھیپھڑوں، معدے، آنتوں، گردے، مثانے، دانت اور آنکھوں کو طاقت دیتا ہے۔ قبض کشا اور پیشاب آور ہے۔ حاملہ خواتین کے لیے طاقت بخش غذا ہے۔ یہ واحد پھل ہے جو اپنی افزائش کے ہر مرحلے پر قابل استعمال ہے۔ ورنہ بیشتر پھل

انڈیا کے آم پر پابندی

یکم مئی سے یورپ میں انڈیا کے آم کی درآمد پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے انڈیا کے زرمبادلہ میں کمی واقع ہونے کا اندیشہ ہے۔ گذشتہ برس انڈیا کے آموں میں فروٹ فلائی کی موجودگی کا پتا چلا تھا جس کی بنا پر یورپ میں انڈیا کے آموں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

آم کا پھل جون جولائی کے مہینا میں جب پورے سائز کا ہو چکتا ہے تا آم توڑنے کے قابل ابھی نہیں ہوتا تو فروٹ فلائی کی مکھیاں اس پر حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ یہ مکھیاں آم کے پھل میں اپنے ڈنک کے ذریعے لاتعداد خوردبینی انڈے اتار دیتی ہیں جس کی وجہ سے آم کی فصل کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ پاکستانی آم جو کہ دنیا بھر میں پسند کیا جاتا ہے، کے متعلق آج کل خبریں آ رہی ہیں کہ متحدہ عرب امارات اور یورپی منڈی میں اگلے سال پاکستانی آم کی برآمد پر پابندی لگنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ پاکستانی آم میں فروٹ فلائی کی موجودگی کی شکایات ہیں۔ اگر اس پر توجہ دے کر فوری طور پر اسے کنٹرول نہ کیا گیا تو آئندہ کے لیے پاکستانی آم کے برآمد کنندگان متذکرہ بالا منڈیوں سے محروم ہو جائیں گے۔

صرف پکنے ہی پر کھائے جاتے ہیں۔

طب مشرق میں آم اور متعلقہ اشیا سے درج ذیل بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے:

☆ آم کے اچار کا تیل گنج پر لگائیے۔ یہ بال اگانے کا قدیم ٹوٹکا ہے۔ اچار جتنا پرانا ہوگا اس کا تیل

انتہائی مفید ہے۔

☆ آم کی گٹھلی مسواک کی طرح استعمال کیجیے۔ یوں منہ کی بدبو جاتی رہتی ہے۔ نیز دانت مضبوط اور چمکدار ہوتے ہیں۔

☆ آم کی جڑ کا چھلکا اور برگ شیشم ایک ایک تولہ لیجیے۔ انھیں ایک سیر پانی میں جوش دیجیے۔ جب تیسرا حصہ پانی رہ جائے تو اس میں تھوڑی سی چینی ملائیے اور نوش جان کیجیے۔ یہ نسخہ پیشاب کی بندش دور کرتا ہے۔

☆ آم کے درخت سے جو پتے خود بخود جھڑ جائیں انھیں سائے میں رکھ کر خشک کر لیں۔ پھر ان کا سفوف بنا لیں۔ صبح شام یہ سفوف ڈیڑھ ماشہ پانی کے ساتھ استعمال کریں۔ ذیابیطس کی بیماری میں یہ نسخہ مفید ہے۔

☆ آم کے پھول سائے میں خشک کر کے سفوف بنالیں۔ جب بھی کسی کو نکسیر آئے تو یہ سفوف نسوار کی طرح ناک میں ڈالیے۔ نکسیر رک جائے گی۔

آم کی مشہور اقسام

آم ہماری تہذیب' ثقافت' تمدن' ادب اور روایات میں رچا بسا ہے۔ اس پھل کے بطن سے محاوروں اور امثال نے جنم لیا۔ مثال کے طور پر یہ محاورہ پڑھیے: آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ یعنی دوہرا فائدہ ہونا۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے عام آدمی کی زندگی میں آم بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

آم کی کئی اقسام ہیں جن کی تعداد 450 تک پہنچتی ہے۔ بھارت میں "الفانسو" آم زیادہ مشہور ہیں جبکہ پاکستان میں بہت سی اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان میں دیسی' چونسہ' دسہری' فجری' لنگڑا' سہارنی' سندھڑی اور انور رٹول مشہور ہیں۔

آم کے غذائی اجزا

ایک پیالی آم (165 گرام) میں درج ذیل وٹامن اور معدنیات پائے جاتے ہیں:

☆ وٹامن سی	50 گرام
☆ وٹامن اے	1262انٹرنیشنل یونٹس
☆ وٹامن بی6	0.2ملی گرام
☆ وٹامن ای	1.8ملی گرام
☆ وٹامن کے	6.9مائیکروملی گرام
☆ تھیامین	0.1ملی گرام
☆ ربوفلاوین	0.1ملی گرام
☆ تانبا	0.2ملی گرام
☆ پوٹاشیم	257ملی گرام
☆ سوڈیم	3.3ملی گرام
☆ میگنیشیم	14.8ملی گرام
☆ اومیگا۔3 تیزاب	61.1ملی گرام

دیسی آم

اس کا شمار قدیم آموں میں ہوتا ہے جو چوس کر کھایا جاتا ہے۔ اسی آم میں ایک قسم "ٹپکے" کی ہے۔ ٹپکے سے مراد وہ آم ہے جو درخت ہی پر پک کر زمین پر گر پڑے۔ آج بھی لوگ دکاندار سے ٹپکے کا آم طلب کرتے ہیں جو کم یاب ہو چکا ہے۔

چونسہ

پچھلے دس پندرہ برس کے دوران یہ پاکستان کا مقبول ترین آم بن چکا۔ یہ جسامت میں زیادہ بڑا نہیں

ہوتا مگر نہایت شیریں گودا اور اپنی مخصوص خوشبو رکھتا ہے۔ اس آم کے باغات ملتان اور رحیم یار خان میں واقع ہیں۔ یہ چونکہ قلمی آم ہے، اس لیے یہ کاٹ کر کھایا جاتا ہے۔

لنگڑا

اس آم کی وضع قطع لنگڑے جیسی بنے سو یہ نام پڑا۔ اس آم کے باغات ملتان، بہاولپور، رحیم یار خان، ڈیرہ غازی خان اور میر پور خاص میں واقع ہیں۔ یہ بھی میٹھا اور خوشبودار گودا رکھتا ہے۔ اسے عموماً کاٹ کر کھایا جاتا ہے۔

لنگڑا آم علامہ اقبال کو بہت مرغوب تھا۔ ایک بار مشہور شاعر اکبر الہ آبادی نے علامہ اقبال کو لنگڑے آموں کا تحفہ بذریعہ ڈاک بھجوایا۔ علامہ اقبال نے پارسل کی رسید پر یہ یادگار مصرع بھی لکھ بھیجا:

"الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا"

سندھڑی

اس آم کا نام ضلع تھرپارکر سندھ کے ایک قصبے سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس آم کی کاشت سب سے پہلے مرحوم وزیراعظم پاکستان محمد خان جونیجو کے خاندان والوں نے کی تھی۔ یہ آم بھی بڑا میٹھا اور رسیلا ہوتا ہے۔ وسیع پیمانے پر برآمد ہوتا ہے۔ حکومت پاکستان اکثر سندھڑی آم ہی بیرونی ممالک کے سربراہوں کو بطور تحفہ بھجواتی ہے۔

دسہری

یہ آم اٹھارھویں صدی میں نوابان لکھنؤ کے باغات میں اگایا گیا۔ یہ باغ دسہری نامی دیہہ میں واقع تھے اسی لیے آم کی اس قسم کا نام پڑا۔ اس آم کی گٹھلی چھوٹی ہوتی ہے اور گودا شیریں! یہ بھی اپنی علیحدہ مہک رکھتا ہے۔ کچھ لوگ اسے چوس اور کچھ کاٹ کر کھاتے ہیں۔

انور رٹول

یہ بھی بڑا رسیلا اور خوشبودار آم ہے۔ اسے رٹول کے ایک زمیندار انوارالحق نے پہلی بار اگایا۔ یہ بھارتی ریاست اترپردیش میں واقع ایک علاقہ ہے۔ گول شکل صورت والا یہ آم چوسا جاتا ہے۔ اب یہ ہمارے صوبہ پنجاب میں وسیع پیمانے پر کاشت کیا جاتا ہے۔

آم کی پیداوار

دنیا میں ہر سال قریباً چار کروڑ ٹن آم پیدا ہوتا ہے۔ اس رسیلے پھل کی سب سے زیادہ پیداوار بھارت میں ہوتی ہے۔ بلکہ دنیا کا چالیس فیصد آم وہیں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک میں آم کی پیداوار ڈیڑھ کروڑ ٹن سالانہ سے زائد ہے۔ اس کے بعد چین، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور پاکستان کا نمبر آتا ہے۔

وطن عزیز میں ہر سال اٹھارہ سے انیس لاکھ ٹن کے لگ بھگ آم کی پیداوار ہے۔ موسم میں یہ اتنا سستا ہوتا ہے کہ عام آدمی بھی خرید سکے۔ مزید برآں بہت سا آم باہر بھی بھجوایا جاتا ہے۔

پاکستان سے یہ پھل مشرق وسطیٰ، یورپ اور امریکا برآمد کیا جاتا ہے۔ پاکستان کا معروف ادارہ روشن انٹرپرائز وطن عزیز میں آم اور کنو برآمد کرنے والا بڑا قومی ادارہ ہے۔ ادارے کے خصوصی پلانٹ ہیں جہاں کنو اور آموں کو اچھی طرح صاف ستھرا کرنے کے بعد خوبصورت رنگین ڈبوں میں پیک کیا جاتا ہے۔

اردو اور فارسی کے ممتاز شاعر امیر خسرو نے آم کو "فخر گلستاں" کا خطاب دیا تھا...... اور یہ پھلوں کے بادشاہ پر خوب سجتا و پھبتا ہے۔

دنیا بدل دینے والے سُپر کمپیوٹر

ماہرین کو یقین ہے کہ جدید ترین کمپیوٹر ٹیکنالوجی انسانی زندگی کی کایا پلٹ ڈالے گی اور کئی مسائل قصہ پارینہ بن جائیں گے

سید عاصم محمود

1878ء کی بات ہے، تھامس ایلوا ایڈیسن نے ایسا بلب ایجاد کرنے کا تہیہ کیا جسے عوام سستے داموں خرید سکیں۔ تاریخ انسانی کے اس مشہور موجد کو ایسا عمدہ برقی بلب تیار کرنا تھا جو تھوڑی حدت خارج کرے، طویل عرصہ چلے اور اس میں کم بجلی خرچ کرنے والے آلے نصب ہوں۔

ایڈیسن نے ہزاروں عام و فطری چیزوں کی راہنمائی سے چار ہزار کاربنی مادے (Materials) آزمائے اور انھیں ٹیسٹوں سے گزارا جن میں لکڑی اور ناریل کے چھلکے سے لے کر اپنے لیبارٹری اسسٹنٹ کے بال تک شامل تھے۔ چودہ ماہ کی محنت کے بعد آخر کار وہ کاربنی سوتی دھاگے سے بنا فلامنٹ (Filament) بنانے میں کامیاب رہے۔

برقی بلب کی ایجاد کو امریکی میڈیا نے "عظیم ترین ایجاد" کہہ کر پکارا۔ حالانکہ بلب ابھی ناپختہ حالت میں تھا۔ یہی وجہ ہے صرف بیس سال بعد ایک امریکی موجد ولیم ڈیوڈ کولج نے 1910ء میں ٹنگسٹن فلامنٹ ایجاد کر لیا۔ اسی ایجاد نے تاریک رات میں دنیا کو روشن کر ڈالا۔ ایڈیسن کا تیار کردہ فلامنٹ قصہ ماضی بن گیا۔

☆...☆

یہ زیادہ مفید فلامنٹ ایک سائنسی علم "میٹریلز سائنس" کے ذریعے وجود میں آیا۔ اس علم سے وابستہ

سائنس دان مختلف مادوں پر تحقیق کر کے نیا خام مادہ ایجاد کرتے ہیں۔ ایک سو سال قبل یہ ابتدائی حالت میں تھی لیکن آج یہ بڑا اہم اور انسان دوست علم بن چکا۔

وجہ یہ ہے کہ "کوانٹم طبیعیات" کی مدد سے ماہرین مادوں کے سربستہ راز اور اسرار جان چکے۔ کوانٹم طبیعیات علم طبیعیات کی ایسی شاخ ہے جس میں مادوں کا انتہائی گہرائی یعنی ایٹمی سطح پر مطالعہ ہوتا ہے۔ چناں چہ اب سائنس دان بہتر طور پر جاننے لگے ہیں کہ فلاں مادے کی خوبیاں و خامیاں کیا ہیں اور اسے کیونکر استعمال کرنا ممکن ہے۔

صبر آزما طویل دور

میٹریلز سائنس کی تمام تر ترقی کے باوجود آج بھی نئے مادوں کی تیاری بڑا کٹھن اور رکاوٹوں سے پُر کام ہے۔ کمپنیاں نئے مادے کی کھوج میں تحقیق و تجربات پر بلامبالغہ اربوں روپے خرچ کر ڈالتی ہیں لیکن کامیابی کم خوش نصیبوں ہی کو ملتی ہے۔

بالعموم محقق و ماہرین فطری ذہانت اور تجربے کے باعث کوئی نیا خیال سوچتے ہیں۔ بعدازاں یہ خیال وسیع پیمانے پر تجربوں سے گزرتا ہے مگر اکثر تجربات ناکام رہتے ہیں حتیٰ کہ ایک نئے مادے کی جانچ پرکھ میں کئی سال لگ جاتے ہیں اور نتیجہ عموماً صفر نکلتا ہے۔

مثال کے طور پر ممتاز امریکی ادارے میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے محقق تھامس ایگار نے تحقیق سے دریافت کیا کہ ایک کامیاب مادہ لیبارٹری سے مارکیٹ تک پہنچنے میں پندرہ سے بیس سال لگا دیتا ہے۔ جب جاپانی کمپنی سونی نے 1991ء میں لیتھیم آیون بیٹریاں بنانے کا اعلان کیا تو لگتا تھا کہ وہ بس آئی ہی چاہتی ہیں۔ لیکن ہزاروں ماہرین دو عشرے تک یہ بیٹریاں بہتر بنانے کی تگ و دو میں لگے رہے تبھی وہ مارکیٹ میں آ گئیں۔

انقلاب کی دستک

خوش قسمتی سے میٹریلز سائنس اب نئے دور میں داخل ہو چکی اور ایک انقلاب کی آمد آمد ہے۔ دراصل پچھلے ایک سو برس کے دوران طبیعیات اور کمپیوٹر سائنس کی زبردست ترقی نے انسان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ایڈیسن طریق کار سے جان چھڑا سکے۔ وجہ یہ کہ اب ماہرین سپر کمپیوٹروں کی مدد سے نت نئے مادے بہت جلد اور زیادہ تر تیار حالت میں ایجاد کرنے لگے ہیں۔ سائنسی اصطلاح میں اس تکنیک کو "ہائی تھروپٹ کمپیوٹیشنل میٹریلز ڈیزائن" (High throughput Computational materials design) کا نام دیا جا چکا۔

اس تکنیک کا بنیادی نکتہ بڑا سادہ ہے..... یہ کہ سپر کمپیوٹروں کی مدد سے بیک وقت سیکڑوں یا ہزارہا کیمیائی مرکبات کا مطالعہ کیا جا سکے۔ یوں کسی بھی نئے مادے..... بیٹری الیکٹروڈ، بیج دھات یا کسی کنڈکٹر کی تشکیل کے واسطے بہترین مسالے و سیمنٹ کی تلاش و انتخاب اب بہت سہل مرحلہ بن چکا۔

مادوں کی دنیا

یاد رہے کہ قدرتی طور پر ملنے والے بیشتر مادے مختلف کیمیائی مرکبات سے بنتے ہیں۔ بیٹری الیکٹروڈز (Electrodes) ایسے مرکبات کی نمایاں مثال ہیں۔

لیکن کچھ مادہ بھی ہیں جیسے گریفائٹ! اس مادے کو الیکٹرونکس کا مستقبل قرار دیا جا رہا ہے اور یہ کاربن کے صرف ایک ایٹم سے بنی شیٹ پر مشتمل ہے۔

مادے کے مرکبات سادہ ہوں یا پیچیدہ' اس کی خصوصیات (سختی' ٹھوس پن' چمک' موصلیت وغیرہ) ہمیشہ وہ ایٹم جنم دیتے ہیں جن سے کہ مادہ بنتا ہے۔ اسی لیے ہائی تھروپٹ کمپیوٹیشنل میٹریلز ڈیزائن کے پہلے مرحلے میں انہی خصوصیات کا ایٹمی سطح پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ سپر کمپیوٹر مادوں کے ہزارہا مرکبات تشکیل دیتا ہے۔ ماہرین پھر ان ورچوئل مرکبات کی خصوصیات پر تحقیق کرتے ہیں... مثلاً یہ کہ وہ سختی میں کیسے ہیں؟ روشنی کیونکر جذب کرتے ہیں؟ جب انھیں موڑا جائے' تو کیا ہوتا ہے؟ وہ انسولیٹر (Insulator) ہیں یا دھاتیں؟ اسی تحقیق کی روشنی میں سائنس دان دیکھتے ہیں کہ کون سے مرکبات نئے مادے بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مطلوبہ مادہ تیار کرنے کے بعد نتائج تحقیق ڈیٹا بیس میں محفوظ ہو جاتے ہیں تاکہ مستقبل میں کام آ سکیں۔

اس وقت امریکا' برطانیہ' جرمنی اور فرانس سے تعلق رکھنے والے ممتاز ماہرین میٹریلز سائنس پر مل کر کام کر رہے ہیں تاکہ ہائی تھروپٹ کمپیوٹیشنل میٹریلز ڈیزائن کی بدولت اس سائنسی شعبے میں انقلاب لا سکیں۔ وہ اپنے منصوبے کو ''میٹریلز پروجیکٹ'' کا نام دے چکے۔ ان کا مشن ایسے زبردست ڈیٹا بیس کا قیام ہے جس میں تمام غیر نامیاتی (Inorganic) مرکبات کی تھرموڈائنامک اور الیکٹرونک خصوصیات جمع ہو جائیں۔

ماہرین اب تک فطرت میں پائے جانے والے ''35000'' غیر نامیاتی مادوں کی بنیادی خصوصیات ڈیٹا بیس میں جمع کر چکے۔ مثلاً یہ کہ وہ موصل (کنڈکٹر) ہے یا حاجز (انسولیٹر)؟' وہ روشنی کو کیسے برتتا ہے وغیرہ۔ مزید برآں سائنس دان ایسے چند ہزار مادوں کی خصوصیات بھی نوٹ کر چکے جو فی الوقت صرف نظریاتی طور پر پائے جاتے ہیں۔

اب تک دنیا بھر میں پانچ ہزار سے زائد سائنس دان ''میٹریلز پروجیکٹ'' کا حصہ بن چکے۔ چناں چہ انھیں مادوں کی خصوصیات والی معلومات کے ڈیٹا بیس تک رسائی حاصل ہو چکی۔ یہ معلومات شمسی سیل' بیٹریاں اور دیگر اشیا ایجاد کرنے میں کام آ رہی ہیں۔

ادھر امریکا کی ڈیوک یونیورسٹی میں ماہرین کا ایک گروہ سپر کمپیوٹروں کی مدد سے نئی دھاتوں (Alloys) کی خصوصیات دریافت کرنے میں مصروف ہے۔ ان کا مشن ہلکے پھلکے مگر انتہائی مضبوط کار فریم' سٹرکچرل جیسیں برائے بلند عمارت اور ہوائی جہازوں کے ڈھانچے تیار کرنا ہے۔

غرض وہ وقت قریب ہے جب میٹریلز سائنس

تخلص

مولانا محمد علی جوہر بہت اچھے شاعر تھے۔ جوہر ان کا تخلص تھا۔ ان کے ایک بڑے بھائی بھی شاعر تھے اور وہ گوہر تخلص کیا کرتے تھے۔ کسی محفل میں مولانا شوکت علی سے پوچھا گیا: "آپ کے بھائی جوہر تخلص کرتے ہیں اور ان سے بڑے بھائی گوہر تخلص کرتے ہیں۔ آپ کا اپنا کیا تخلص ہے؟"

مولانا شوکت سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو مولانا جوہر نے دیا: "شوہر" (مرسلہ: رضا ظہیر۔ سیالکوٹ)

کے ماہرین سپر کمپیوٹروں کی مدد سے قریباً ہر شے تیار کریں گے۔ سائنس دانوں کو یقین ہے کہ کمپیوٹنگ کی ٹیکنالوجی ہماری دنیا تبدیل کر ڈالے گی..... تب آلودگی قصہ پارینہ بن سکتی ہے، وافر بجلی جنم لے گی اور زندگی گزارنا اتنا سہل و آرام دہ بن جائے گا کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ٹچ اسکرین سے اسمارٹ فون تک

واضح رہے کہ جدید دنیا کی بنیادیں انہی ایجادات پر استوار ہیں جو میٹریلز سائنس کے ذریعے وجود میں آئیں۔ ان میں گلاس سے بنی شفاف موصل اسکرینیں قابل ذکر ہیں کیونکہ انہی نے یہ ممکن بنایا کہ ٹیلی ویژن و کمپیوٹر سے لے کر اسمارٹ فون تک بنائے جا سکیں۔

آج آپ بذریعہ اسمارٹ فون روشنی کی رفتار سے دنیا بھر میں معلومات بھیج سکتے ہیں۔ یہ انقلاب بھی اسی لیے آیا کہ ماہرین میٹریلز سائنس نے ایسا طریقہ دریافت کر لیا کہ گلاس کو فاضل آیونز (Ions) سے پاک کیا جا سکے۔ یوں فائبر آپٹک کمیونیکیشن انجام دینا ممکن ہو گیا۔

موبائل فون ہوں یا اسمارٹ فون، ان کی بیٹری ایک دو روز ہی چلتی ہے۔ یہ انقلاب بھی میٹریلز سائنس کی بدولت ہی آیا۔ تیس سال قبل ماہرین نے لیتھیم ذخیرہ کرنے والے آکسائیڈ مادے دریافت کیے تھے۔ یوں لیتھیم آیون بیٹری بنانا ممکن ہو گیا۔

سپر کمپیوٹر کی آمد

یہ 2005ء کی بات ہے، ملٹی نیشنل کمپنی پروکٹر اینڈ گیمبل نے میٹریلز سائنس کے دو ممتاز امریکی ماہرین گربینڈ سیڈر اور کرسٹین پرسن سے رابطہ کیا۔ یہ دونوں تب میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ امریکا سے وابستہ تھے۔ ملٹی نیشنل کمپنی اپنی الکلی بیٹریوں کے لیے نیا کیتھوڈ مادہ تلاش کرنا چاہتی تھی۔ کمپنی کی تمنا تھی کہ دونوں ماہرین اس کھوج میں مدد کریں۔

کمپنی کے نمائندے اور امریکی ماہرین تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ ایک اچھوتا سوال ان کے سامنے آ گیا..... یہ کہ نئے مادے کی تلاش میں سپر کمپیوٹر سے مدد لی جا سکتی ہے؟ کچھ سوچ بچار کرنے سے ہی ان پر افشا ہوا کہ اگر ماہرین کو رقم، وقت اور سپر کمپیوٹر مل جائے تو ایسی انوکھی تحقیق ہو سکتی تھی۔

پروکٹر اینڈ گیمبل نے فوراً پروفیسر گربینڈ اور کرسٹن کو دس لاکھ ڈالر دیے تاکہ وہ انسٹی ٹیوٹ سے رخصت لے کر منصوبے پر کام کر سکیں۔ مزید برآں کمپنی نے انہیں اپنے سپر کمپیوٹنگ سینٹر تک بھی رسائی دے ڈالی۔

یوں ''الکلی پروجیکٹ'' کا آغاز ہوا۔ سپر کمپیوٹر کی مدد سے ماہرین نے ''تیرہ ہزار'' حقیقی اور نظریاتی مرکبات کو تحقیق و تجربات کی کٹھالی سے گزارا۔ بعد ازاں کمپنی کو دو ایسے مرکبات کی فہرست دی جن سے زیادہ بہتر مادہ بن سکتا تھا۔ اسی دوران ماہرین کو احساس ہو گیا کہ ہائی تھرو پٹ کمپیوٹیشنل میٹریلز ڈیزائن ان کے شعبے کا مستقبل ہے۔

مادوں کی خصوصیات کا جادو

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، قدرت میں 35000 غیر نامیاتی مادے پائے جاتے ہیں۔ ان ہزارہا مادوں کی اپنی لاکھوں خصوصیات ہیں۔ انہی خصوصیات کا

مطالعہ جدید میٹریلز سائنس کی بنیاد ہے۔ مثلاً جدید تحقیق سے ماہرین جان چکے کہ معدنیات کے کرسٹل کی ہیئت تبدیل کرنے سے ان کا رنگ بدلا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر لعل (Ruby) کو لیجیے۔ اس کی سرخ رنگت نے ایک ندرت کے باعث جنم لیا۔ وہ یہ کہ معدن کورونڈم (Corundum) میں ایک فیصد المونیم کی جگہ کرومیم آیون شامل ہو گئے۔ اسی معمولی تبدیلی کے باعث کورونڈم عام معدن سے قیمتی لعل میں تبدیل ہوا اور روشنی میں سرخ نظر آنے لگا۔

گویا ماہرین میٹریلز سائنس یہ جان چکے کہ لعل سرخ رنگت کیونکر حاصل کرتا ہے۔ سو اب وہ مصنوعی (Synthetic) طریقوں سے بھی اسے بنانے کے قابل ہو چکے۔ وہ لعل سے ملتے جلتے مادوں میں متعلقہ خصوصیات پیدا کر کے حقیقی لعلوں سے ملتے جلتے یہ قیمتی پتھر تیار کر سکتے ہیں۔

اس ضمن میں ماہرین کو ایک جدید علم "کوانٹم مکینکس" (Quantum Mechanics) سے خوب مدد ملتی ہے۔ اس علم میں مادوں کی خصوصیات کا انتہائی چھوٹی سطح (نینو اسکیل) پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔ کوانٹم مکینکس ہی میٹریلز سائنس کے ماہرین کو بتاتی ہے کہ نئے مادے کی کھوج میں کس قسم کے مادوں کو برتا جائے اور ان کی خصوصیات کیونکر استعمال کی جائیں۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کوانٹم مکینکس کی مساواتیں (Equations) اتنی زیادہ پیچیدہ ہیں کہ صرف سپر کمپیوٹر ہی انھیں حل کر سکتا ہے۔ مثلاً آپ جاننا چاہتے ہیں کہ پانچ سو مرکبات میں سے مطلوبہ خصوصیات کون سے مرکب رکھتے ہیں۔ یہ کام صرف سپر کمپیوٹر ہی انجام

دور جدید کے سپر کمپیوٹر

حساب کتاب انتہائی پھرتی سے انجام دینے میں سپر کمپیوٹروں کا جواب نہیں۔ آج کے تیز رفتار سپر کمپیوٹر فی سیکنڈ ایک سیکنڈ میں "کھربوں" پیمائشیں کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب سیکڑوں انتہائی طاقتور پروسیسروں کو یکجا کر دیا جائے تو ایک سپر کمپیوٹر وجود میں آتا ہے۔ پروسیسر جتنے زیادہ اور طاقتور ہوں گے، سپر کمپیوٹر بھی اتنا ہی پھرتیلا ہو گا۔

فی الوقت چین کا تیار کردہ تیان ہی۔2 (Tianhe-2) نامی سپر کمپیوٹر دنیا میں سب سے تیز رفتار ہے۔ یہ ایک سیکنڈ میں 33.86 پیٹافلاپس رفتار سے پیمائش کرتا ہے۔ یاد رہے ایک پیٹافلاپ ایک ہزار ٹریلین پیمائشوں کے برابر ہے۔ (اردو میں ایک ٹریلین ایک پدم کے برابر ہے یعنی سو کھرب)

دے سکتا ہے۔ اسی لیے دھاتوں کی ایجاد کے بعد میٹریلز سائنس میں بھی زبردست ترقی دیکھنے کو ملی۔

مثال کے طور پر اب ماہرین تھرموالیکٹرک (Thermoelectric) مادوں کی تلاش میں ہیں۔ ایسے مادے جب درجہ حرارت کی کمی بیشی سے گزریں تو بجلی پیدا کرتے ہیں۔ تھرموالیکٹرک مادوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان سے بجلی گزاری جائے تو وہ فوراً گرم یا سرد ہو جاتے ہیں۔ فوری (انسٹنٹ) کولنگ انھی مادوں کی بدولت ممکن ہوئی۔

انسانی معاشرے جلنے کے عمل یعنی احتراق (Combustion)، مشتعل پروسیسنگ اور ریفریجریشن

سے کثیر مقدار میں حرارت ضائع کرتے ہیں۔ اگر ماہرین موثر، سستے اور پائیدار تھرمو الیکٹرک مادے ایجاد کر لیں تو ان کی بدولت حرارت "پکڑ" کے اُسے بجلی کی شکل دی جا سکے گی۔

ذرا سوچیے کہ ان مادوں سے ہزار ہا میگاواٹ بجلی جنم لے گی کیونکہ کارخانوں میں ضائع ہو جانے والی حرارت کو بجلی میں بدلا جا سکے گا۔ یہی نہیں سڑکوں پر بھاگتی دوڑتی گاڑیاں اور گھروں میں چلتے الیکٹرونکس آلات بھی کثیر مقدار میں حرارت پیدا کرتے ہیں۔ تھرمو الیکٹرک مادوں کے ذریعے اس حرارت کو بجلی میں ڈھالا جائے گا۔

ان حیرت انگیز مادوں کی ایک اور خوبی بھی قابل ذکر ہے۔ یہ فوری ٹھنڈک پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سو مستقبل قریب میں ایسے ننھے منے آلات کا تصور کیجیے جو ہمارے لباس میں نصب ہوں گے۔ بس بٹن دبایئے اور وہ سخت گرمی میں ہمیں فوراً ٹھنڈ مہیا کریں گے۔ تب پنکھے کی ضرورت ہو گی نہ اے سی کی!

اس سال ماہ جنوری سے کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین ہائی تھروپٹ کیمپوٹیشنل میٹریلز ڈیزائن (طریق کار) کی مدد سے تھرمو الیکٹرک مادوں کا کھوج لگانے پر جت گئے ہیں۔

فی الوقت لیڈ ٹیلورائیڈ (Lead.telluride) سب سے ممتاز تھرمو الیکٹرک مادہ ہے۔ مگر یہ اتنا زیادہ زہریلا ہے کہ اُسے تجارتی مقاصد کی خاطر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ سو اب ماہرین جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہو کر ایسے کیمیائی مرکبات تلاش کریں گے جن سے نئے تھرمو الیکٹرک مادے جنم لیں۔ سائنس دانوں کو یقین ہے، مستقبل قریب میں بجلی اور ٹھنڈک پیدا کرنے والے یہ محیر العقول مادے حقیقت بن جائیں گے۔

میٹریلز سائنس کا سنہرا دور

سپر کمپیوٹروں کے ذریعے مادوں کی خصوصیات کا مطالعہ اور ان سے نئے مادے ایجاد کرنے کا فن ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔ تاہم ماہرین یہ پیش بینی ضرور کر چکے کہ دنیائے انسانیت کو مستقبل میں اس سے کتنے فوائد حاصل ہوں گے۔ ان کی چند جھلکیاں پیش خدمت ہیں۔

ان میں سرفہرست انسان دوست توانائی (Clean-energy) پیدا کرنے والی ٹیکنالوجیاں ہیں۔ نت نئے مادوں کی ایجاد سے انھیں عمل میں لانا آسان ہو جائے گا۔ مثلاً ٹائیٹینم ڈائی آکسائیڈ جیسے فوٹو کیٹا لائٹک مادے بننے سے ممکن ہو جائے گا کہ دھوپ اور پانی کو آکسیجن اور ہائیڈروجن میں بدلا جا سکے۔ ان گیسوں کو پھر مائع ایندھن میں ڈھالا جائے گا۔ دیگر فوٹو کیٹا لائٹک مادے کاربن ڈائی آکسائیڈ کے ساتھ بھی یہی عمل انجام دیں گے۔

ماہرین کا خواب یہ ہے کہ ایسا "مصنوعی پتا" تیار کیا جائے جو دھوپ اور ہوا کو سیتھانول سے ملتے جلتے مائع ایندھن میں بدل سکے۔ یہ ایندھن پھر چولہوں سے لے کر کاروں اور ہوائی جہازوں تک چلایا جائے گا۔ اس ضمن میں امریکی محکمہ توانائی کے تحقیقی ادارے جوائنٹ سینٹر فار آرٹیفیشل فوٹو سینتھیسز میں ماہرین شب

ورو تحقیق کر رہے ہیں تاکہ سپر کمپیوٹر کی مدد سے یہ ٹیکنالوجی قابل عمل بنانے والے مادے ڈھونڈ سکیں۔

اسی طرح ماہرین کی ایک منزل یہ ہے کہ گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کی تیاری میں استعمال ہونے والی ہلکی مگر مضبوط کچ دھاتیں تیار کی جائیں۔ وجہ یہ کہ ایک کار کا وزن محض 10 فیصد بھی کم ہو جائے تو وہ 8 فیصد کم ایندھن کھاتی ہے۔ اسی لیے آٹو موبائل صنعت سے وابستہ بڑی کمپنیاں محققوں کو اربوں روپے دے رہی ہیں تاکہ وہ نئی کچ دھاتیں اور مادے بذریعہ تحقیق ایجاد کر سکیں۔

ذرا سوچیے اگر گاڑیاں اور مشینیں ہلکی پھلکی مضبوط و پائیدار میٹریلز سے بننے لگیں تو ایندھن کی بے پناہ بچت ہو گی۔ یوں خصوصاً ٹرانسپورٹیشن اور کنسٹرکشن کے شعبوں میں انقلاب آ سکتا ہے۔

شعبہ کمپیوٹر بھی بے چینی سے نئے مادوں کی راہ تک رہا ہے۔ وجہ یہ کہ ماہرین کا دعویٰ ہے، مورے کے قانون (Moore's law) کا زمانہ اختتام پذیر ہے۔ اس قانون کی رو سے چھوٹے ٹرانسسٹر بننے کے باعث ہر دو سال بعد کمپیوٹر کی رفتار دگنی ہو جاتی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ سلیکون مادے سے اب مزید چھوٹے ٹرانسسٹر نہیں بنائے جا سکتے۔ مزید برآں ماہرین اسے بہترین کنڈکٹر مادہ بھی نہیں سمجھتے۔ اسی لیے خصوصاً امریکی لیبارٹریوں میں سائنس دان ایسے مادے تلاش کرنے کی تگ و دو میں ہیں جو بسرعت موصل حالت (Conducting) سے حاجز حالت (Insulating) میں آ جائیں۔

اس ضمن میں کچھ پیش رفت بھی ہو چکی۔ میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ میں سائنس دان گریفائٹ (مادے) کے ذریعے انتہائی تیز رفتار ٹرانسسٹر بنا چکے۔ اُدھر اسٹانفورڈ یونیورسٹی (امریکا) کے ماہرین نے دریافت کیا کہ میگنیٹائٹ (مادے) سے بنے ٹرانسسٹروں میں برقی آن/آف سوئچ بدلنے میں سیکنڈ کا صرف ایک کھرب واں وقت لگتا ہے۔۔۔۔ گویا یہ ٹرانسسٹر موجودہ ٹرانسسٹروں سے کئی ہزار گنا تیز رفتار ہے۔ اب سپر کمپیوٹروں کے ذریعے ایسے ہی مزید مادے دریافت کرنا مزید سہل ہو جائے گا۔ غرض زندگی کے کئی شعبہ جات میں نئے مادے انقلاب لا سکتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور اہم معاملہ دیکھیے۔ سائنسی حلقوں میں طویل عرصے سے یہ معاملہ زیر بحث ہے کہ کیوں نہ کاربن کی جگہ سلیکون سے مائع ایندھن بنایا جائے۔ ابھی تو کاربن سے ماحول دشمن ایندھن (کوئلہ، پٹرول، گیس) بنتے ہیں۔ مگر سلیکون کو استعمال کرنے سے صرف مٹی اور پانی ہی وجود میں آئیں گے۔ چناں چہ اب ہائی تھروپٹ کمپیوٹیشنل میٹریلز ڈیزائن کے ذریعے دیکھا جا رہا ہے کہ سلیکون (ریت) سے مائع ایندھن بن سکتا ہے یا نہیں؟

درج بالا وجوہ کی بنا پر ماہرین کو یقین ہے کہ میٹریلز سائنس و ڈیزائن کا نیا سنہرا زمانہ شروع ہونے والا ہے۔ سپر کمپیوٹر کی عظیم الشان طاقت نے انسان کو یہ قدرت دے ڈالی کہ وہ مختلف مادوں کے ملاپ سے نئے (مصنوعی) مادے تخلیق کر سکے۔ یہ یقیناً بڑی خوش خبری ہے کیونکہ دنیائے انسانیت آج سیکڑوں مسائل میں گرفتار ہے۔ ٹیکنالوجی کی نئی طاقت سے انھیں حل کرنے میں مدد ملے گی۔

پاکستان میں علم جغرافیہ کی پہلی پی ایچ ڈی

ڈاکٹر مریم کرم الٰہی

ایک باہمت، باکردار اور دردِ دل رکھنے والی خاتون کا سبق آموز قصۂ حیات

جو پیرانہ سالی میں بھی اہلِ وطن کی تعلیم و تربیت پہ کمربستہ ہیں

ترتیب و بیان: پروفیسر محمد فاروق قریشی

اٹھاسی سالہ جغرافیہ دان، لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اکنامکس سے پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی کی پروفیسر اور شعبۂ جغرافیہ کی سربراہ، بہترین استاد، یونیورسٹی سنڈیکیٹ اور سینیٹ کی رکن، کئی حکومتی تنظیموں کی رکن اور مشیر، ملکی اور بین الاقوامی سائنس و جغرافیہ کانفرنسز میں شرکت و صدارت، محقق، مصنفہ، تحریک پاکستان کی سرگرم کارکن، فلاحی تنظیم پاک انجمن خواتین کی رکن اور نعت گو شاعرہ یہ ہیں عظیم اور باوقار خاتون ڈاکٹر مریم کرم الٰہی۔

تاریخ پیدائش 23 نومبر 1925ء اور میری جائے پیدائش وزیرآباد گجرات ہے۔ میرے والد ریلوے ٹیلی گراف انسپکٹر تھے۔ والدہ بہت سادہ اور سلجھی خاتون تھیں۔ ہم چار بہنیں تھیں۔ میں سب سے چھوٹی ہوں۔ جب میں ذرا بڑی ہوئی تو میرے والد کا تبادلہ منگ وال ہوگیا۔ یہ ہندوؤں کی آبادی تھی۔ میرے والد نے کوشش کی کہ کوئی مسلم اسکول مل جائے تو وہ مجھے اور بڑی بہن کو وہاں داخل کرا دیں۔ بڑی دونوں بہنیں آٹھ جماعتیں پڑھ چکی تھیں۔ پتا چلا کہ وہاں سب ہندی پڑھانے والے اسکول ہیں۔ میرے والد مذہبی اور پکے مسلم لیگی تھے اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔ انھوں نے ہمیں ہندی اسکول میں داخل نہ کرایا اور ہم نے گھر ہی پر اردو، حساب، تاریخ، جغرافیہ پڑھنا شروع کر دیا۔ والد خود پڑھاتے تھے یا بڑی بہنیں۔

حسن اتفاق سے والد کا تبادلہ دہلی ہوگیا اور ہم نے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ میں تھوڑا ضدی واقع ہوئی تھی۔ ہیڈ مسٹریس نے کہا کہ وہ میری بہن کو پانچویں اور مجھے چوتھی جماعت میں لیں گی۔ میں بگڑ گئی۔ میں نے کہا کہ یا تو وہ بھی چوتھی جماعت میں رہے گی یا پھر میں بھی پانچویں میں جاؤں گی۔ چناں چہ ہم دونوں کو پانچویں جماعت میں داخلہ دے دیا گیا۔ پانچویں جماعت کے امتحان میں ہم دونوں بہنوں نے وظیفہ حاصل کیا اور ساتویں جماعت تک مسلم مشن دریا گنج اسکول میں پڑھتی رہیں۔ والد ایک دفعہ پھر تبادلوں کی زد میں آئے اور ہم کراچی، ملتان، کوئٹہ میں مختصر قیام کے بعد لاہور آگئے۔ یہاں میں نے 1940ء میں اسلامیہ ہائی اسکول برانڈرتھ روڈ میں داخلہ لیا۔ میٹرک کرنے کے بعد اسلامیہ کالج کوپر روڈ میں زیرتعلیم رہی جہاں سے میں نے عربی کے ساتھ بی اے آنرز کر لیا۔

اسکول اور کالج کے زمانے کی خاص بات یہ تھی کہ علامہ اقبال کے دوست چودھری محمد حسین ہمیں ہفتے میں دو دن دینیات پڑھانے آتے۔ انھوں نے ہمیں سورۃ نور اور سورۃ النسا تفسیر کے ساتھ اور کچھ اور چیزیں بھی پڑھائیں۔ پردے کے پیچھے سے پڑھاتے۔ وہ اتنا اچھا لیکچر دیتے کہ دل کے اندر اترتا چلا جاتا۔ ان کا انداز بہت دلنشین تھا اس لیے ان کا پڑھایا ہوا آج تک ذہن سے نہیں مٹ سکا۔ انھوں نے ہمارے کالج میں بزم اقبال بھی قائم کی جس میں شاعر مشرق کی شاعری اور افکار پر بات چیت کی جاتی تھی۔ کانگریس کی ایک رکن خاتون ہمیں "بندے ماترم" کا درس دینے آتی تھی۔

بی اے کرنے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ اب کیا کیا جائے؟ میں ایم اے کرنا چاہتی تھی کیونکہ میری سہیلی کنیز یوسف ایم اے میں چلی گئی تھی۔ والد یونیورسٹی کی مخلوط تعلیم کے خلاف تھے۔ انھوں نے کہا کہ تم بی ٹی کر لو۔ میں نے کہا کہ میں نے اسکول ٹیچر نہیں بننا اس لیے بی ٹی کے بعد ملازمت نہیں کروں گی۔ چناں چہ میں نے لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج سے بی ٹی کر لیا۔ اس کے بعد والد صاحب سے پھر ضد کی کہ آپ مجھے ایم اے میں داخل کروا دیں۔ آخر والد صاحب نے میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ تاہم یہ شرط عائد کر دی کہ میں برقع پہن کر یونیورسٹی جایا کروں گی اور کسی کو اس کا پتا نہیں چلے گا۔ میں نے ان کی ساری شرطیں مان کر پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے جغرافیہ میں داخلہ لے لیا۔ یہ 1946ء کی بات ہے۔

میں جغرافیہ ڈیپارٹمنٹ میں واحد مسلمان طالبہ تھی۔

تین چار مسلمان طلبہ تھے۔ بارہ ہندو لڑکیاں اور تقریباً
چوبیس ہندو لڑکے تھے۔ اگرچہ کلاس کی کل چالیس
نشستوں میں ساٹھ فیصد مسلمانوں کی تھیں لیکن معاشی
اور تعلیمی پسماندگی کے باعث بہت کم مسلم طلبہ و
طالبات اعلیٰ تعلیم میں حصہ لیتے۔ نتیجے میں باقی ماندہ
مسلم نشستیں بھی ہندوؤں کو مل جاتی تھیں۔ اس وقت
پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر عمر حیات خان اور
ڈاکٹر قاضی سعید الدین علیگ شعبۂ جغرافیہ کے سربراہ
تھے۔ میرے اساتذہ میں ڈاکٹر قاضی سعید الدین اور
اوم پرکاش بھردواج شامل تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے
ساتھ پروفیسر سراج صاحب کا گھر تھا۔ ان کی بھانجی
میری سہیلی تھی۔ میں گھر سے برقع پہن کر آتی تھی تو ان
کے ہاں رکھ دیتی۔ اس وقت پنجاب یونیورسٹی کی
حیثیت ایک امتحانی ادارے کی تھی۔ طلبہ و طالبات
یونیورسٹی کے ساتھ الحاق شدہ کالجوں میں داخلہ لیتے
تھے۔ اساتذہ بھی انہی تعلیمی اداروں سے آتے۔ البتہ
کلاسز مال روڈ یونیورسٹی کیمپس پر ہوتی تھیں جسے اولڈ
ہال بھی کہا جاتا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ڈپارٹمنٹ میں تین چار
مسلمان لڑکے اور میں واحد لڑکی رہ گئی۔ بعد ازاں کچھ
لڑکے علی گڑھ سے آگئے۔ 1948ء میں امتحان ہوا تو
میرے اتنے نمبر آئے کہ پچھلے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔
1950ء میں مرکزی حکومت کی طرف سے پی ایچ ڈی
کے اسکالرشپ کا امتحان ہو رہا تھا۔ میں نے بھی امتحان
دیا۔ اس امتحان میں کافی امیدوار شریک ہوئے لیکن یہ
اسکالرشپ مجھے مل گیا اور میں لندن چلی گئی۔ وہاں میں
نے لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اکنامکس سے
1952ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ میرے
تحقیقی مقالے کا عنوان تھا ''پوٹھوہار کے علاقے کا
اکنامک جغرافیہ۔''

لندن سے واپس آکر میں نے پنجاب یونیورسٹی
میں لیکچررشپ کے لیے درخواست دی۔ اس زمانے
میں لڑکیوں کو یونیورسٹی میں نہیں رکھتے تھے۔ جب میرا
انٹرویو ہوا تو اس پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ کنگ
ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل ملک سلیکشن بورڈ
کے رکن تھے۔ انھوں نے میری بہت حمایت کی اور کہا
کہ ایک لڑکی کا اتنا اچھا کیریئر ہے تو آپ اسے موقع
کیوں نہیں دیتے؟ جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی ہے
تو پڑھا کیوں نہیں سکتی؟ نیز آپ یونیورسٹی کیلنڈر میں
کہیں دکھائیں کہ عورتیں لیکچررشپ کی اہل نہیں ہیں۔
بورڈ کے ارکان لاجواب ہو گئے۔ اس کے باوجود مجھے
کچھ عرصہ آزمائش (پروبیشن) پر رکھا اور ایک ٹیسٹ
کیس بنا کر مجھے موقع دیا گیا۔ اس طرح میں پہلی
خاتون ہوں جس نے پنجاب یونیورسٹی میں پوسٹ
گریجوایٹ کلاسز کو پڑھایا۔ میں پاکستان میں جغرافیہ کی
پہلی پی ایچ ڈی بھی ہوں۔

لاہور میں میرا اسکول، کالج اور یونیورسٹی کا زمانہ
سیاسی لحاظ سے بہت ہنگامہ خیز اور طوفانی تھا۔ میں
اسکول میں تھی جب 1940ء میں مسلم لیگ کے اجلاس
میں ''قراردادِ پاکستان'' منظور کی گئی۔ میں منٹو پارک
موجودہ نام (اقبال پارک) میں موجود تھی۔ مسلم لیگ
کے کارکن ہمیں اسکول سے ہی لے گئے۔ ایک بڑا
اونچا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ ہم کافی دور بیٹھے تھے۔ اس وقت
ہر شخص کے اندر بڑا جذبہ تھا۔ حضرت قائداعظمؒ نے
انگریزی میں تقریر کی۔ ظاہر ہے ہمیں اس وقت اتنی
سوجھ بوجھ تو نہیں تھی لیکن ہر کوئی خاموشی سے سن رہا

تھا۔ اتنی خاموشی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ صرف ایک ہی آواز سنائی دیتی اور وہ قائداعظم کی تھی۔

سب کو یقین تھا کہ قائداعظم سچ کہہ رہے ہیں اور مسلمانوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں۔ 1937ء کے صوبائی انتخابات کے بعد مسلم لیگ کو مسلمانوں کی طرف سے زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان انتخابات کے نتیجے میں گیارہ میں سے آٹھ صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ انھوں نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی اور ان پر بہت سے ناجائز ٹیکس لگا دیے۔ کانگریسی قیادت کے متعصبانہ اور مسلم دشمن رویے نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور متحدہ ہندوستان میں انھیں اپنا تاریک مستقبل نظر آ گیا۔ چناں چہ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت اور قائداعظم ان کے محبوب راہنما بن گئے۔

دو قومی نظریہ جو پاکستان کے قیام کی بنیاد بنا، کوئی نئی چیز نہ تھا۔ یہ شاہ ولی اللہ کے جہاد اور سرسید احمد خان کی تعلیمی تحریک کا نظریاتی جوہر تھا جس کو علامہ اقبال نے تصورِ پاکستان کی صورت میں پیش کیا۔ مجھے یاد ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلم پانی الگ الگ ہوتا تھا۔ دونوں کے برتن بھی جدا ہوتے۔ ہندو سمجھتے تھے کہ اگر کوئی مسلمان ان کی کسی چیز کو ہاتھ لگا دے، تو وہ بھرشٹ (ناپاک) ہو جاتی ہے۔ اسی مذہبی اور معاشرتی تعصب کے ماحول میں دو قومی نظریہ وجود میں آیا۔

تحریک پاکستان کے دوران طالبات کا جوش و جذبہ دیدنی تھا۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں ایک بہت بڑی کانفرنس ہوئی جسے پاکستان کانفرنس بھی کہا گیا۔ اس میں اسلامیہ کالج کوپر روڈ کی طالبات نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مجھے اس میں اقبالؒ کا کلام پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ہمارے کالج میں نواب آف بھوپال بھی آئے۔ ایک بڑا جلسہ ہوا اور انھوں نے تحریک پاکستان کے لیے چندہ بھی دیا۔ میری بہت سی ہم عصر خواتین اور طالبات نے تحریک آزادی میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ زینب کاکاخیل کا کردار بھی بڑا اہم تھا۔ بہت نیک خاتون تھیں۔ ان دنوں پڑھاتی تھیں۔ ان کے مضامین اخبارات میں چھپتے۔ وہ دن عجیب تھے۔ مال روڈ پر جلوس نکلتے۔ "بن کے رہے گا پاکستان، لے کے رہیں گے پاکستان" "پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ" کے نعرے لگتے۔ یونیورسٹی دس دن کھلی تھی، پانچ دن بند رہتی تھی۔ پنجاب میں یونینسٹ خضر حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک میں ہم نے حصہ لیا۔ جب خضر وزارت ٹوٹی تو ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ تقسیم ہند کے وقت جو قتل و غارت ہوئی وہ بھی یاد ہے۔

1947ء میں جب مہاجرین آئے، تو ان میں بہت سے افراد زخمی ہوتے۔ چونکہ نرسوں کی بہت کمی تھی اس لیے طالبات سے کہا گیا کہ وہ رضاکارانہ طور پر خدمات انجام دیں۔ ہم نے میو ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں کام کیا۔ مختلف شہروں سے لوگ آئے۔ دہلی اور مشرقی پنجاب سے آنے والی عورتیں اتنی زخمی تھیں کہ ان کے زخموں میں کیڑے پڑے ہوئے تھے اور کپڑے زخموں سے چپکے ہوتے۔ جب کپڑے اتارتے تو تکلیف سے ان کی چیخیں نکل جاتیں۔ ہم ان کے کپڑے تبدیل کرواتے اور بالوں میں کنگھی کرتے۔ واپس گھر آتے تو کھانا نہیں کھایا جاتا تھا۔ سر میں کنگھی کرتے تو جوئیں جھڑتی تھیں۔ ہسپتالوں میں حالت اتنی بری تھی

کہ زخمی لوگ زمین پر پڑے ہوتے' لیکن ان کے لیے یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ وہاں پہنچ جاتے۔ بے گھر ہو کر کیمپوں میں آنے والے افراد مختلف مسائل کا شکار تھے۔ پردہ دار عورتیں بھی ہوتی تھیں۔

ایک واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ ایک دن جب میں اسپتال گئی تو ایک زخمی عورت کو دیکھا جسے رضا کار ایک دن پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ اس کی بہن اور چھوٹا بچہ بھی ساتھ تھا۔ وہ عورت زیادہ خون بہ جانے سے مر گئی کیونکہ اسپتال کے بلڈ بینک میں خون نہیں تھا۔ بہن رو رہی تھی، بچہ بلک بلک کر ماں کے پاس جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس عورت کی بہن بین کر رہی تھی کہ "ہائے میری بہن میں تجھے کندھوں پر اٹھا لائی تھی۔ تو تو کہتی تھی کہ ایک دفعہ پاکستان پہنچ جاؤں، سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ جب تو نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا تو تو نے الحمدللہ کہا تھا۔ ہائے میری بہن! تیرے دکھ تو دور ہو گئے ہیں، میں کہاں جاؤں؟"

پھر وہ اتنا روئی کہ دیکھنے سننے والے بھی رونے لگے۔ ایک دوسرا واقعہ بھی یاد ہے۔ ہم محلے محلے آٹا اور چاول جمع کیا کرتے۔ مہاجرین کی جو ٹرینیں آتی تھیں ان کے لیے کھانا بھجوایا جاتا۔ ایک دن لوگ کھانا پکا کر اسٹیشن پر لے گئے۔ لیکن ریل آئی تو روح فرسا منظر سامنے تھا۔ پوری ریل قتل و غارت کا نشانہ بن چکی تھی۔ خون ٹرین کی کھڑکیوں اور دروازوں سے بہ رہا تھا۔ صرف ایک چھے مہینے کا بچہ زندہ تھا جو ریل کی نشست کے نیچے پڑا تھا۔ شاید ظالموں کو وہ کمسن نظر نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر لوگوں میں اشتعال پیدا ہو گیا اور انتقامی کارروائی کے طور پر انھوں نے شاہ عالمی دروازے کو آگ لگا دی جہاں ہندو اپنے بیوی بچوں کو بھارت بھیج کر خود قلعہ بند ہو کر بیٹھے تھے۔ (حوالہ کے لیے دیکھیے بیدار ملک کی کتاب "حصول پاکستان کی جدوجہد۔ عینی شہادتیں" شائع شدہ 1992ء)

میں نے طویل عرصہ پنجاب یونیورسٹی میں پورے خلوص، محنت اور لگن سے پڑھایا۔ میرے بے شمار طلبہ و طالبات حکومت اور دوسرے شعبوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ میں طویل عرصہ اسٹاف ایسوسی ایشن کی سیکرٹری رہی۔ بورڈ آف اسٹڈیز کی رکن اور قومی کمیٹی برائے سلیبس کی مشیر کے طور پر کام کیا۔ پاکستان کے اندر اور باہر سائنس و جغرافیہ کی کئی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت اور صدارت کی۔ ٹیکسٹ بک بورڈ کے لیے متعدد کتابیں لکھیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن لاہور میں بہت سے لیکچر دیے۔ میرے 26 تحقیقی مقالے شائع ہو چکے۔ میں نے 1983ء سے 1988ء تک پانچ سال ریاض یونیورسٹی سعودی عرب میں بطور پروفیسر تدریسی خدمات انجام دیں۔ پیشہ ورانہ فرائض کے سلسلے میں اب تک میں سعودی عرب، ملائیشیا، جاپان، بھارت، سری لنکا اور مشرقی پاکستان جا چکی ہوں۔ 1985ء میں بطور پروفیسر صدر شعبہ سبکدوش (ریٹائر) ہو گئی اور اب پنشنر کے طور پر زندگی گزار رہی ہوں۔

میرے تعلیم و تدریس کے زمانے میں طلبہ و طالبات میں نظم و ضبط اور استاد کا احترام پایا جاتا۔ کوئی طالب علم استاد کے سامنے سگریٹ پینے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اساتذہ بھی پوری تیاری کے ساتھ کلاس لیتے۔ کبھی دیر سے نہ آتے۔ نصابی تعلیم کے ساتھ طالب علموں کی اخلاقی تربیت بھی کرتے۔ سمسٹر سسٹم کی آمد سے صورت حال کچھ تبدیل ہو گئی ہے۔ شروع

میں تو یہ نظام بھی کامیابی سے چلا کیونکہ اس میں ٹیسٹ، پریذنٹیشن اور پراجیکٹ کے ذریعے طالب علموں کی پڑھنے، لکھنے اور بولنے کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لیکن امتحان اور رزلٹ مکمل طور پر استاد کے ہاتھ میں آ جانے سے کچھ معجزانہ تبدیلیاں در آئی ہیں۔ طلبہ و طالبات ایک دم زیادہ ذہین و فطین ہو گئے اور تقریباً سب ہی نے A- یا A گریڈ لینا شروع کر دیا۔

پاکستان کے قیام کے بعد کافی عرصے تک اعلیٰ تعلیم یعنی ایم فل، پی ایچ ڈی کی سہولت ملک کے اندر موجود نہیں تھی اور اس طرف خاطر خواہ توجہ بھی نہیں دی گئی۔ یہ غالباً یہ تھی کہ اگرچہ یونیورسٹیاں خودمختار ادارے تھے لیکن ان کو حکومت کی طرف سے محدود بجٹ ملتا۔ اب حکومت اور تعلیمی اداروں دونوں نے اس سلسلے میں قابل قدر پیش رفت کی ہے۔

1971ء سے پہلے جغرافیہ کانفرنسوں کے سلسلے میں مجھے 1956ء، 1962ء اور 1968ء میں تین مرتبہ مشرقی پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ سارا مشرقی پاکستان گھوم پھر کر دیکھا۔ ایک دفعہ میرے بنگالی میزبان مجھے خریداری کے لیے ایک بڑی دکان پر لے گئے۔ وہ دکان ہندو کی تھی۔ میں نے سوال کیا کہ کیا یہاں مسلمانوں کی دکانیں نہیں ہیں؟ اس نے بڑی نفرت سے جواب دیا کہ ہاں کچھ بہاریوں کی دکانیں بھی ہیں۔ غیر بنگالیوں کو عرف عام میں بہاری کہا جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کاروبار اور تجارت پر بنگالی ہندوؤں کا غلبہ ہے۔ مسلم بنگالی نچلی سطح پر کہیں موجود تھے۔ عام لوگوں میں غیر بنگالیوں سے نفرت پائی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ بنگالی ہندو کو غیر بنگالی مسلمان سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔

وزیراعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین کو بھی وہ لوگ بنگالی نہیں مانتے ان کے بقول وزیراعظم کے آباؤ اجداد صرف دو سو سال پہلے بنگال میں آباد ہوئے تھے۔ اس نفرت کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں 80 فیصد اساتذہ ہندو تھے۔ بنگالی مسلمانوں کے گھروں میں ہندوانہ ثقافت رچ بس گئی تھی اور وہ ناچ گانے کو اپنی ثقافت سمجھتے۔

پنجاب اور پنجابیوں کے خلاف بھی نفرت عام تھی۔ وہ کہتے تھے کہ پنجابیوں نے یہاں آ کر ملیں لگائی ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ آدم جی کی ایک مل میں دس ہزار بنگالیوں کو روزگار ملا ہوا ہے۔ ایک مل کا دورہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ مزدور چادر اور قیمان پہن کر کام کر رہے تھے۔ میں نے اپنے پنجابی میزبان سے پوچھا "ان کی یونیفارم کہاں ہے؟" اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ باہر جا کر اس نے مجھے بتایا کہ ہم ان کو یونیفارم دیتے ہیں لیکن کچھ دیر کے بعد یہ کہتے ہیں کہ اور یونیفارم دو پچھلی پھٹ گئی ہے۔ حالانکہ وہ جین کی ڈانگری اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ سال بھر میں مشکل سے پھٹتی ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک دفعہ بارش کا پانی چھت پر جمع ہو گیا۔ ہم نے آدمی اوپر بھیجا۔ اس نے رپورٹ دی کہ نئی ڈانگریاں بلیڈ سے کٹی ہوئی ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ ان کی وجہ سے پرنالہ بند ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر یہ بنگالی مزدور آپ کی بات سن لیتے تو اگلے دن ہڑتال کر دیتے اور نئی یونیفارم کا مطالبہ کرتے۔

میرا ایک بنگالی شاگرد تھا انیس الرحمٰن۔ وہ بڑا سچا اور پکا پاکستانی تھا۔ وہ وہاں دریائی ٹرانسپورٹ کا انچارج تھا۔ اس نے پنجابی لڑکی سے شادی کی تھی۔ بنگالی

مسلمان اس کا تذکرہ ناک چڑھا کر یوں کرتے "وہ..... جس کی بیوی پنجابی ہے۔" مشرقی پاکستان کے میرے دورے میں دونوں میاں بیوی میرا بہت خیال رکھتے۔ شام کو گھر لے جاتے اور کھانا کھلاتے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد انیس الرحمن نے بنگلہ دیش میں رہنا گوارا نہ کیا اور یو این او میں چلا گیا اب اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ اس کی بیوی اب بھی مجھے ملنے آتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں جہاں ایسے سچے اور وفادار بنگالی پاکستانی بھی موجود تھے۔ وہاں اکثریت مغربی پاکستان اور خصوصاً پنجاب سے نفرت کرتی تھی۔ بتدریج پنجاب اور پاکستان سے یہ نفرت ایک ناسور کی صورت اختیار کر گئی۔ 1970-71ء کے واقعات نے بس نشتر کا کام کیا اور سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا۔

میری بڑی بہنوں کی شادی جلد ہو گئی کیونکہ والد اس پر یقین رکھتے تھے کہ مناسب تعلیم کے بعد لڑکیوں کی شادی کر دینی چاہیے۔ وہ دونوں مڈل پاس تھیں۔ قدرت کے اکثر فیصلے انسان کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ہوا یہ کہ پہلے ایک بہن بیوہ ہوئی۔ وہ بچوں سمیت ہمارے پاس آ گئی۔ کچھ عرصے بعد دوسری بہن کو بھی بیوگی کے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ بھی ہمارے پاس آ گئی۔ یوں ہمارا گھر یتیموں سے بھر گیا۔

جب تک والد کی زندگی رہی وہ بیٹیوں کی کفالت کرتے رہے۔ ان کے بعد یہ ذمہ داری میں نے سنبھال لی۔ میرے پیش نظر قرآن کی وہ آیات اور نبی پاک ﷺ کی احادیث تھیں جن میں یتیم کی پرورش اور حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ چناں چہ میں نے اپنے بھانجوں اور بھانجیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر توجہ دی۔ میری تنخواہ آنے سے پہلے ہی خرچ ہو جاتی تھی۔ مجھے بہت خوشی اور اطمینان ہے کہ وہ سب اپنی اپنی جگہ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔

ایک دن میں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی تو میرے بھانجے نے مجھ سے پوچھا "خالہ جان! کیا سوچ رہی ہیں؟" میں نے کہا "سوچ رہی ہوں کہ ہمارے جو حالات ہیں ان میں میں کبھی حج نہ کر سکوں گی نہ ہی اپنا مکان بنا پاؤں گی۔" قدرت خدا کی دیکھیں کہ چند دن بعد مجھے اوورسیز ایمپلائزمنٹ آفس سے فون آیا کہ سعودی عرب میں ایک جگہ نکلی ہے جس پر آپ بطور استاد جا سکتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں اکیلی عورت سعودی عرب جا کر کیسے کام کروں گی اور کہاں رہوں گی؟ چناں چہ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چند دن بعد ان کا دوبارہ فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ ایک دفعہ آ کر ہم سے مل لیں پھر جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کیجیے گا۔ جب میں وہاں گئی تو انھوں نے مجھے ریاض یونیورسٹی میں بہت اچھی تنخواہ پر پروفیسر کے طور پر تدریس کی پیشکش کی۔ اس کے ساتھ تین ویزے اور رہائش کی سہولت بھی تھی۔ چناں چہ میں اپنے ساتھ اپنی بہن اور اس کے دو چھوٹے بچوں کو ساتھ لے گئی۔ اس طرح ہم ایک خاندان کے طور پر وہاں رہے۔ وہاں تدریس کے دوران بی اے میں میری عربی زبان کی تعلیم میرے بہت کام آئی۔

ہم 1983-88ء کے دوران پانچ سال سعودی عرب میں رہے۔ وہاں جانے کے ایک ماہ بعد ہی ہم سب نے حج کا فریضہ ادا کیا۔ بعد میں بہت سے عمرے بھی کیے۔ الحمدللہ! اللہ نے میری یہ خواہش بہت جلد

پوری کر دی۔ وہاں سے میں نے اپنے بھانجے عبدالصمد بیگ کو مکان کی تعمیر کے لیے رقم بھیجی اور اس نے کینال ویو ہاؤسنگ کالونی لاہور میں ایک خوبصورت گھر تعمیر کرا دیا۔ میرا بھانجا عبدالصمد بیگ (ستارۂ امتیاز) سینئر جیالوجسٹ اٹامک انرجی کمیشن سے سبکدوش ہو چکا۔ میرے ساتھ ہی رہتا ہے، میں نے یہ گھر اسی کو دے دیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی فلاحی اور تعلیمی سرگرمیوں کے لیے وقف کر دی ہے۔

آپا نثار فاطمہ نے ایک فلاحی تنظیم "پاک انجمن خواتین" کے نام سے قائم کی تھی۔ میں 1989ء میں اس کی رکن بنی۔ ہم نے ایک "بہبود فنڈ" قائم کیا ہوا ہے جس میں مخیر حضرات اور عام لوگ اپنی استطاعت اور توفیق کے مطابق عطیات دیتے ہیں۔ اس فنڈ سے مہاجرین، زلزلہ و سیلاب زدگان کے علاوہ بیوگان کی امداد کی جاتی ہے۔ اس تنظیم کے تحت فاطمہ اکیڈیمی بھی چلائی جا رہی ہے جہاں شام کے وقت معمولی فیس کے عوض اسکولوں کی بچیوں کو تدریسی معاونت فراہم کی جاتی ہے۔

میرا تعلق ایک دینی گھرانے سے ہے۔ میرے پڑنانا میاں محمود اردو، عربی کے بہت اچھے کاتب تھے اور ہاتھ سے قرآن لکھا کرتے۔ ہم نے ان کا ایک قلمی نسخہ مسجد نبوی کی لائبریری کو عطیہ کیا۔ میرے دل میں محمد ﷺ کی ذات پاک سے محبت تو پہلے ہی موجود تھی۔ سبکدوشی کے بعد فرصت میسر آئی اور میرے مرشد حضرت عبیداللہ درانی پرنسپل انجینئرنگ کالج پشاور نے مجھے توجہ دلائی تو میں نے نعت گوئی شروع کر دی۔ میری نعتوں کی اصلاح ممتاز شاعر مظفر وارثی (مرحوم) نے کی۔ یوں میرا ایک مجموعہ نعت "ردائے نور" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ میری کچھ تالیفات بھی زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ ان میں "تلاش حق کی ڈائری، نعلین مبارک تک، حکمت فروغ کی جلد اول و دوم" شامل ہیں۔ یاایھاالذین آمنو سے شروع ہونے والی 88 آیات قرآنی کی تالیفی تفسیر "دریائے نور" کے نام سے زیر طبع ہے۔ میں ہر ہفتے کے دن اپنی رہائش گاہ پر خواتین کو قرآن اور سیرت النبی کی تعلیم دیتی ہوں۔

میں نے اپنی زندگی میں ہمیشہ حق و انصاف کا علم بلند رکھا۔ اپنی رائے کا اظہار جرأت اور بے باکی سے کیا اور کسی کی ناراضی کی پروا نہیں کی۔ ایک دفعہ اسلامیہ کالج میں محترمہ خدیجہ فیروزالدین لیکچر دینے آئیں۔ وہ بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے لیکچر کے دوران جوش خطابت میں فرما دیا کہ مجھے یوں لگتا ہے یہاں لاہور میں کوئی مومن ہی نہیں۔ یہ سن کر میرے دل میں کھلبلی مچ گئی۔

جب وہ باہر نکلیں تو میں، کنیز فاطمہ اور مس امتیاز ان کے پیچھے گئے۔ ہم نے کہا کہ کیا آپ دلوں کے حال جانتی ہیں؟ آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ یہاں کوئی مومن نہیں؟ وہ تھوڑا سا جھینپا گئیں، پھر گول مول جواب دے کر چلی گئیں۔

ایک دفعہ ایک عورت نے میری موجودگی میں پاکستان کے بارے میں کچھ نازیبا کلمات کہہ دیے۔ پھر کیا تھا میں تو بپھر گئی۔ میرے اندر اسلامیہ کالج کی روح اور جذبہ بیدار ہو گیا۔ میں نے گرج کر کہا "تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟ واپس چلے جاؤ۔ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اس لیے کہ تمھارے بچوں کو اچھا

روزگار مل گیا ہے۔ تمھارے بچے افسر بن گئے ہیں۔"
یہ کہتے ہوئے میری آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ نجانے لوگ آزادی کی نعمت کی قدر کب کریں گے؟

ایک مرتبہ یونیورسٹی میں لیکچرار کی اسامی کے لیے دو امیدوار مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک نے کوئی تحقیقی مقالہ نہیں لکھا تھا دوسرے کے کئی مقالے شائع ہو چکے تھے۔ ایک جسٹس بھی سلیکشن بورڈ کے رکن تھے۔ وہ اس امیدوار کے حق میں دلائل دے رہے تھے جس کا کوئی مقالہ نہ تھا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر خیرات ابن رسا بھی موجود تھے۔ میں نے کہا کہ یونیورسٹی کی شرائط کے مطابق منتخب امیدوار کے کم از کم آٹھ مقالے شائع شدہ ہونے چاہئیں۔ ڈاکٹر محمود نے بھی میرے موقف کی تائید کی۔ اس طرح میں نے غیر مستحق سفارشی امیدوار کو منتخب نہیں ہونے دیا۔

میں نے جو زندگی گزاری اس سے پوری طرح مطمئن اور خوش ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے بے پناہ عنایات سے نوازا۔ میں نے زندگی میں تنگی اور فراخی دونوں دیکھی ہیں لیکن اللہ کے سوا کسی کے آگے اپنا ہاتھ نہیں پھیلایا۔ قرض نہیں لیا۔ اپنی پنشن کا بڑا حصہ ہونہار بچوں کی تعلیم اور غریب بچیوں کی شادی پر خرچ کر دیتی ہوں۔ میں آج بھی والدین سے کہتی ہوں کہ گھر کی اکائی کو درست کرلیں تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ جسم کی پرورش کے ساتھ روح کی پاکیزگی اور ترقی بھی ضروری ہے۔ پاکستانی طالب علموں کو چاہیے کہ مادی علوم کے ساتھ عربی زبان اور قرآن کی تعلیم ضرور حاصل کریں۔ اردو سیکھیں اور سکھائیں اور اس پر فخر کریں۔ وہ قوم گونگی ہوتی ہے جو اپنی زبان میں بات نہ کر سکے اور غیر ملکی زبانوں کو ترجیح دے۔

آخر میں اپنی کتاب "ردائے نور" سے حمد و نعت کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

حمد

اولیٰ خدا کی ذات ہے اعلیٰ خدا کی ذات
واحد ہے لاشریک ہے یکتا خدا کی ذات

قاصر ہیں لفظ سارے ہی اس کے بیان سے
ہر سمت، ہر مکاں سے مبرا خدا کی ذات

موجود ہر جگہ پہ مگر لامکاں ہے
ہر نقش کائنات میں افشا خدا کی ذات

نعت

نبی ﷺ کا آستاں ہے اور میں ہوں
کرم کا سائباں ہے اور میں ہوں

اٹھے جاتے نگاہوں سے ہیں پردے
حجاب ناتواں ہے اور میں ہوں

کہوں اپنی زباں میں نعت کیسے
یہ قرآں کی زباں ہے اور میں ہوں

سمیٹوں کیسے یہ رحمت کے موتی
یہ ظرف ناتواں ہے اور میں ہوں

کہاں جاؤں گی اٹھ کے اب یہاں سے
اماں بے کراں ہے اور میں ہوں

تجرباتِ زندگی

دنیائے طب میں جنم لینے
والی محیرالعقول داستان

کپکپی کا معجزہ

سیکڑوں ٹوٹکے آزمائے کئی معالجین کی
دوا چاٹی مگر شفا بابِ رب کریم کے
در ہی سے نصیب ہوئی
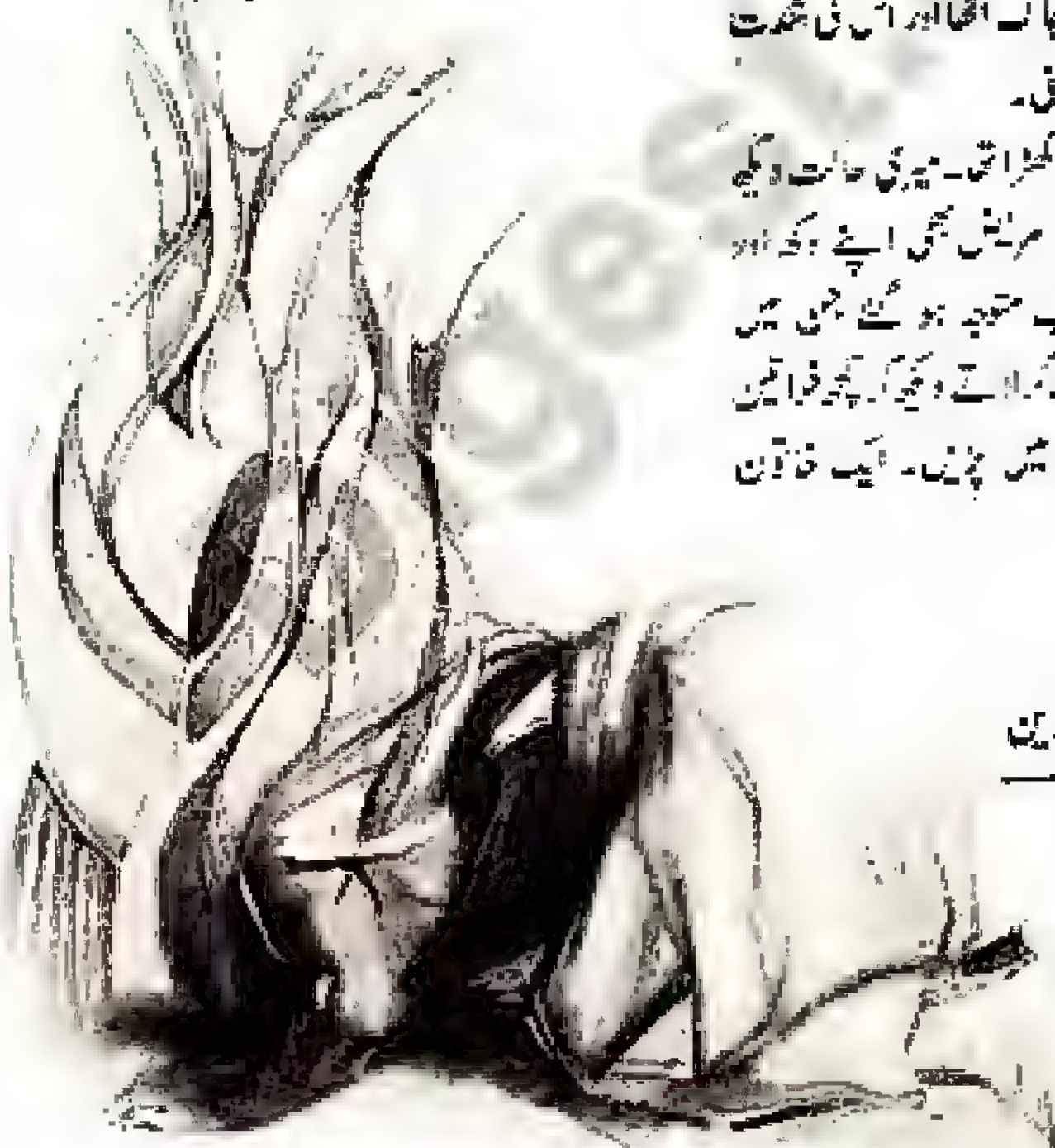
یہ 2011ء کے اوائل کی بات ہے کہ اس قدر تکلیف سے زندگی میں دوسری بار پالا پڑا۔ پہلی مرتبہ گردے کے درد نے تڑپایا اور رلایا تھا۔ دوسری بار کمر درد نے آن دبوچا۔ کلینک کی ڈسپنسری میں کھڑے کھڑے کمر میں درد کی ایسی لہر اٹھی کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ سوچا ڈاکٹر صاحب کو اپنی تکلیف سے متعلق بتاتا ہوں مگر حیرت انگیز طور پر بنا دوائی اور انجکشن کے درد کا احساس ہی نہ رہا۔ کلینک بند کرتے ہوئے بھی خیال نہ آیا جو ڈاکٹر صاحب سے رجوع کرتا۔ دو چار دن خیریت سے گزر گئے۔ پھر اچانک کھڑے کھڑے درد جاگ اٹھا اور اس کی شدت سے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔

ایک مریض قریب ہی کھڑا تھا۔ میری حالت دیکھ کر وہ ڈاکٹر کو بلا لایا۔ باقی مریض بھی اپنے دکھ اور بیماری بھول کر میری جانب متوجہ ہو گئے جن میں اکثریت خواتین کی تھی۔ مجھے کراہتے دیکھ کر کچھ خواتین کی دبی دبی آوازیں کان میں پڑیں۔ ایک خاتون

خالد تقی الدین

دوسری سے کہہ رہی تھی "ہائے بی بی! اللہ نہ کرے انھوں
کچھ ہو۔ بے چارا بڑا چنگا اے۔" ایسے ہی کچھ اور تعریفی
کلمات تھے جنھیں بیان کروں تو "اپنے منہ میاں مٹھو
بننے" والی بات ہوگی۔

ڈاکٹر نے تکلیف کے بارے میں پوچھا۔ تھوڑی
سی ہسٹری لی "کب سے تکلیف ہے؟ چوٹ تو نہیں لگی یا
کوئی وزنی شے اٹھائی ہو؟" میں نے کسی بات پر ہامی نہ
بھری تو ڈاکٹر نے ڈکلوران کا انجکشن اور چپاؤں کی دو
دو گولیاں صبح دوپہر شام کھانے کو دیں اور تاکید کی کہ
بستر پر آرام کریں۔ جھک کر کرنے والے سارے کام
"شجر ممنوعہ" قرار دے دیے گئے حتیٰ کہ نماز بھی کرسی پر
بیٹھ کر پڑھنے کو کہا گیا۔

مسجد میں کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا یہ زندگی میں
پہلا موقع تھا۔ بچپن میں ضعیفوں کو کرسیوں پر نماز پڑھتے
دیکھتا تو ان پر رشک آتا کہ کیسے مزے سے بیٹھے نماز
پڑھ رہے ہیں۔ یہ تو اب پتا چلا کہ وہ مزے میں
نہیں کسی تکلیف کی وجہ سے کرسیوں پر براجمان ہوتے
ہیں۔ تندرستی تو بڑا نعمت ہے...

جیسے ہی نماز سے فارغ ہوا امام مسجد سمیت دیگر
نمازی میرے گرد جمع ہو گئے۔ خیریت ہے "ڈاکٹر
صاحب" کسی کی آواز گونجی۔ میں مسکرایا اور کرسی کا
سہارا لے کر اٹھتے ہوئے کہا بس ذرا ٹانگ میں درد ہے
اور جھکتے ہوئے کمر میں ہونے لگتا ہے۔ "ڈاکٹر بھی بیمار
ہوتے ہیں۔" ایک نمازی نے مذاقاً کہا۔ دوسرا بولا
آپ کے بھائی تو ڈاکٹر ہیں۔ انھیں دکھایا؟ پھر وہاں
موجود نمازیوں نے کئی نسخے اور ٹوٹکے بتا ڈالے۔

"بیڈ ریسٹ" بظاہر بڑا دلفریب اور خوبصورت سا
لفظ ہے۔ لیکن خدا نہ کرے کسی کا اس سے واسطہ پڑے۔

کچھ روز خیر و عافیت سے گزرے تو زندگی پھر
معمول پر آ گئی۔ میں بھلا بیٹھا کہ مجھے کمر درد کی
شکایت ہے۔ شاید یہ انسانی فطرت ہے۔ روزمرہ کے
معاملات پھر اسی معمول سے چلنے لگے۔ اس دوران
ڈاکٹر صاحب نے حال احوال پوچھا تو میں نے سب
اچھا کی نوید سنا دی۔ لیکن چند ماہ بعد پھر وہی تکلیف عود
کر آئی اور اس کی شدت پہلے سے دگنی تھی۔

پھر ایکسرے کرایا تو رپورٹ میں کوئی ایسی بات
نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے ہلکی پھلکی مخصوص ورزشیں، وٹامن کی
گولیاں اور جب درد ہو تو انجکشن تجویز کر دیا۔

درد بھی عجیب قسم کا تھا۔ بیٹھے بٹھائے شروع ہوتا اور
تھوڑی دیر تڑپانے کے بعد بغیر دوائی ٹھیک ہو جاتا۔
تکلیف کے دوران کوئی دوائی یا انجکشن رتی بھر کام نہ
کرتا۔ بیگم اور بیٹے مجھے خوب دباتے مگر تکلیف کی شدت
میں کمی نہ آتی۔ آخر یونہی اللہ کو یاد کرتے کرتے سو جاتا۔

چند ماہ اسی کشمکش میں گزر گئے۔ پھر ایک دن کھانا
کھاتے ہوئے میری زبان دانتوں کے درمیان آ گئی۔
زخم اس قدر گہرا تھا کہ ٹانکے لگوانے پڑے۔ جب ڈاکٹر
نے زبان دیکھی تو کسی گہری سوچ میں پڑ گئے کیونکہ زخم
بالکل وسط میں تھا۔ انھوں نے اس کا تانا بانا کمر کی
تکلیف ہی سے جوڑا۔ پھر ایک دن چلتے چلتے میرے
قدم ڈگمگانے لگے۔ میں پاؤں کہیں رکھتا وہ کہیں اور
پڑتا۔ کبھی ٹانگ بوجھ اٹھانے سے انکاری ہو جاتی۔ فرش
پر بیٹھ کر اٹھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا۔

میں نے یہ کیفیت ڈاکٹر صاحب کو بتائی تو وہ گہری
سوچوں میں غلطاں ہو گئے۔ ان کے چہرے پر تشویش
کے آثار دیکھ کر دل ہی دل میں خوفزدہ ہوا لیکن میں
نے اپنے رب سے ہمیشہ اچھی سوچ اور امید ہی

وابستہ رکھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جیسا گمان رکھو ویسا ہی معاملہ آپ کے ساتھ پیش آئے گا۔ وہ رحیم و کریم ذات اپنے بندے کو مایوس نہیں کرتی۔

جب کسی طرح بیماری قابو نہ آئی تو ڈاکٹر نے "ایم آر آئی" کرانے کا مشورہ دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا خود کو اس تحقیقی ٹیسٹ کے لیے آمادہ کیا۔ غریبوں کے لیے اکثر سرکاری اسپتالوں میں "ایم آر آئی" مشینیں خراب رہتی ہیں یا ڈاکٹر نہیں ہوتے۔ حیران کن اور تکلیف دہ امر یہ ہے کہ اگر کوئی امیر کبیر وزیر کا مشیر یا ڈاکٹروں کا کوئی ماما چاچا آ جائے تو مشین ٹھیک ہو جاتی ہے، ڈاکٹر موجود ہوتے ہیں اور رپورٹ بھی اسی وقت مل جاتی ہے۔

اللہ اللہ کر کے بھائی کی وساطت سے ایک سرکاری اسپتال میں "ایم آر آئی" کرانے کا وقت ملا۔ ڈاکٹر صاحب ساتھ تھے۔ فیس بھی انھوں نے ادا کی جو رعایت کے باوجود چار ہزار کے قریب تھی۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے بلایا گیا۔ کلائی گھڑی، انگوٹھی، موبائل اور جیب میں جو چند سکے تھے وہ سب اتروا اور نکلوا لیے گئے البتہ تن پر کپڑے رہنے دیے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں گھبرا اور شرما رہا تھا کہ شاید مجھے کپڑوں سے بھی آزاد ہونا پڑے گا۔

ایم آر آئی کی مشین کسی بیکری کے تندور جیسی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس میں سے اسٹریچر نما ٹرے باہر نکلی جس پر مجھے لیٹنے کو کہا گیا۔ اس دوران کسی قسم کی جنبش منع تھی۔ جیسے ہی میں اس پر دراز ہوا ٹرے خود بخود اندر سرک چلی گئی۔ یہ جیتے جی قبر کا نظارہ تھا بلکہ اس سے بھی تنگ جگہ تھی البتہ روشنی اور ہوا میسر رہی۔ پل بھر کو لگا کہ منکر اور نکیر ابھی سوال داغیں گے "من ربک، من ربک" مگر خدا کا شکر ہے یہ میرا وہم تھا۔ قبر میں تو ان فرشتوں سے سوال جواب کے لیے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے جبکہ ایم آر آئی کے دوران "مردہ" اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا سوائے دیدے مٹکانے اور مشین کی گڑگڑاہٹ سننے کے کسی بھی قسم کی حرکت ممنوع تھی۔ آٹھ دس منٹ کا یہ دورانیہ انسان کو عجیب حالت سے دوچار کرتا ہے۔ اس لیے موت اور قبر کے مناظر کثرت سے یاد آتے ہیں۔

اس کی رپورٹ ہفتے بعد ملی تھی۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "ایم آر آئی کی رپورٹ کے متعلق میری پروفیسر صاحب سے بات ہو چکی ہے۔ کسی پیر فقیر سے دم کرانا ہے تو کرا لو، حکیم کو دکھانا ہے تو بھی ٹھیک ہے یا کوئی تعویذ یا دھاگا باندھنا ہے تو باندھ لو ورنہ اس کا علاج "آپریشن" ہی ہے۔"

اب میں اس عجیب مخمصے کا شکار ہو گیا کہ آپریشن کراؤں یا نہیں! کبھی کبھی تو جسم مفلوج ہوتا محسوس ہوتا۔ جب درد کی لہر اٹھتی تو یوں لگتا کہ اوپر کا دھڑ دھڑام سے زمین پر گر پڑے گا اور ٹانگیں الگ جا پڑیں گی۔ دراصل میں کئی لوگوں کو جانتا تھا جنھیں ڈاکٹروں نے "چیڑ پھاڑ" کر کے اگلے جہان پہنچا دیا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ اس مرض کا علاج ممکن نہیں مگر دولت کی خاطر مریض کے لواحقین کو جھوٹی تسلیاں دے کر وہ اپنی چاندی کھری کرتے رہے۔

میرا دوست عبدالناصر نیشنل بینک آف پاکستان کی یونین کا فنانس سیکرٹری تھا۔ وہ لاہور کے ایک نامی گرامی "جگر اسپیشلسٹ" کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گیا۔ ناصر کے علاج کا خرچ بینک کے ذمے تھا لہٰذا ڈاکٹر نے مرض کی نوعیت نہیں دو لاکھ کا چیک دیکھا اور میرے دوست کو اپنے اسسٹنٹ کے حوالے کر دیا۔ اس نے چھٹی والے دن شیخ زید اسپتال میں عبدالناصر کے جگر کو بذریعہ کمپیوٹر "چھیڑا" اور میرا

جگری دوست ٹھیک پندرہ دن شدید اذیت میں مبتلا رہنے کے بعد منوں مٹی تلے جا سویا۔

اسی طرح میرے ایک جاننے والے بلو پہلوان نے بھی کمر کا آپریشن کروایا اور پھر اُسے ٹانگوں پر چلنا نصیب نہ ہوا۔ اُس نے باقی زندگی چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دی۔

میرے بے تکلف دوست پروفیسر یونس کے چھوٹے بھائی چودھری نصیر جو بینک آف پنجاب میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے۔ اچانک جگر کے سرطان (کینسر) میں مبتلا ہو گئے۔ پروفیسر صاحب نے چھوٹے بھائی کے علاج معالجے کے لیے پیسا پانی کی طرح بہایا جس نے جو کہا جہاں بھیجا دن رات موسم اور اپنی صحت کی پروا کیے بغیر وہ تنہا یا مریض کو ساتھ لے کر گئے۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر 23 اگست 2000ء کی رات چودھری نصیر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

کئی دن ان کے گھر افسوس کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ کچھ دنوں بعد ان کے ہاں (آل پاکستان شعبہ کینسر) کے سربراہ ڈاکٹر پروفیسر سعید احمد خان تعزیت کے لیے آئے اور شکوہ کیا کہ آپ نے مجھے نصیر کی بیماری کے متعلق بتایا ہی نہیں۔

پروفیسر یونس کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب آپ نے اپنی فیس نہیں لینی تھی اور یہ مجھے کسی طور گوارا نہ تھا۔"

دعائے مغفرت کے بعد پروفیسر یونس نے قدرے سنجیدگی سے ڈاکٹر سعید احمد خان سے کہا "آپ کیوں لوگوں کا پیسا اور وقت برباد کرتے ہیں جبکہ سرطان کا علاج ہے ہی نہیں۔" کیا کبھی کوئی ایسا مریض شفایاب ہوا جسے ڈاکٹری جواب دے دیں؟

ڈاکٹر سعید احمد خان چونکہ پروفیسر صاحب کے بے تکلف دوست تھے لہٰذا یہ سن کر انھوں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہنے لگے ہمارے پاس ایک ایسا ہی مریض آیا تھا جس کی حالت اور رپورٹس دیکھ کر ڈاکٹری نقطۂ نگاہ سے اُس کی زندگی صرف دو ماہ باقی تھی۔ میں نے اُس کے گھر والوں کو یہ کہتے ہوئے جواب دے دیا کہ اسے دوا کی نہیں دعا کی ضرورت ہے۔ ہو سکے تو اس کی ہر خواہش کا احترام کریں۔ وہ بوجھل قدموں سے آنسو بہاتے اپنے مریض کو لے گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

تقریباً دو سال بعد ایک تندرست و توانا شخص مجھ سے ملنے آیا۔ جب اس نے اپنے بارے بتایا کہ میں وہی ہوں جسے آپ نے جواب دے دیا تھا تو میری حیرت کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں نے لپکتے ہوئے پوچھا "کہاں سے علاج کرایا ہے۔" تو اس کا جواب تھا "فلاں بابا جی سے دم کرایا تھا۔" پروفیسر صاحب یہاں آ کر ہماری ڈاکٹری جواب دے جاتی ہے۔

(سبکدوشی کے بعد پروفیسر سعید احمد خان آج کل ایبٹ آباد میں اپنی فیملی کے ساتھ مقیم ہیں۔)

٭٭٭

اسی ادھیڑبن اور کشمکش و پیچ میں زندگی گزرتی رہی۔ کلینک پر مریضوں اور مسجد میں نمازیوں کو اپنا حال بتاتے بتاتے میں چڑچڑا ہو گیا۔ رہی سہی کسر خاندان والوں نے پوری کر دی۔ ہر کوئی مجھے طرح طرح کے "پرخلوص" مشوروں سے نوازتا۔ کوئی کہتا آپریشن نہ کرانا اس میں خطرہ ہے۔ کوئی اپنی آزمودہ دوائیاں استعمال کرنے کی ترغیب دیتا، کوئی کسی اچھے آرتھوپیڈک سے چیک کرانے کو کہتا۔ کچھ نے منفرد قسم

کی ورزشیں بتائیں اور نجانے کیا کیا۔ غرض متعدد ڈاکٹروں کو دکھایا، علاج ہوتا رہا۔ مجھے بھی یہ سب کچھ کرتا گیا کہ آپریشن نہ کرانا پڑے۔ مگر شفا مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔

ایک دن شادی سکے ڈیرے پہ جہاں میں بابا حفیظ کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا، میری بیماری کا تذکرہ چل نکلا۔ کھیل کے دوران حفیظ نے اپنے دوست عظیم کا ذکر کیا کہ اس کی بیوی اور بہن کو فلاں پیر کے دم سے آرام آیا ہے۔

عظیم کو میں بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ موصوف آرکی ٹیکٹ ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ عرب امارات میں محنت و مزدوری کرتے گزارا۔ آج کل ٹھوکر نیاز بیگ کے قریب نواب ٹاؤن میں "الحدید ٹریننگ اسکول" کے روح رواں ہیں۔ یہ اسکول اور پڑھائی سے بھاگے "مجذوبوں" کے لیے بہترین "جائے پناہ" ہے۔ وہاں وہ چند مہینوں میں نہ صرف ٹیکنیکل ہنر سے آراستہ ہوتے ہیں بلکہ گھر والوں کے دلوں میں اپنا کھویا مقام بھی پا لیتے ہیں۔ مستحق طلبہ کے لیے عظیم صاحب دردمند دل رکھتے ہیں۔ یہاں سے فارغ ہونے والا طالب علم بیرون و اندرون ملک باعزت روزگار حاصل کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ اسکول عظیم صاحب کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

بابا حفیظ نے بتایا کہ عظیم کی بیوی مدت سے وہیل چیئر استعمال کر رہی تھی۔ پیر صاحب کے تعویذ اور دم سے بہت بہتر ہے اور اب چھڑی کے سہارے چلتی ہے۔ یہ سن کر میرا تجسس بڑھ گیا کیونکہ ڈاکٹر صاحب بھی مجھے اس بات کی اجازت دے چکے تھے۔ میں پیر صاحب کی کرامات جاننے کے لیے متجسس ہو گیا۔ حفیظ نے بتایا کہ وہ کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔ ہفتے کے چند دن ہی میں فی سبیل اللہ عوام الناس کی خدمت کے لیے مخصوص ہیں۔ بڑی دنیا ان کے پاس آتی ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا، مجھے بھی ٹانگ میں درد رہتا ہے۔ قصہ مختصر یہ طے پا گیا کہ فلاں دن اور فلاں وقت پیر صاحب کے پاس جایا جائے۔

مقررہ دن ہم مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔ یہ "کیلی والی گلی" کے نام سے مشہور تھی۔ پیر صاحب کے ڈیرے کا نقشہ کچھ یوں تھا: پختہ مکان، بڑا سا فولادی دروازہ جس کے دائیں بائیں پلستر والی دیوار پر موٹے موٹے حروف میں کچھ عربی کلمات درج تھے۔ چپس والے فرش اور لکڑی کے شاندار دروازے اور کھڑکیاں۔ اندر داخل ہوئے تو بیسیوں سائل پچھی دریوں پر بیٹھے تھے۔ یہ پیر صاحب کا گیراج تھا جہاں دریاں بچھا کر سائلوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہم بھی انہی میں شامل ہو گئے۔

سامنے ڈرائنگ روم نما کمرے میں پیر صاحب اپنی مخصوص کرسی پر براجمان تھے۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے پیر کے بجائے کسی فلمی ہیرو نظر آئے۔ عمر کوئی پچاس کے پیٹے میں تھی۔ خوش لباس، وجیہہ چہرہ، گھنگھریالے بال، داڑھی ندارد، سجتی ہوئی مناسب مونچھیں، گلے میں سونے کی چین اور ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ۔ ..

پیر جی کی بائیں جانب فرش پر بوسیدہ سے کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی بہ حیثیت معاون براجمان تھا۔ وہ ہر سائل کو بیس روپوں کے عوض ڈیڑھ لیٹر والی منرل کی بوتل میں بھرا پانی اور ماچس فراہم کرتا۔ کبھی پیر جی کا سگریٹ ختم ہونے پر نیا سگریٹ سلگا کر دیتا۔ دائیں ہاتھ والا مددگار پہلے سے تحریر شدہ تعویذ قینچی سے کاٹ کاٹ کر ترتیب سے رکھ رہا تھا۔

یہ کمرا خواتین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جن میں دیہاتی عورتیں نمایاں تھیں البتہ دو چار فیشن ایبل بھی نظر آئیں۔ کچھ بیمار اور لاچار بھی تھے۔

پیر صاحب کے پیروں میں دودھ کے چھوٹے چھوٹے ڈبے اور ایک شیشے کا گلاس پڑا تھا۔ بائیں ہاتھ والا معاون پیر کے اشارے پر گلاس میں پانی ڈالتا اور پیر صاحب اس میں ڈبے کا تھوڑا سا دودھ ملا کر پانی کی رنگت دودھیا کر دیتے۔ یہ محلول سائل کو دم کرنے کے دوران اس پہ زوردار چھینٹوں کی صورت پھینکا جاتا۔ پیر صاحب کا دم کرنے کا طریقہ منفرد عجیب وغریب اور دلچسپ تھا۔

باری آنے پر پریشان حال غرض مند پیر صاحب کے سامنے بچھی چٹائی پر جا بیٹھتا۔ پیر صاحب آنے کا سبب پوچھتے۔ پھر اسے منہ کھولنے کو کہتے۔ جیسے ہی وہ ایسا کرتا یا کرتی' پیر صاحب سفید کورے کاغذ کی لمبی سی چٹ اس کے منہ میں ڈال کر کہتے "زور سے منہ بند کر لو۔" سائل منہ بند کرتا تو پیر صاحب آنکھیں موند کر کچھ پڑھتے ہوئے سر یوں گھماتے جیسے کوئی مست ڈھول کی تھاپ پر گھماتا ہے۔ پھر سر کو اوپر نیچے زوردار جھٹکے دیتے۔ یہ نہایت ہی مضحکہ خیز منظر تھا۔ میں نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی اور خوب بنا کن انکھیوں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

اسی دوران ایک صاحب مٹھائی کا ڈبا لے کر وارد ہوئے۔ سائلوں کو چیرتے ہوئے مٹھائی پیر صاحب کے چرنوں میں رکھ ایک چٹھی دے کر چلے گئے۔ پیر صاحب نے ڈبا ایک طرف رکھا اور چٹھی کھول کر پڑھنے لگے۔ میرا خیال تھا شاید پیر صاحب مٹھائی بھی تقسیم کریں گے لیکن وہ خیال ہی تھا۔ پھر ہلکا سا مسکرا کر بولے "یہ جو صاحب مٹھائی دے کر گئے ہیں' ان کی بیوی کا زچگی سے چند روز قبل سے بی پی ترچھا ہو گیا تھا۔ بقول ڈاکٹروں کے زچہ و بچہ میں سے کسی ایک کی جان جا سکتی تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں میرے پاس آیا اور اس مسئلے کا ذکر کیا۔ میں نے اسے تعویذ اور دم والا پانی پینے کو دیا تو اللہ تعالیٰ نے مہربانی کر دی۔ یہ صاحب بتانے آئے تھے کہ بچہ نارمل پیدا ہوا ہے اور زچہ و بچہ خیریت سے ہیں۔"

اب پیر صاحب نے منہ میں رکھی پرچی کھینچ لی جس پر سائل کا لعاب لگنے سے کچھ نقش و نگار بن گئے تھے۔ پیر صاحب نے پرچی کو ایکسرے کے مانند گھورتے ہوئے "ہوں ہاں" کی اور خلا میں شہادت کی انگلی کے اشارے سے مربع نما زائچہ کھینچا اور اس زائچے میں ایسے غور سے دیکھنے لگے جیسے ٹی وی دیکھ رہے ہوں۔ پھر سائل کو چند تعویذ دیتے ہوئے کہا کہ ابھی باہر جا کر انھیں جلاؤ۔ جب راکھ بن جائے' تو انھیں جوتے مار کر واپس آؤ۔ پیر صاحب کے معاون نے سائل کو ماچس دی اور وہ چند منٹوں میں تعویذ جلا کر واپس آ گیا۔

پیر صاحب نے پھر اسی زور سے گردن گھماتے ہوئے سر کو جھٹکے دیے اور دائیں جانب پیروں میں پڑے کالے دھاگے کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے اسے گرہیں لگانے لگے۔ جب گیارہ گرہیں لگا چکے تو دھاگا اپنے منہ میں ڈال کر ہلکا ہلکا چبانے اور کچھ پڑھنے لگے۔ پھر خلا میں گھورا اور یوں "ہوں ہاں" کی جیسے پریشانی یا بیماری کی وجہ سمجھ گئے ہوں۔ پھر سائل کو قریب بلا کر یہ کہتے ہوئے دھاگا اس کے گلے میں باندھ دیا کہ اسے کسی حالت میں اتارنا نہیں۔

دھاگا بندھوا کر جیسے ہی سائل چٹائی پہ بیٹھا پیر صاحب نے خالی گلاس اپنے معاون کی جانب بڑھایا۔ اس نے تھوڑا سا پانی گلاس میں ڈالا تو پیر

صاحب نے ڈبے کا تھوڑا سا دودھ گلاس میں انڈیلا تو دودھیا محلول تیار ہو گیا۔ پھر اس محلول کو ہتھیلی میں بھر کر بسم اللہ بسم اللہ کی گردان الاپتے سائل کے دائیں بائیں کندھوں پیر نے سینے اور جس جگہ تکلیف تھی وہاں زور زور سے چھینٹے مارے۔ وہ بیچارا پانی اور شرم سے شرابور ہو گیا۔ یہ تو شکر ہے کہ گرمیوں کا موسم تھا اگر دسمبر یا جنوری کا مہینا ہوتا تو ڈبل نمونیا سائل کا مقدر بن جاتا۔

اس مرحلے سے فارغ ہو کر پیر صاحب نے کچھ تعویذ کھانے اور دم کیا ہوا پانی پینے کو کہا جو معاون صاحب لیے بیٹھے تھے۔ جب معاون سے رجوع کیا تو اس نے تین روپے کا تقاضا کیا کہ یہ میرا خرچہ پانی ہے جو ہر سائل خوشی سے دیتا کہ یہ کوئی خاص رقم نہیں تھی۔

میں اور بابا حفیظ بھی انہی مراحل سے گزرے۔ بھیگے کپڑوں اور پانی پانی ہوتے ہوئے تین تین روپے ادا کر دم والا پانی اور تعویذ لے کر گھر کو لوٹے۔ البتہ پیر صاحب نے مجھے یہ کہتے ہوئے درد والی جگہ پر غور کرنے کی ہدایت کی کہ آپ تو میڈیکل لائن سے تعلق رکھتے ہیں۔ موٹے کپڑے کی پوٹلی میں ریت اور نمک برابر مقدار میں ملا کر اسے توے پر گرم کریں اور اس جگہ سینک دیں۔ ہفتے بعد پیر صاحب نے پھر آنے کو کہا... لیکن چونکہ تعویذ اور پانی نے رتی بھر بھی کام نہیں کیا تھا اس لیے ہم نے دوبارہ اتنی دور جانے کا کشٹ نہیں کیا۔

میں اسی تکلیف میں موٹر سائیکل پر بچوں کو اسکول چھوڑنے جاتا رہا۔ یوں کہہ لیں کہ شادی کے چند برسوں بعد سے بچوں کی چاکری کر رہا ہوں اور اس مشقت کا صلہ مجھے اللہ تعالیٰ نے کچھ یوں عطا فرمایا کہ منجھلے بیٹے افنان نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔ میری خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا کہ اللہ نے مجھے حافظ قرآن کا باپ ہونے کا شرف بخشا۔ یہ بڑے کرم کی بات تھی جو مجھ گناہ گار کو یہ مقام نصیب ہوا۔ وہ چار دن ہی گزرے تھے کہ رمضان المبارک کا بابرکت مہینا آ گیا۔ چند روز قبل قاری نگزیب صاحب کا فون آیا کہ حافظ افنان کو لے کر فوراً میرے پاس آ جائیں۔ یہ اقرا الحسن اطفال کے منتظم اور افنان کے اُستاد بھی تھے۔

سلام دعا کے بعد کہنے لگے "ہم افنان کو سامع بنانا چاہتے ہیں۔" جلد ہی معاملہ طے پا گیا۔ رمضان سے ایک روز پہلے میں اپنے بیٹے حافظ افنان کے ساتھ پہلی صف میں کھڑا تراویح پڑھ رہا تھا۔ میں یہ بھول گیا کہ ڈاکٹر نے مجھے جھکنے سے منع کیا ہوا ہے۔ کلام الٰہی کی برکت تھی جو میں نے بنا کسی تکلیف کے بیس تراویح کھڑے ہو کر پڑھی۔

دوران نماز جب سامع افنان نے تراویح پڑھانے والے حافظ بلال کی اصلاح کی تو بے اختیار میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور پورے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے بیٹے کو اس قابل کیا ہے۔۔۔ یہ لمحہ برکت اور شفا سے بھرپور "کپکپی" تھی کہ میری ریڑھ کی ہڈی کے مہروں میں دبے ہوئے چھلے اور ڈسک اپنی اصل جگہ پر آ گئے۔ وہ دن اور آج کا دن میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بغیر آپریشن کے ٹھیک ٹھاک ہوں۔ ایم آر آئی کی رپورٹ تیار کرنے والے پروفیسر اب بھی حیران ہیں۔

یہ درست ہے کہ دنیا میں کئی "بابے" کسی لالچ کے بغیر بھی عوام الناس کی خدمت کر رہے ہیں لیکن میری خوش قسمتی یہ ہے کہ مجھے شفا کائنات کے تمام "بابوں" کے آقا... رب دو جہاں کی عنایت سے نصیب ہوئی۔

◆◆◆

درانی سلطنت کے وارث شاہ شجاع کی افغانستان کے تخت کی بازیابی کے لیے آخری کوشش

گریٹ گیم میں روسی سفارت کاروں نے برطانوی سفارت کاری کو کیسے شکست دی؟

لارڈ آک لینڈ نے طاقتور امیر دوست محمد خان کے مقابلے میں جلاوطن اور کمزور شاہ شجاع کی مدد کیوں کی؟
دیکھیے رنجیت سنگھ کی شخصیت کے دلچسپ پہلو بے نقاب پڑھیے تیز طرار جنول امیلی اور شیفی کے دلچسپ تبصرے

پچھلی اقساط کی تلخیص: افغانستان پاکستان کا شمالی ہمسایہ ملک ہے۔ یہ کوہ ہندوکش کی برف پوش چوٹیوں اور پہاڑی دروں کے درمیان پہاڑی میدانی اور صحرائی خطوں پر مشتمل ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً 252000 مربع میل ہے اور وسطی ایشیا، جنوبی ایشیا اور مشرقی ایشیا کے سنگم پر واقع ہے۔ اس کی آبادی تین کروڑ ہے جو تاجک، ازبک، ہزارہ، ترکمانی اور پشتون قبائل پر مشتمل ہے۔ یہاں قبائل کے درمیان خون کے جھگڑے اور لڑائیاں ہوتی رہتی اور جنگجو سرداروں کے درمیان اتحاد بنتے ٹوٹتے رہتے ہیں۔ محل وقوع کے اعتبار سے عالمی سیاست پر افغانستان کی اہمیت منفرد ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں افغانستان عالمی استعماری طاقتوں روس اور برطانیہ کے درمیان سرد جنگ کا میدان بن گیا اور ہر ایک نے اپنے اپنے مقاصد کے لیے اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔

1747ء میں احمد شاہ ابدالی نے درانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس میں موجودہ افغانستان، پشاور، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور کشمیر کے علاقے شامل تھے۔ احمد شاہ ابدالی کا تعلق سدوزئی قبیلے سے تھا۔ 1772ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا۔ 1793ء میں تیمور شاہ کے انتقال کے بعد اس کے چوبیس بیٹوں میں جانشینی کی لڑائی چھڑ گئی۔ چناں چہ شاہ زمان، شاہ محمود اور شاہ شجاع نے یکے بعد دیگرے اقتدار سنبھالا۔ شاہ شجاع نے 1803ء سے 1809ء تک افغانستان پر حکومت کی۔ پھر اس کے سوتیلے بھائی شاہ محمود نے سدوزئی مخالف قبیلے بارک زئی سے مل کر شاہ شجاع کو نملہ کی لڑائی میں شکست دی اور تخت سے محروم کر دیا۔ شاہ شجاع چند غدار ساتھیوں کی وجہ سے گرفتار ہو گیا اور کشمیر کے گورنر کی قید میں رہا۔ شجاع کی بیوی وفا بیگم سدوزئی حرم اور بچوں کے ساتھ لدھیانہ میں انگریزوں کی عملداری میں پناہ لے چکی تھی۔ اس نے پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ سے مذاکرات کر کے شاہ شجاع کو کشمیر سے رہائی دلوائی لیکن اس کے بعد رنجیت سنگھ نے اس کو لاہور میں نظر بند کر دیا۔ دوران حراست اس کو سخت اذیتیں اور مصائب برداشت کرنے پڑے۔ اس کے بیٹے کو اس کے سامنے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کا سب قیمتی ساز و سامان لوٹ لیا گیا۔ بالآخر شجاع نے اپنی جیب سے کوہ نور ہیرا اس کے حوالے کر دیا۔ پھر بھی اس کو رہائی نہ ملی۔ مجبوراً شجاع نے اپنے وفادار ملازموں کی مدد سے ایک سرنگ کھودی اور اس کے راستے لاہور سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ رہائی کے بعد وہ لدھیانہ میں انگریزوں کے مہمان کے طور پر اپنی بیوی وفا بیگم سے جا ملا۔

تیس سالہ جلاوطنی کے دور میں شجاع نے تین مرتبہ اپنا تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پہلی مرتبہ اس نے کچھ فوج اکٹھی کر کے کشمیر پر حملہ کیا لیکن دشوار گزار موسم اور دشوار گزار راستے کی وجہ سے ناکام رہا۔ دوسری مرتبہ اس نے پھر وفا بیگم کے زیور جواہرات کی مدد سے فوج بھرتی کی اور سندھ کے راستے قندھار پر حملہ آور ہوا لیکن بارک زئی حکمرانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس کی فوج تباہ ہو گئی اور خود اسے بھاگ کر اپنی جان بچانا پڑی۔ تیسری مرتبہ اس نے انگریزوں اور رنجیت سنگھ کے ساتھ ملی بھگت کے ذریعے پشاور پر قبضہ کر لیا لیکن اپنے غیر ضروری تکبر اور شاہانہ رویے کی وجہ سے اپنے اتحادی سرداروں کی ہمدردیاں کھو بیٹھا اور ایک مرتبہ پھر اس کو لدھیانہ میں پناہ لینا پڑی۔

شاہ شجاع اپنے کھوئے ہوئے تخت کی بازیابی کے لیے چوتھی اور آخری مرتبہ انگریزوں کی انڈس آرمی کے ہمراہ افغانستان پہنچا۔ افغانستان پر بالادستی حاصل کرنے کی گریٹ گیم (Great Game) میں روس نے برطانیہ کو سفارتی شکست دے دی۔ اور افغانستان کے طاقتور امیر دوست محمد خان سے سفارتی اور فوجی معاہدے کر لیے۔ جواب آں غزل کے طور پر ہندوستان کے برطانوی گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ نے فوجی قوت کے بل بوتے پر جلاوطن شاہ شجاع کو کٹھ پتلی بادشاہ کے طور پر افغانستان کے تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ چناں چہ 1838ء میں شاہ شجاع اور برطانیہ کی انڈس آرمی کی مشترکہ مہم جوئی کا آغاز کیا گیا۔

جولائی 1838ء میں میک نیگٹن نے لدھیانہ میں شجاع سے ملاقات کی۔ میک نیگٹن شجاع کی شاہانہ شخصیت، وقار اور لمبی سیاہ ڈاڑھی سے بہت متاثر ہوا۔ شجاع کو اپنے ذرائع سے ساری کارروائی کا علم ہو چکا تھا اور وہ ایک کٹھ پتلی حکمران کا درجہ دیے جانے پر ناخوش تھا۔ اس کو یہ شکایت تھی کہ اس سارے منصوبے میں اس کے ساتھ کوئی مشورہ کیوں نہیں کیا گیا۔ نیز وہ رنجیت سنگھ کو خراج ادا کرنے پر بھی آمادہ نہ تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے شجاع اور اس کے بیٹے کو اذیت کا نشانہ بنایا تھا اور اس کی سب سے قیمتی متاع کوہ نور بھی اس سے ہتھیا لیا تھا۔ میک نیگٹن نے شاہ کو مختصراً منصوبے سے آگاہ کیا۔ وہ سکھوں کی طرح سودا بازی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے اس کے پاس اس منصوبے کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ میک نیگٹن نے اسے مختصراً افغانستان کی حدود بتائیں جس کا حکمران وہ بننے والا تھا۔ اس نے انگریزوں سے کچھ یقین دہانیاں حاصل کیں۔ یہ کہ وہ اس کے خاندان اور ملکی معاملات میں اس کی منظوری کے بغیر دخل اندازی نہیں کریں گے۔ یہ کہ فتح کے بعد اس کو افغانستان کی تعمیر نو اور حکومت کی مضبوطی کے لیے مالی امداد دی جائے گی۔ معاہدے میں یہ شق بھی شامل تھی کہ ایک علاقے سے بھاگ کر دوسرے علاقے میں جانے والی لونڈیاں اور خادمائیں کو واپس لوٹایا جائے گا۔ اس کو یہ یقین دہانی بھی کروائی گئی کہ اس کو برطانوی دستوں کے عقب میں چلنے کے بجائے اپنے دستوں کے ساتھ ان کی قیادت کرتے ہوئے افغانستان میں داخل ہونے کا اعزاز دیا جائے گا۔ آخر میں یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ اس کو ماضی کی طرح اپنی فوج کو منظم کرنے اور تربیت دینے کے لیے اضافی رقوم دی جائیں گی۔ اس معاہدے کو "اتحاد ثلاثہ" کا نام دیا گیا۔ شاہ شجاع چوتھی مرتبہ اپنے تخت کی بازیابی کے امکان پر جنگ نامہ کے مصنف کے الفاظ میں کہتا ہے۔ (ترجمہ)

بارک زئی کے تعاقب کا وقت آ گیا
اب وہ میرا زندہ شکار بنے گا
گردن میں اس کی ڈالوں گا پھندہ آج
لوں گا اس سے واپس اپنا تخت و تاج
بچ نہ پائے گا میری شمشیر آبدار سے
بھاگے گا تاج چھوڑ کے میدان کارزار سے

شملہ میں اپنے قیام سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایملی اپنے خط میں رقمطراز ہے: "شملہ کا موسم انتہائی سکون بخش ہے۔ ہم مختلف لوگوں کو ڈنر پہ بلاتے ہیں اور بعض اوقات ڈانس کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہم نے تفریح کی ایک عمدہ ترکیب بھی ایجاد کر لی ہے۔ یہاں ایک پہاڑی پر ہمارا بینڈ ہفتے میں ایک دن بجایا جاتا ہے اور ہم ساتھیوں کو آئس کریم اور مشروبات بھیجتے ہیں۔ یہ ایک کم خرچ بالانشین اجتماع ہوتا ہے۔"

ایملی پریشان ہوتی ہے کہ ان کے خطوط کی انگلستان آمد و رفت بہت سست اور غیر یقینی ہے۔ وہ لکھتی ہے: "ہم نے ہر قسم کے منصوبے آزمائے لیکن پہلے موسم سرما نے ایک اسٹیمر کو ناکارہ کر دیا اور دوسرا ہمارے تمام خطوط جن کو ہم سمجھتے تھے کہ انگلستان پہنچ چکے ہیں، واپس لے آیا۔ پھر ہم نے ایک عرب جہاز کے ذریعے خطوط بھجوائے لیکن ہم ہمیشہ محسوس کرتی

بڑے بیٹے پرنس تیمور کی قیادت میں کرنل ویڈ کی مدد کے ساتھ اور رنجیت سنگھ کے مہیا کردہ پنجابی مسلمانوں کی رجمنٹ کے ہمراہ پشاور سے درہ خیبر کے راستے جلال آباد پہنچے گی۔

دوسری نسبتاً بڑی فوج کمپنی کے بنگال اور بمبئی کے فوجی دستوں کے ہمراہ میک نیگٹن کی زیر نگرانی اور شاہ شجاع کی قیادت میں درہ بولان سے گزر کر قندھار کے قریب جنوبی افغانستان پر حملہ آور ہو گی۔ بالآخر دونوں فوجیں کابل میں اکٹھی ہوں گی اور بالا حصار میں شجاع کو تخت پر بحال کیا جائے گا۔ ویڈ نے آک لینڈ کو یقین دلایا تھا کہ بہت سے افغان قبائلی سردار شجاع کے ساتھ اتحاد کر لیں گے اور غاصب دوست محمد کو باہر نکال پھینکیں گے۔

منصوبہ نہایت عمدہ تھا لیکن اس پر عملدرآمد میں کئی مشکلات تھیں۔ شملہ منشور میں کہا گیا تھا کہ شجاع اپنے فوجی دستوں کی قیادت کرتے ہوئے وطن واپس جائے گا لیکن شجاع کے پاس گھریلو ملازمین کے علاوہ اپنا ایک بھی فوجی نہ تھا۔ اس لیے پہلا کام شجاع کی اپنی نئی فوج کو بھرتی کرنے کا تھا۔ 1838ء کے موسم گرما کے دوران لدھیانہ میں فوج کی بھرتی جاری رہی۔ لیکن کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا کے مصداق میلے کچیلے، غیر منظم افراد کا یہ ہجوم عوام کے سامنے فوجی پریڈ کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اور یہ حقیقت چھپائی نہیں جا سکتی تھی کہ ان میں ایک بھی افغان نہیں تھا۔ اس لیے شجاع کو اپنے دستے کے ساتھ باقی فوج سے پہلے ہی خاموشی سے شکار پور کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ اس فوج نے سندھ پہنچ کر لاڑکانہ شہر کو لوٹ لیا۔ اس حرکت نے شجاع کی گزشتہ مہم کے دوران سندھیوں کے ساتھ ظلم و تشدد اور زیادتی کی یادوں کو تازہ کر دیا۔ سندھ کے امرا غضب ناک ہو گئے اور انھوں نے ہر قسم کی مدد اور تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ایک اور المیہ یہ ہوا کہ جب کمپنی کے فوجی دستے بمبئی سے کراچی پہنچے تو سندھ کے اتحادی امرا کی طرف سے توپوں کی سلامی کو حملہ سمجھ بیٹھے اور جواباً ساحلی قلعے کو مسمار کر دیا۔

ایک اور بدشگونی یہ ہوئی کہ طویل جلاوطنی اور مصائب نے شجاع کی نیک فطرتی اور خوش مزاجی میں بگاڑ پیدا کر دیا تھا۔ چناں چہ اس نے اپنی بدمزاجی اور غرور کی وجہ سے تمام برطانوی افسروں سے لڑائی جھگڑا کیا اور اصرار کیا کہ اس کی موجودگی میں سب لوگ تعظیماً کھڑے رہیں۔ مزید برآں اس نے اپنے متوقع افغان عوام کو "کتوں کا غول" قرار دے دیا۔ اس پر میک نیگٹن نے کہا کہ ہم اس کو سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ وہ آئندہ معقول رویہ اختیار کرے۔ اس اثنا میں لدھیانہ میں پرنس تیمور نے بالکل کوئی تیاری نہ کی۔ شجاع نے شکار پور سے ویڈ کو لکھا کہ پرنس اتنا احمق ہے کہ اس نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت نہیں کی۔

چناں چہ فیروز پور سے انگریز اور ہندوستانی فوج کو رخصت کرنے کے لیے شاہ شجاع کے بجائے مون سون کے بارشی موسم میں آک لینڈ کو شملہ سے وہاں آنا پڑا۔ فینی نے خط میں تحریر کیا "کل ہم نے میجر ویڈ کے ہاں شاندار ڈنر کیا۔ شہر کو برقی قمقموں کی طویل قطاروں سے سجایا گیا تھا۔ میک نیگٹن جو شائستہ آداب کا اتنا خیال رکھتا ہے اپنا پلیٹوں اور کٹلری کا سیٹ کہیں راستے میں گم کر بیٹھا تھا اس وجہ سے کیمپ پر دہشت کی فضا طاری تھی۔ شاہ شجاع جو انگلیوں سے کھانا کھاتا ہے کیا سوچے گا اگر وہ میک نیگٹن کو بھی اسی طرح کھاتے ہوئے دیکھے؟"

مون سون کی بارشوں اور کیچڑ میں بمبئی سے روانہ ہونے والی ایک رجمنٹ کی قیادت ولیم ہاٹ کر رہا تھا جو ویلز کے ایک معمولی کسان کا بیٹا تھا۔ وہ چالیس سال قبل ہندوستان آیا تھا اور آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہوا کمپنی کے ایک سینئر جرنیل کے عہدے تک پہنچا تھا۔ وہ اور اس کے سپاہی دہلی کے فوجی اڈے سے روانہ ہوئے جہاں اس نے بیس سال تک اپنی محبوب بیوی لیتھیا کو ابھی دفن کیا ہی تھا۔ سڑک پر فوجی دستے، توپیں، گاڑیاں، گولہ بارود اور خزانہ عازم سفر تھے۔ راستے میں چوروں ڈاکوؤں سے بچ کر جنگی ساز و سامان کو منزل تک لے جانے میں آدمیوں اور گھوڑوں کو بہت حوصلے اور صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ جہاں جوان اُمید کر رہے تھے کہ جنگ ان کے لیے شان و شوکت، ترقی اور مال غنیمت لائے گی، ناٹ صرف یہ امید کر رہا تھا کہ مہم اس کے غم کو بھلانے میں مدد دے گی۔ اس نے لندن میں اپنی بیٹیوں کے نام خط میں لکھا ”میں نے ان دنوں کے بارے میں سوچتے ہوئے ایک اذیت ناک رات گزاری جن سے میں محبت کرتا ہوں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جنگ نے کسی حد تک مجھے سکون دیا ہے۔“ پھر اس نے صفحے کے کنارے پر لکھا ”انسان اپنے ساتھی انسانوں کو تباہ کرنا کب بند کرے گا؟“

دوسری رجمنٹیں اپنی بیرکوں سے نکل کر ساحل سمندر پر کھڑے جہازوں کی طرف جا رہی تھیں جو طوفانی سمندر میں سفر کر کے ان کو کراچی، ٹھٹھہ اور دریائے سندھ کے دہانے پر دوسرے مقامات تک لے جانے کے لیے تیار تھے۔ اونٹ سوار اپنے خود سر اونٹوں پر تجرباتی توپوں، گولوں اور راکٹوں کو لادنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ ہانسی میں کرنل جیمز سکنر ہریانہ کے سیلاب زدہ علاقوں سے فاضل فوجی جوانوں کو حاضر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرٹھ اور رڑکی کی چھاؤنیاں کیچڑ میں لت پت تھیں۔ جب کمپنی کے سپاہیوں اور افسروں نے اپنے بوریا بستر سمیت کرنال اور فیروز پور جانے والی جی ٹی روڈ پر سفر شروع کیا تو ان کی بیویاں اور محبوبائیں ان کے پیچھے پیچھے دلدلی کیچڑ میں رواں دواں تھیں۔ جب انڈس آرمی نومبر کے شروع میں فیروز پور کے میدانوں میں جمع ہونا شروع ہوئی تو بارشیں رک چکی تھیں۔ ہر کوئی خوش تھا۔ رنجیت سنگھ نے کیمپ کی آرائش کے لیے تھے سو باغبان بھیجے تاکہ وہ گملوں میں اگائے ہوئے گلابوں سے افسروں کے خیموں کو گلستانی ماحول فراہم کریں۔

فوجوں کے اجتماع اور جنگی تیاریوں کے شور میں آک لینڈ کے لیے صورت حال پریشان کن ہو گئی جب برطانوی بحری بیڑے کی خلیج فارس میں آمد اور کھارگ کے جزیرے پر قبضے کے بعد خوفزدہ ایرانی ہرات کا محاصرہ ترک کر کے مشہد تک پسپا ہو گئے۔ ادھر برطانوی وزیراعظم نے روسی حکومت پر دباؤ ڈالا جس کے نتیجے میں ایران اور کابل میں روسی سفیروں کو واپس بلا لیا گیا۔ روس اور ایران افغانستان کی حمایت سے علانیہ طور پر دستکش ہو گئے۔ آک لینڈ کے لیے افغانستان پر فوری حملے کا باعث بننے والے دونوں خطرات ختم ہو گئے تھے۔ یہ ایک عمدہ لمحہ تھا جب دوست محمد سے مذاکرات کی تجدید کر کے کوئی گولی چلائے بغیر تمام برطانوی مقاصد حاصل کیے جا سکتے تھے۔ لیکن کسی نے بھی اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس کے بجائے ان کو یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ انھیں افغانستان میں روسی یا ایرانی فوج کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ آک لینڈ نے

اعلان کیا کہ وہ اپنے موجودہ منصوبے پر پوری طاقت کے ساتھ عمل کرے گا اور اتحاد ثلاثہ کے معاہدے کے مطابق افغانستان کے جائز حکمران کو اس کے آباؤ اجداد کے تخت پر بحال کیا جائے گا۔

27 نومبر کو سکھ اور کمپنی کی افواج فیروزپور کے میدانوں میں جمع ہو گئیں۔ یہ ایک بہت بڑا فوجی اجتماع تھا۔ گورنر جنرل کی پندرہ ہزار سپاہیوں کی حفاظت میں شاہانہ موجودگی پنجاب کے مہاراجا سے کسی طرح کم ہیبت ناک نہیں تھی۔ ایملی اس پرشکوہ منظر سے مکمل طور پر مرعوب ہو جاتی ہے۔ وہ رقمطراز ہے "ہمارے عقب میں ہمارے کیمپ کے ہاتھی بہت بڑے دائرے میں کھڑے تھے۔ ان کے سامنے رنجیت سنگھ کے ہزاروں گھڑسوار موجود تھے جو زرد اور سرخ ساٹن میں ملبوس تھے اور ان کے ساتھ بے شمار سجے سجائے گھوڑے تھے۔ میں نے حقیقتاً اتنا روشن اور خیرہ کر دینے والا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تین چار سکھ سرکس کے کردار معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ان کا یہ بڑا ہجوم مضحکہ خیز ثابت نہیں ہوا اور انھوں نے اپنی شان و شوکت کو برقرار رکھا۔ افغان جنگ کے مؤرخ سرجان کے مطابق "آک لینڈ اور رنجیت سنگھ کی پہلی ملاقات ناقابل بیان شور و شغب اور ہنگامے کے درمیان ہوئی۔ ہاتھیوں کی دو قطاروں کی چنگھاڑوں اور دونوں راہنماؤں کے تعاقب میں دربار شاہیانہ تک بھاگ دوڑ نے عجب افراتفری پیدا کر دی۔ بہت سے سکھ فوجیوں کو شک پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ ان کے راہنما کو قتل کرنے کی سازش تو نہیں اور انھوں نے وحشیانہ بداعتمادی کی کیفیت میں اپنے ہتھیار سیدھے کر لیے۔ رنجیت سنگھ کی استقبالیہ تقریر کے جواب میں لارڈ آک لینڈ نے خوش آمدید دھوم دھام سے خوش ہو کر پرجوش خطاب کیا اور دونوں کی متحدہ افواج کو دنیا کا فاتح قرار دیا۔" فینی نے انگلستان میں اپنی بہن کو خط میں لکھا "تم وہ منظر دیکھ کر ہکا بکا رہ جاتیں جب وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہے تھے۔"

اس رات کے کھانے پر فینی رنجیت سنگھ کے ساتھ بیٹھی تھی اور وہ اپنے ساتھی کی سحرانگیز شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ وہ سفید کرتا پاجامہ میں ملبوس تھا۔ اس کے بازو پر واحد کوہ نور ہیرا جھلملا رہا تھا۔ شاید یہ اس موقع کے لیے اتنا موزوں نہیں تھا کیونکہ یہ سب جانتے تھے کہ اس نے اسے کیسے حاصل کیا تھا۔ سکھ مہاراجا نے اس شام

زیادہ وقت فینی کو اپنی کشید کردہ دیسی شراب پلانے میں صرف کیا۔

"وہ جس مشروب کو شراب کہتا ہے وہ جلتی ہوئی آگ جیسی ہے اور برانڈی سے زیادہ تیز ہے۔" فینی نے بعد میں تحریر کیا۔ "شروع میں تو وہ جارج اور سر ڈبلیو کاٹن کو پلا کر ہی مطمئن تھا۔ پھر اس نے سونے کے کپ بھر بھر کے مجھے پلانے شروع کر دیے۔ کچھ دیر میں برداشت کرتی رہی یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں پی رہی ہوں اور اس کے خدمت گار کو کپ پکڑا رہی ہوں۔ لیکن اس کو شک ہو گیا۔ اس نے کپ اپنی ایک آنکھ کے قریب کیا، اس کے اندر اچھی طرح دیکھا، سر نفی میں ہلایا اور کپ دوبارہ مجھے واپس دے دیا۔ اگلی دفعہ اس نے کپ کے اندر انگلی ڈال کر دیکھا کہ کتنی شراب پی گئی ہے۔ میں نے میجر ویڈ کے ذریعے وضاحت کروائی کہ انگلستان میں خواتین زیادہ شراب

نوٹس نہیں کرتیں۔ اس پر اس نے انتظار کیا جونہی جارج نے سر دوسری طرف موڑا اس نے اپنے بازو کے نیچے سے ایک کپ مجھے پکڑا دیا یہ کہتے ہوئے کہ جارج ایک مطلق العنان ظالم ہے اور وہ مجھے زیادہ پینے نہیں دیتا۔"

اس اثنا میں جارج اپنے نئے ساتھی کے متواتر سوالات کو ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے ابھی تک ایک بیوی بھی کیوں حاصل نہیں کی ہے۔ جارج نے کہا کہ انگلستان میں صرف ایک کی اجازت ہے اور اگر وہ بری بیوی ثابت ہو تو اس سے نجات حاصل کرنا آسان نہیں۔ رنجیت نے کہا کہ یہ ایک برا رواج ہے۔ اور یہ کہ ایک سکھ کو پچیس بیویوں کی اجازت ہے اور وہ نافرمانی کی جرأت نہیں کر سکتیں کیونکہ اگر وہ ایسا کریں تو وہ ان کو مار پیٹ سکتا ہے۔ جارج نے جواب دیا کہ یہ بہت عمدہ رواج ہے اور جب وہ واپس وطن پہنچے گا تو وہاں اس کا تعارف کروائے گا۔ اگلے دن سکھوں نے اپنی ڈرل کا مظاہرہ کیا اور اپنے نظم و ضبط اور توپوں کے صحیح نشانوں سے اپنے اتحادیوں کو متاثر کیا۔ اب برطانوی فوجیوں کی باری تھی۔ برطانوی جرنیل نے کمال مہارت کے ساتھ ایک تصوراتی ہدف پر حملہ کیا اور اتنی ہی بہادری سے دشمن کو شکست دی۔ اس نے میدانی علاقے میں ایک بڑی جنگ لڑی۔ اس کو اپنے مقابل صرف ایک فوج کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنی فتح کو مکمل کر سکے۔"

اگلے دو دنوں میں فوجی طاقت کے کئی مظاہروں، بہت کی مزید تقاریر اور دعوتوں کے بعد فوج بالآخر جنگ کے لیے روانہ ہوئی۔ سرخ وردیوں اور پروں والی مخروطی ٹوپیوں میں ملبوس نیزہ بردار سواروں کی قیادت میں پیادہ اور گھڑ سوار دستے قطاروں میں دریا کے ساتھ ساتھ شکار پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ جہاں انھوں نے بمبئی کے اور شاہ شجاع کے فوجی دستوں کے ساتھ مل جانا تھا۔ اس دوران سکھ لاہور جانے کے لیے شمال کی طرف چل پڑے۔ انڈس آرمی جیسا کہ اس فوج کو نام دیا گیا تھا اب ایک ہزار یورپی سپاہیوں اور چودہ ہزار ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس میں شجاع کی فوج کے بے قاعدہ کرائے کے چھے ہزار آدمی شامل نہیں تھے۔ فوج کے ہمراہ اڑتیس ہزار غیر فوجی ہندوستانی خدمت گار تھے۔ فوجیوں کا ساز و سامان تیس ہزار اونٹوں پر لے جایا جانا تھا جن کو اس مقصد کے لیے دور دراز بیکانیر، جیسلمیر اور ہریانہ میں حصار کے مقام پر کمپنی کے اونٹ فارم سے اکٹھا کیا گیا تھا۔ کوئی بھی ہلکے پھلکے سامان کے ساتھ سفر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ ایک بریگیڈیئر نے مطالبہ کیا کہ اسے اپنے ساز و سامان کے لیے پچاس اونٹوں کی ضرورت ہے جبکہ جنرل کاٹن نے اس مقصد کے لیے دو سو اونٹ لیے۔ تین سو اونٹ فوجیوں کے لیے شراب کا ذخیرہ لے جانے کے لیے مخصوص کیے گئے تھے۔

جونیئر افسر بھی باورچیوں، بھنگیوں، بیروں اور ماشکیوں پر مشتمل چالیس چالیس نوکروں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ میجر جنرل ناٹ کے بقول جس نے ساری پیشہ ورانہ زندگی میں تعلق، سرپرستی یا روپے کے بغیر سخت محنت سے بتدریج ترقی کی تھی اور جو ملکہ برطانیہ کی فوج کے امیر جوان افسروں کو حاسدانہ نظروں سے دیکھتا تھا، یہ بالکل واضح تھا کہ فوجی انتظامیہ کفایت شعاری کا مناسب نفاذ نہیں کر رہی تھی۔ بہت سے جونیئر افسر جنگ کو ایک شکاری مہم کے طور پر ہلکے پھلکے انداز میں لے رہے تھے۔ درحقیقت ایک رجمنٹ واقعی اپنے ساتھ

شکاری کتے محاذ پر لے آئی تھی۔ بہت سے نوجوان افسروں کے لیے قیمتی سوٹوں، اعلیٰ صابن اور پرفیوم کے بغیر سفر کرنا ایسا ہی تھا جیسے وہ پستولوں اور تلواروں کے بغیر مارچ کریں۔ ایک رجمنٹ کے دو اونٹوں پر بہترین منیلا سگار لدے ہوئے تھے جبکہ دوسرے اونٹوں پر مربا، اچار، سگار، ڈبا بند مچھلی اور گوشت، پلیٹیں، گلاس، برتن، موم بتیاں اور میز اور پوش وغیرہ لدے ہوئے تھے۔

ایک لڑاکا فوج کی اہلیت کے لیے یہ کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ انڈین آرمی کے مختلف حصوں کے درمیان رابطے کی بھی کمی تھی۔ توقع یہی کی جا رہی تھی کہ اس وقت تک پوٹنگر نے سندھ کے امرا کے ساتھ مذاکرات کے بعد ان کے علاقے سے فوجوں کے محفوظ سفر کی اجازت حاصل کر لی ہوگی۔ لیکن کراچی کے ساحل قلعے پر حملے اور لاڑکانہ کی لوٹ مار نے سندھی امرا اور برطانوی حکومت کے درمیان دشمنی کے جذبات پیدا کر دیے تھے اور وہ اپنے علاقوں سے انگریز فوجوں کے سفر اور بمبئی کے فوجی دستوں کے لیے نقل و حمل کی سہولیات فراہم کرنے سے انکاری ہو گئے تھے۔ میک نیگٹن سکھ راہنما کے ساتھ لاہور گیا جہاں لیڈی اور ایملی رنجیت سنگھ کی منتخب بیگمات کے ساتھ ملاقات کرنے کے لیے ٹھہری ہوئی تھیں۔ واپسی پر میک نیگٹن یہ سن کر دہشت زدہ ہو گیا کہ جنرل کاٹن حکام بالا کے احکام اور اجازت کے بغیر ہی راستہ تبدیل کر کے سندھ کے دارالحکومت حیدرآباد پر غیرقانونی حملہ کرنے والا تھا۔ میک نیگٹن نے شملہ میں گورنر جنرل کو مراسلہ بھیجا اور تیز رفتار اونٹ سوار قاصد کو جنرل کاٹن کے پاس روانہ کیا کہ وہ حملہ کرنے سے باز رہے۔ لیکن افغان مورخ مرزا عطا کے مطابق جنرل کی فوج راستہ بھٹک کر جنگل میں گم ہو گئی اور معجزانہ طور پر ایک خضر صورت بزرگ کی راہنمائی سے دریا کے کنارے اپنے کیمپ تک پہنچی۔ جنرل کاٹن کو حملہ شروع کرنے کے چند گھنٹے پہلے مراسلہ ملا اور اس نے فوج کی پیش قدمی کو بادل ناخواستہ روک دیا لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جب سندھ کے امیروں نے برطانوی فوج کے دستوں کو خشکی اور سمندر دونوں طرف سے سمندر کی لہروں اور طوفانی بادلوں کی طرح بڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئے اور انھوں نے مزاحمت ترک کر کے مکمل اطاعت اختیار کر لی۔ تاہم جنرل کو اپنے فوجی دستوں کے سامنے ندامت ہوئی جو دولت مند شہر حیدرآباد میں لوٹ مار کرنے کی توقع کر رہے تھے۔

میک نیگٹن نے جنرل کاٹن کی فوج کے ایک کمانڈر کالون سے شکایت کی "جنرل مجھے اور شاہ افغانستان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کمانڈر ان چیف سر جان کین کے علاوہ کسی کو اپنے سے برتر تصور نہیں کرتا اور کسی کی مداخلت کو برداشت نہیں کرتا۔ میری مؤدبانہ گزارشات کو غیر دوستانہ انداز میں لیا گیا۔ مجھے واضح طور پر کہا گیا کہ میں فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ میں نے شاہ شجاع اور اس کی فوج کے لیے ایک ہزار اونٹ بھیجنے کی درخواست کی تھی کیونکہ شاہ کے نصف اونٹ ایک زہریلا سندھی پودا کھانے سے مر گئے تھے اور ان کے ساز و سامان کے نقل و حمل کا بحران پیدا ہو چکا تھا۔"

شاہ شجاع کے ساتھ میک نیگٹن کے تعلقات کا آغاز کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوا۔ اس نے مراسلہ بھیجا "مجھے افسوس ہے کہ شاہ کی گفتگو احمقانہ ہوتی ہے جب بھی وہ اس موضوع پر بات کرتا ہے کہ افغانستان میں اس کے علاقہ جات کی حدود کیا ہوں گی تو اکثر کہتا ہے کہ اس کے لیے لدھیانہ میں قیام بہت بہتر ہوتا۔ اگلی

بار جب وہ بات کرے گا تو میں اس کی توجہ سعدی کے اس شعر کی طرف مبذول کرواؤں گا" اگر ایک بادشاہ سات سلطنتیں فتح کر لیتا ہے تو پھر بھی وہ ایک اور کا خواہش مند ہوتا ہے۔" میں نہیں سمجھتا کہ پچاس ہزار روپے ماہوار شاہ کے اخراجات کے لیے کافی ہوں گے۔" برنس کے ساتھ میک نیگٹن کے تعلقات میں بھی تناؤ موجود تھا۔ برنس اس کام کا خواہش مند تھا جو میک نیگٹن کو دیا گیا تھا جبکہ مغرور میک نیگٹن کے لیے سر کا خطاب زیادہ مناسبت رکھتا تھا جو برنس کو دیا گیا تھا۔ اس لیے دونوں ایک دوسرے کے کردار سے خوش اور مطمئن نہیں تھے۔ اس طرح یہ غیر متحد اور غیر مطمئن فوج تھی جو باقاعدہ حملے سے تین ماہ پہلے فروری 1939ء میں شکارپور کے مقام پر اکٹھی ہوئی۔ صرف افغانستان کے عوام انڈس آرمی کی زبردست تعداد اور بے پناہ طاقت کے بارے میں مبالغہ آرا کہانیوں سے مرعوب ہو رہے تھے کیونکہ وہ اس کے تمام شعبوں کے درمیان رابطوں، نظم و ضبط اور پیشگی منصوبہ بندی کی کمی اور کمانڈروں کے درمیان فضول جھگڑوں سے بے خبر تھے۔ روسی سفیر وکی وچ کی واپسی اور فوجی امداد کے وعدوں کے خاتمے کی وجہ سے قندھار میں دوست محمد کے سوتیلے بھائیوں کو احساس تھا کہ وہ ایک جدید، تربیت یافتہ اور اسلحہ سے لیس نو آبادیاتی فوج کا مقابلہ کرنے کے قابل بالکل نہیں تھے۔

فروری کے آخر تک بمبئی کی فوج اور تمام ہتھیار بھی شکارپور پہنچ گئے تھے۔ اب فوج کے لیے دریا عبور کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ پل کی تعمیر کے ذمہ دار جیمز براڈفٹ کا کہنا ہے۔"اس مقام پر دریا ایک ہزار گز سے زیادہ چوڑا تھا۔ فوج کے پاس صرف آٹھ کشتیاں تھیں۔ بڑی تگ و دو کے بعد ہم نے قرب و جوار کے ملاحوں کی ایک سو میں کشتیاں زبردستی پکڑیں۔ بے شمار بڑے بڑے درختوں کو کاٹ کر شہتیر بنائے گئے۔ فوج کے پاس کوئی رسے نہ تھے۔ ہم نے وہاں سے سو میل دور اگنے والی ایک خاص گھاس سے پانچ سو رسے تیار کیے۔ چھوٹے درختوں کو جوڑ کر اور ان پر ایک ایک ٹن وزنی پتھر لاد کر لنگر بنائے گئے۔ موقع پر کیل کانٹے تیار کیے گئے پھر کشتیوں کو لنگر باندھ کر دریا کے اندر قطار میں اس طرح کھڑا کیا گیا کہ ہر دو کے درمیان بارہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ کشتیوں کے اوپر شہتیر رکھے گئے اور ان کے اوپر کیلوں سے تختے جوڑ کر ایک سڑک بنائی گئی۔ یہ سب سے بڑا فوجی پل تھا جو کبھی بنایا گیا۔ اور آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ہم نے کتنی انفرادی محنت سے اس کو گیارہ دنوں میں تیار کیا ہوگا۔"

مرزا عطا لکھتا ہے"جس حیران کن مہارت سے برطانوی فوج نے دریائے سندھ عبور کیا وہ افلاطون اور ارسطو کے بس میں بھی نہیں تھی۔ جس کسی نے بھی پل کو دیکھا حیرت زدہ رہ گیا۔

افغانستان کا رزمیہ شاعر پہاڑیوں اور وادیوں کی طرف بڑھتی ہوئی برطانوی فوج کی پیش قدمی کو یوں بیان کرتا ہے۔ ترجمہ:

سندھ کے راستے روانہ ہو گیا شاہ شجاع
ایک لاکھ پچاس ہزار فوج کے ہمراہ
دوسرے راستے سے لارڈ، ڈاکٹر، وغیرہ
پچاس ہزار فوج سے کرنے چلے ریڈ
خوف سے زمین کانپی جب چلی سپاہ فرنگ
اونٹ، گھوڑے، ہاتھی، و توپ و تفنگ

فروری 1839ء کے آخری دن انڈس آرمی نے دریائے سندھ عبور کیا اور شکارپور سے درہ بولان تک پھیلے ہوئے تھور زدہ بنجر صحرا میں 150 میل طویل سفر

شروع کیا۔ راستہ ناقابلِ اعتماد اتحادیوں میں گھرا ہوا، موسم گرما خشک، سطح زمین اجنبی اور ناسازگار تھی۔ ذرائع مواصلات تقریباً مفقود اور غیر یقینی تھے۔ گرما کا موسم قریب تھا اور بے آب و گیاہ صحرا تیزی سے تپنا شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے سفر رات کے وقت کرنا پڑتا تھا۔ پانی اور خوراک کی سپلائی غیر یقینی ہوتی تھی۔ اتنی گرمی اور تپش برداشت کرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔

ایک پیادہ فوجی تھامس سیٹن لکھتا ہے "ہم غروب آفتاب کے وقت سفر شروع کرتے تھے۔ صحرا میں تند و تیز ہوا چلتی تھی جس کے ساتھ باریک ریت کے گرم ذرات ہر چیز میں گھس جاتے تھے اور ناقابلِ برداشت پیاس پیدا کر دیتے تھے۔ ہر سپاہی اپنی بھاری بندوق، ساٹھ راؤنڈ کارتوسوں، کپڑوں، پانی کی بوتل اور متفرق ساز و سامان کے تھیلے کے بوجھ تلے بری طرح دبا ہوا تھا جو اس سفر کے لیے مناسب نہیں تھا اور ان کی تنگ اونی وردیوں کی گھٹن کو دگنا کر رہا تھا۔ ایسے حالات میں آدمیوں کی حالت قابلِ رحم تھی اور ہر لمحے ان کی اذیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سب کی بوتلوں میں پانی ختم ہو چکا تھا۔ آدھی رات کے وقت وہ پیاس سے مضمحل ہو چکے تھے۔ انھوں نے بڑبڑانا شروع کر دیا اور پھر پانی پانی کی التجائی پکار سنی گئی۔ ان میں سے بہت سے ہذیان کی کیفیت میں تھے۔ جب میں نے ایک سپاہی سے بات کی تو اس کی زبان منہ کے اندر لڑکھڑانے لگی اور اس کا چہرہ اذیت سے بدوضع ہو گیا۔

صرف سپاہی اس اذیت کا شکار نہیں تھے۔ غیر فوجی ملازمین بھی بری طرح سامان سے لدے ہوئے تھے۔ کچھ نے شیر خوار بچوں کو بھی اٹھا رکھا تھا۔ بچوں کی چیخیں دل کو چیر دینے والی تھیں۔ مضبوط قوی بوجھ سے بے دم ہو کر زمین پر گر رہے تھے اور آہ و زاری کرتے ہوئے اپنے سینوں کو پیٹ رہے تھے۔ کیمپ میں ایک مقامی افسر کی چھے سالہ پیاری سی بچی تھی جس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کاموں میں باپ کی مدد کرتی تھی۔ اس کو دیکھنا اور اس کی باتوں کو سننا پُر مسرت منظر ہوتا تھا۔ صبح دس بجے وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ سہ پہر تین بجے وہ مر چکی تھی اور اس کی میت تدفین کے لیے تیار تھی۔ ایک پہاڑی گھاٹی کے دامن میں تین کنویں کھودے گئے جن میں سے صرف تین میں پانی موجود تھا۔ ایک میں ایک جانور گر گیا جس سے پانی زہریلا ہو گیا۔ دوسروں کا پانی اتنا کڑوا اور کھارا تھا کہ سپاہیوں نے بتایا کہ ان کی پانی کی بوتلوں کا رنگ سیاہ ہو گیا۔"

فوجی قافلے پر بلوچی ڈاکوؤں کے بڑھتے ہوئے حملے بھی پریشان کن تھے۔ ناکافی سفارتکاری اور مقامی سرداروں سے رابطے کی کمی کے سبب علاقائی قبائل برطانوی فوجوں کو آسان شکار سمجھتے تھے۔ عموماً مسلح

سپاہیوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ لیکن غیر محفوظ ملازمین کو روزانہ لوٹا اور قتل کیا جاتا تھا۔ شکارپور سے روانگی کے ایک ہفتہ بعد ایک کنویں کے پاس ایک عورت کو مردہ پایا گیا۔ اس کے لمبے سیاہ بال پانی کی لہروں میں تیر رہے تھے۔ اس کا گلا دونوں کانوں تک کاٹا گیا تھا۔ مقتول افراد کو سڑک کے کنارے پر گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ رات کی چاندنی میں ایک بھی درخت، جھاڑی یا گھاس کی پتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔ اس خطے میں کوئی پرندہ بھی موجود نہیں تھا۔ حتیٰ کہ کوئی گیدڑ تک نہیں تھا۔ ہم اکثر اونٹوں کی گلی سڑی لاشوں کے قریب سے گزرتے تھے اور اگر وہاں گیدڑ ہوتے تو وہاں ضرور پہنچتے۔ ہمارے اونٹوں کو کئی دنوں تک کھانے کو کچھ نہیں ملا اور طویل سفر اور بھوک کی وجہ سے ایک ہی رات میں چھتالیس اونٹ مر گئے۔

ان گرم چاندنی راتوں کے سفر کے دوران اکثر سپاہیوں نے اس شخص کی پہلی جھلک دیکھی جس کی خاطر وہ اپنی جانیں خطرے میں ڈال رہے تھے۔ ایک نوجوان گھڑسوار فوجی افسر نیول چیمبرلین نے اس کے بارے میں لکھا ”شاہ شجاع ایک ساٹھ سالہ بوڑھا آدمی ہے۔ اس کی سفید داڑھی کمر تک لمبی ہے جس کو وہ رنگ کرتا ہے تاکہ وہ کم عمر نظر آئے۔ وہ ایک لمبا کھلا جبہ پہنتا ہے جس کو بارہ آدمی اٹھا کر ساتھ چلتے ہیں۔ اس کی معیت میں پیادہ، نوکر، گھڑسوار، ہاتھی، گھوڑے اور ایک سو سپاہی ہوتے ہیں۔ شجاع نے سفر میں بنیادی ضروریات کی کمی کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا لیکن دوسروں کی طرح وہ بھی منصوبہ بندی کی کمی، بلوچوں، راہزنوں اور بار برداری والے اونٹوں کی اموات پر پریشان تھا۔ اس کو اپنے مستقبل کے عوام کی طرف سے سرد مہری کا بھی گلہ تھا جو وہ اس کے خطوط کے جواب میں دکھا رہے تھے۔ جب سے میک نیگٹن نے اس کو تخت پر بحالی کے منصوبے سے آگاہ کیا تھا وہ بڑی گرمجوشی سے مختلف افغان قبائلی سرداروں سے خط کتابت میں مصروف تھا اور ان پر زور دے رہا تھا کہ وہ اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور اپنی وفاداری اور حمایت کی پیش کش کریں جس کے بدلے میں ان کے قدیم حقوق اور زمینیں مستقل طور پر بحال کر دی جائیں گی۔ لیکن جواب میں مکمل خاموشی تھی سوائے چند غلزئی اور خیبر سرداروں کے جنھوں نے جواب میں اس سے روپیہ طلب کیا۔ علاوہ ازیں خان آف قلات مہراب خان جس کے علاقے میں اب یہ قافلہ داخل ہونے والا تھا، نے بھی اس مہم جوئی کی مخالفت کر دی تھی۔ مہراب خان' شجاع کا وفادار ساتھی تھا اور اس نے قندھار کی شکست کے بعد شجاع کو پناہ بھی دی تھی۔ لیکن جب برنس نے اس سے اخلاقی اور مادی مدد کی درخواست کی تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ غیر ملکی فوج کو افغانستان میں لے جانا شاہ شجاع کی بڑی غلطی ہے جس کی وجہ سے وہ افغان قوم کے دل نہیں جیت سکتا۔ آخر میں اس نے جو الفاظ کہے وہ ضرب الامثال کی طرح مشہور ہو چکے ہیں۔ ”آپ ایک فوج کو افغانستان کے اندر تو لا سکتے ہیں لیکن اسے نکال کر کیسے لے جائیں گے؟!“

قافلہ داوڑ کے گرم تھور زدہ سفید دلدلی علاقے سے گزر کر جنوبی افغانستان کے چمکتے ہوئے عظیم پہاڑوں کے دامن میں چھوٹی پہاڑیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ علاقہ ابھی تک گرم، خشک اور بنجر تھا۔ چڑھائی آہستہ آہستہ محسوس ہوئی اور تکلیف دہ ہوتی گئی حتیٰ کہ اچانک درہ بولان کا سیاہ قیف نما دہانہ فوجی دستوں کے سامنے آ

گیا۔ سترمیل طویل درے کے پہلے چار میل کا راستہ اتنا تنگ تھا کہ ایک وقت میں صرف ایک اونٹ ہی گزر سکتا تھا۔ اب جب دریا کی خشک گزرگاہ میں گرنے والے پتھروں کے اوپر سے گھڑسوار دستے رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے گزرنے لگے تو گھاٹیوں کی غلطیاں بے تحاشا حادثات اور اموات کا باعث بننے لگیں۔ پیادہ فوج کی سرما کی وردیاں اتنی گرم تھیں کہ وہ جھلسا دینے والی حدت میں عمودی چڑھائی کے لیے ہرگز موزوں نہ تھیں۔ گرم چٹانیں تندور کی طرح آگ کی شعاعیں چہروں پر پھینک رہی تھیں۔ دن کے وقت خیموں کے اندر درجہ حرارت 119 درجے تھا۔

سڑکوں کی حالت اتنی خراب تھی کہ ان پر توپ خانے کی گاڑیاں نہیں گزر سکتی تھیں۔ شروع میں ہر توپ گاڑی کے آگے آٹھ گھوڑوں کو جوتا گیا اور رسے کھینچنے والے سپاہیوں کی قطاریں بنائی گئیں۔ جب سڑک مزید پتھریلی اور عمودی ہوئی تو توپوں کو گاڑیوں سے اتار کر ہر توپ اور ہر گاڑی کو ہاتھوں کی طاقت سے دوسری طرف پہنچایا گیا۔ میجر ولیم ہاؤ لکھتا ہے: "چڑھائی اتنی عمودی تھی کہ پیدل فوج اور گھڑسوار سواری کرنے سے گھبراتے تھے۔ چند اونٹ گر پڑے جس سے راستہ بند ہو گیا۔ بلوچی راہزنوں نے سارے سامان پر قبضہ کر لیا اور اونٹوں پر لدی ہوئی گندم چرا کر لے گئے۔ میں نے خود دیکھا کہ بہت سے غیر فوجی ملازمین کی نعشیں سڑک پر پڑی تھیں۔ رات کے وقت فضا اونٹوں کی بلبلاہٹ اور زخمیوں کی آہ و زاری سے معمور ہوتی تھی۔ بہت سے سپاہی گرم خشک ہوا میں سانس لیتے ہوئے اور پانی مانگتے ہوئے گر گئے اور جاں بحق ہو گئے۔"

ہیلن لکھتا ہے: "مردہ اونٹوں کی بدبو ناقابل برداشت تھی۔ حرارت، گرد، صحرائی ہوا اور بے شمار مکھیوں کے ہاتھوں پیش آنے والے مصائب کو نہیں بیان کیا جا سکتا۔ پورا کیمپ مردار خانے کی بدبو میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی شخص کیمپ میں مردہ یا مرتے ہوئے انسان یا حیوان کو دیکھے بغیر تین قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔"

خوراک کی قلت کا مطلب تھا نصف راشن اور اب اس کو چوتھائی کر دیا گیا۔ غیر فوجی ملازمین کو کھانے کے لیے بھیڑ کی کھنچی ہوئی کھال اور جانوروں کا جما ہوا خون دیا جاتا تھا یا پودوں کی جڑیں جو وہاں دستیاب تھیں۔ وحشیانہ تشدد کے اکا دکا واقعات ہر کسی کو بے حوصلہ کرنے کے لیے جاری رہتے تھے۔ ولیم ہاؤ لکھتا ہے: "توپ خانے کے دو سارجنٹوں کو پکڑ لیا گیا اور ان کے چہرے کو مسخ کر دیا گیا۔ بڑی تعداد میں کمزور گھوڑوں کو ہلاک کرنا پڑا جب کہ بیشتر سامان کو پھینک دیا گیا یا جلا دیا گیا تاکہ وہ بلوچوں کے ہاتھ نہ لگ سکے۔" سپاہی ستارام یاد کرتے ہوئے کہتا ہے "یہ جہنم کا وبال تھا۔ بہت ہی تھوڑے کنوؤں میں پانی تھا اور وہ کڑوا تھا۔ ہر چیز حتیٰ کہ جلانے کی لکڑی بھی اونٹوں پر لدی پڑی تھی۔ بلوچیوں نے ہمیں خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ شب خون مارتے تھے اور اونٹوں کی لمبی قطاروں کو ہانک کر لے جاتے تھے۔ گرمی اتنی زیادہ تھی کہ بہت سے سپاہی مر گئے۔ ایک دن میں چھتیس افراد موت کا شکار ہوئے۔ کمپنی کی فوج کے سپاہی ہندوستان واپس جانے کا عزم کر چکے تھے اور کئی رجمنٹوں میں بغاوت کے آثار نمایاں تھے۔ تاہم جزوی طور پر شاہ شجاع کے پرکشش وعدوں اور جزوی طور پر بلوچوں کے خوف سے فوجیں آگے بڑھتی گئیں۔ بہت سے افراد قبائلیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ انھیں جب بھی موقع ملتا وہ کسی کو قتل کر دیتے اور پہاڑوں کی ڈھلوانوں سے ہمارے

اوپر بڑے بڑے پتھر لڑھکا دیتے تھے۔

مرزا عطا نے لکھا ہے: "شاہ شجاع کا قافلہ خوش قسمت تھا کہ وہ بلوچ بندوق برداروں کی گولیوں کو دھوکا دے کر اور پہاڑوں کی آڑ لے کر زندہ وسلامت درے میں سے گزر گئے۔ درے سے گزرنا انتہائی مشکل کام تھا۔ توپیں اور دوسرا سازوسامان رسوں سے کھینچ کر اوپر چڑھایا جاتا تھا۔ اس عمل میں بڑی تعداد میں اونٹوں، گھوڑوں، بیلوں اور سپاہیوں سے ہاتھ دھونا پڑے جو پانی اور خوراک کی کمی سے مارے گئے۔ انھوں نے اس بے آب جہنمی درے میں تین دن رات گزارے۔ خوراک کی اتنی قلت تھی کہ سونے کے ایک دینار کے عوض آدھا سیر آٹا دستیاب نہ تھا۔" شجاع نے درے سے وزیر کو لکھ بھیجا کہ وہ ان قبائلیوں کو کسی مناسب وقت پر سزا دے گا۔ نیز اس نے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ کابل کے غاصب حکمران لوگوں کو اس کے خلاف کرنے کے لیے ملا کو استعمال کر رہے ہیں۔ اس کی تشویش بجا تھی کیونکہ قابل نفرت فرنگی کافروں کے ساتھ اس کی وابستگی اس کا کمزور پہلو تھا۔ اس کے بارک زئی حریفوں کے حربی سازوسامان میں نسلی اور مذہبی منافرت اور خوف طاقتور ترین ہتھیار تھے۔

درہ بولان سے آگے کوئٹہ تھا جو اس وقت صرف پانچ سو گھروں کا خستہ حال گاؤں تھا۔ اس سے آگے ایک اور مشکل درہ کھوجک کا تھا جو بولان سے چھوٹا اور کم عمودی تھا لیکن اس سے بھی زیادہ خشک اور بنجر۔ مرزا عطا تحریر کرتا ہے "انھوں نے رات پانی کے بغیر گزاری۔ جو پانی دستیاب تھا وہ گندا اور مردہ جانوروں کی ہڈیوں وغیرہ سے بھرا ہوا تھا جس کسی نے اس کو پیا وہ پیٹ کے مروڑ اور اسہال میں مبتلا ہو گیا۔ وہ پانی کی اس قدر شدید قلت کا شکار تھے کہ دو دن تک تمام انسان اور حیوان سرکنڈوں کی طرح لرزتے رہے۔" ایک افسر نے لکھا "اس وقت تک کیمپ کے ملازمین کے لیے خوراک بالکل ختم ہو گئی تھی۔ ان میں سے کچھ کو جانوروں کے گوبر سے اناج کے دانے چنتے اور مردار گوشت کھاتے ہوئے دیکھا گیا۔ ایک دن میں نے سڑک کنارے ایک آدمی کی لاش دیکھی جو مردہ بیل کا گوشت کھانے کی کوشش میں چل بسا تھا۔" کسی افغان سے جنگ لڑنے سے قبل ہی فوج تباہی کے دہانے پر تھی۔ لیکن کھوجک سے آگے فوج نے اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے درختوں اور سرسبز گھاس کے میدان میں پایا۔ خانہ بدوش کوچی قبائل کے بکریوں اور دنبوں کے ریوڑ نظر آ رہے تھے جن کی نگرانی سفید پگڑیوں اور سرخ لباس والے طویل القامت آدمی کر رہے تھے جن کے ہمراہ بڑے بڑے کتے بھی تھے۔

موسم ابھی تک گرم اور خشک تھا لیکن جہاں کہیں پانی تھا وہاں پاپلر کے درختوں کی باڑھ کے نیچے سایہ بھی موجود تھا۔ کچھ درختوں کے ساتھ انگور کی بیلیں بھی لپٹی ہوئی تھیں۔ فوج اب ایک غیر محسوس بلوچ سرحد کو پار کر کے پشتون علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ دھوکے باز بلوچی راہزنوں کے برعکس اچکزئی قبیلے کے گھڑسوار بڑے فخر سے برطانوی کیمپ میں آتے اور مستقبل کے غیر ملکی حاکموں سے سوالات کرتے تھے۔ جنرل ناٹ ان کی وجاہت، تہذیب اور بے خوفی سے متاثر ہوا۔ جب ایک افغان نے اس سے پوچھا کہ انگریز وہاں کیوں آئے ہیں تو ناٹ نے جواب دیا کہ شاہ شجاع اپنا ورثہ واپس لینے کے لیے آیا ہے اور یہ کہ دوست محمد اس کا حقدار نہیں۔ افغان نے جواب دیا۔ "جس طرح تم دہلی اور بنارس پر حق رکھتے ہو اسی طرح ہمارا دوست محمد کابل پر حق رکھتا ہے اور وہ اس کو قائم رکھے گا۔" اس

تا کر دے کے بعد اس کے شک و شبے میں اضافہ ہو گیا کہ شجاع کو کس قسم کے استقبال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

"میں حکومت اور دوسروں سے اختلاف کرتا ہوں اور واقعی یقین رکھتا ہوں کہ افغانستان کے لوگ لڑے بغیر اپنا ملک نہیں چھوڑیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ میں بھی نہ چھوڑتا اگر میں ان کی جگہ ہوتا۔" اس نے کہا۔

دوسرے افسروں کے ساتھ بھی ایسی ہی گفتگو ہوئی۔ ایک افسر کے ہندوستانی اردلی سے پوچھا گیا: "کیا تم ان فرنگیوں کو واقعی صاحب اور سر کہتے ہو؟" پوچھنے والے نے ایسے انداز میں پوچھا جیسے اس کے خیال میں "کافر کتا" زیادہ موزوں خطاب ہوتا۔ ایک خوش پوش افغان گھڑسوار نے ایک انگریز افسر کو نفرت بھرے انداز میں کہا "میں نے تمھارے فوجیوں اور کیمپ کو دیکھا ہے۔ تمھاری فوج خیموں اور اونٹوں کی فوج ہے۔ ہماری فوج گھوڑوں اور آدمیوں پر مشتمل ہے۔ آپ کو کس چیز نے ترغیب دی کہ آپ کروڑوں روپے خرچ کر کے ایک غریب پہاڑی ملک میں آئیں جہاں نہ لکڑی ہے نہ پانی اور یہ سب کچھ ایک کمبخت کو ہمارے اوپر مسلط کرنے کی خاطر کریں؟ جونہی آپ لوگ جائیں گے ہمارا اپنا بادشاہ دوست محمد اس کو مزہ چکھا دے گا۔" وقت کے ساتھ گھڑسوار کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور جب بغاوت پھوٹے گی تو اس خطے کے اچکزئی ہراول دستے میں ہوں گے۔

عین اس وقت فوج کے نظم و ضبط سے متعلق ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ کمانڈر ان چیف سر جان کین کیمپ میں تشریف لائے اور انھوں نے شاہی فوج کے ایک جونیئر افسر جنرل ولشائر کو ترقی دے کر سینئر اور تجربہ کار جنرل ناٹ کے اوپر کمپنی کی بمبئی فوج کا کمانڈر مقرر کر دیا۔ جنرل ناٹ غضب ناک ہو گیا اس نے کمانڈر ان چیف سے کہا۔

"مجھے قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے کیونکہ میں شاہی فوج کے افسروں سے سینئر ہوں۔"

"یہ تاثر غلط ہے۔" کین نے جواب دیا۔ "تم نے میرے اختیارات کی توہین کی ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں میں تمھیں معاف نہیں کروں گا۔"

"جناب والا! اگر معاملہ ایسا ہے تو میں آپ کو شام کا سلام عرض کرتا ہوں۔"

اس گستاخ گفتگو کا ناٹ کو یہ نقصان ہوا کہ انڈس آرمی میں سب سے زیادہ سینئر، تجربہ کار، قابل اور ہر دلعزیز جرنیل ہونے کے باوجود اس کو نظر انداز کیا جاتا رہا اور ایسے افراد کی تقرریاں کی گئیں جو کابل فوج کے لیے تباہ کن ثابت ہوئیں۔ اب انڈس آرمی قندھار کے قریب تھی اور پہلا سنجیدہ تصادم متوقع تھا۔ بیس اپریل کی صبح انڈس آرمی کو ایک اچھی خبر ملی۔ سراغ رسانوں نے برنس کے چیف سراغرساں موہن لال کشمیری کو اطلاع دی کہ کیمپ سے تھوڑا آگے دوست محمد کا قریبی سردار حاجی خان کاکڑ اپنے دو سو ساتھیوں کے ہمراہ شاہ شجاع کے ساتھ عہد وفاداری باندھنے کے لیے تیار تھا۔ شجاع کے خطوط بار آور ہونا شروع ہو گئے تھے۔ حاجی خان کاکڑ انیسویں صدی کی افغان سیاست کے حوالے سے ایک حریص، بے ضمیر اور ناقابل اعتماد شخص تھا۔ اس کے آباؤ اجداد بھی عرصے سے خطے میں بادشاہ گری کا کام کرتے تھے۔

دوست محمد نے اسے پہلے بامیان کا گورنر اور پھر بہترین گھڑسوار فوج کا کمانڈر مقرر کیا۔ لیکن وہ اس سے پیشتر بھی بے وفائی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ 1937ء میں سکھوں کے خلاف جمرود کی جنگ میں وہ دھوکا دے چکا تھا۔ لیکن وہ اپنے سچے جھوٹے اور مفادات حاصل کرنے میں بڑی مہارت اور ہوشیاری سے کام لیتا تھا۔

اب شجاع کے کسی وطنی عہدے کی تحریری پیش کش حاصل کرنے کا سنہری موقع تھا۔ چناں چہ وہ برطانوی فوج پر حملہ کرنے کا بہانہ بنا کر باہر آیا اور ساتھیوں سمیت وفاداری تبدیل کر لی۔ وہ صحیح وقت کا انتخاب کر کے اپنی بر بے وفائی اور غداری کے بدلے اقتدار میں حصہ لیتا تھا۔ اس عمل سے اس نے قندھار کے حکمرانوں کا حوصلہ پست کر دیا۔ آنے والے چند دنوں میں قندھار کے بہت سے امرا شجاع سے آملے اور اپنی وفاداریاں واپس آنے والے شاہ کو پیش کر دیں۔ شجاع کو اس معجزانہ تائید کی توقع نہ تھی۔ قندھار کے حکمران جو دوست محمد کے سوتیلے بھائی تھے، مایوسی کے ساتھ اس تبدیل ہوتی صورت حال کو دیکھ رہے تھے۔

25 اپریل 1939ء کو شجاع قندھار کے مضافات میں گندم اور جو کے کھیتوں اور باغات سے فاتحانہ انداز میں گزرتا ہوا شہر کے کھلے دروازوں سے اندر داخل ہو گیا۔ حاجی خان کاکڑ شجاع کے ہمراہ تھا۔ اس کے پیچھے برنس اور میک نیگٹن محافظوں کے ایک دستے کے ساتھ چل رہے تھے۔ راستے میں شہر کے لوگوں کے غول سیدوزئی بادشاہ کا استقبال کرنے کے لیے موجود تھے۔ غریب عوام بھی پھولوں کے ہار لیے موجود تھے۔ انھوں نے اس کے راستے میں بھی پھول بچھا رکھے تھے۔ یہ وہی شہر تھا جس نے پانچ سال پہلے شجاع کے خلاف کامیاب مزاحمت کی تھی۔ شجاع سب سے پہلے اس باغ میں گیا جہاں اس کے دادا اور درانی سلطنت کے بانی احمد شاہ ابدالی کا مزار تھا۔ مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد شجاع اس سے متصل عمارت میں گیا جہاں روایت کے مطابق محمد ﷺ کا مقدس اونی چغہ محفوظ کیا گیا تھا۔ شجاع نے اس کو ہاتھوں میں پکڑا، سینے سے لگایا اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اسے اوپر لپیٹ لیا۔ یہ آبائی تخت کی بازیابی اور مذہبی قیادت پر سرفرازی کی علامت تھا۔

تین سال پہلے دوست محمد بھی برکت اور خوش قسمتی کے حصول کے لیے یہاں آیا تھا جب اس نے سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ ڈیڑھ سو سال بعد جب پشتون علما نے ملا عمر کو امیر المومنین کا خطاب دیا تو مذہبی حاکمیت حاصل کرنے اور پورے افغانستان پر طالبان کی اسلامی حکومت قائم کرنے میں برکت اور تائید کی غرض سے وہ بھی یہاں آیا اور اس نے یہ مقدس چغہ پہنا۔ شاہ شجاع نے افغانستان کا تخت تیس سال پہلے نملہ کی لڑائی میں کھو دیا تھا۔ لیکن اس نے امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ طویل جلاوطنی اور تین ناکام کوششوں کے بعد بالآخر وہ اپنے وطن میں تھا اور اپنے زندگی بھر کے بارکزئی دشمنوں کو شکست دینے کے قریب تھا۔ قندھار پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد انگریز انجینئر تھامس ہیولوک نے خط میں لکھا:

"یہ ایک پرلطف جگہ ہے۔ مناظر رومانوی، آب و ہوا عمدہ اور پھلوں کی فراوانی، معیار اور قیمت کا تو تصور تک نہیں کر سکتے۔ ہم نے سائز کے عمدہ ترین آڑو ایک پنی کے تین کے حساب سے خریدے۔ جب انگور ایک پنی کے تین ملتے۔ خشک آڑو، خوبانی، کشمش، آلو بخارا اور شہتوت تو بہت سستے پائے جاتے ہیں۔ ٹھنڈا شربت، کباب، پنیر، مٹھائیاں اور دوسری لذیذ چیزیں ہر گلی کوچے میں انتہائی سستے داموں ملتی ہیں۔ اچھے گھوڑے اور قوت کی تروتازگی کے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن یہاں پہنچنے کے لیے ہم کتنے خطرناک مشکل مصائب سے گزرے ہیں! دو تین سو میل کے سفر کے بعد قندھار میں جاری آمد کا بے مثال جشن ماسکو سے بچ کر آنے والی فرانسیسی فوج سے کیا جا سکتا ہے۔"

آؤ پاکستانی سیاح کے سنگ سنگ

امریکا چلو

ان تلخ و شیریں واقعات کا دلچسپ قصہ جو دیارِ غیر پہنچ کر ایک فوجی افسر کی بیگم کے ساتھ پیش آئے

غزالہ محمود

بیٹے کی آمد ہمارے لیے کوچ کا نقارہ ثابت ہوئی کیونکہ ابھی وہ پانچ روز کا تھا کہ صاحب فوجی کورس پر امریکا جانے کے لیے منتخب ہو گئے۔ وہ بدلی سدھارے اور ہم ویزے کے انتظار میں والدین کے گھر آ گئے۔ خدا خدا کر کے ویزا ملا۔ اسی دوران صاحب کا خط آ پہنچا۔ وہ خط کم اور ہدایت نامہ زیادہ تھا۔ سب سے اہم ہدایت یہ تھی کہ ہم وہاں صرف ایک بچے کو لے کر آئیں کیونکہ بچوں کے رونے اور دیگر مشاغل سے کورس متاثر ہونے کا خدشہ تھا۔

لیجیے جناب اب کیا ہونا چاہیے؟ والدہ نے مشورہ دیا کہ دونوں بیٹیوں کو ان کے پاس ہی رہنے دوں اور صرف بیٹے کو لے کر امریکا چلی جاؤں۔ دل پر پتھر رکھ کر یہ فیصلہ قبول کر لیا۔

اب اگلا مسئلہ یہ تھا کہ ہم چھوٹے بچے کو لے کر اتنا لمبا سفر کیسے طے کریں؟ ہماری والدہ ہمیں تنہا بھیجنے کو تیار نہیں تھیں۔ والدہ کا نظریہ تھا کہ ایک پڑھی لکھی عورت کے لیے امریکا کا سفر اتنا بڑا مسئلہ ہرگز نہیں۔ ہم بھی دبی دبی آواز میں یہ دلیل پیش کرتے کہ امی! ہم اچھی خاصی انگلش بول اور سمجھ لیتے ہیں۔ پانچ سال سے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی اور کافی گھونٹ بھر چکا چکے، لہٰذا ہم پر اتنا اعتبار ضرور کر لیا جائے۔ ہماری والدہ خاصی سخت بہت بشرم واقع ہوئی تھیں اور ان کا فیصلہ ہمیشہ حرفِ آخر ہوتا تھا۔

سو ہم منہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ خوش قسمتی سے ان ہی دنوں ہمارے ایک تایا زاد بھائی کو امریکا کی ایک یونیورسٹی میں ایم بی اے میں داخلہ مل گیا۔ ہماری نشست ان کے ساتھ ہی بک کروا دی گئی۔ یوں ہم پورے جوش و خروش کے ساتھ رختِ سفر باندھنے لگے۔ ہماری تیاریاں عروج پر تھیں کہ ہمارے کزن صاحب ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو گئے۔

ان کا امریکا جانا ملتوی ہوا لیکن صاحب! اب ہمیں مزید انتظار گوارا نہیں تھا۔ لہٰذا ہم اپنے
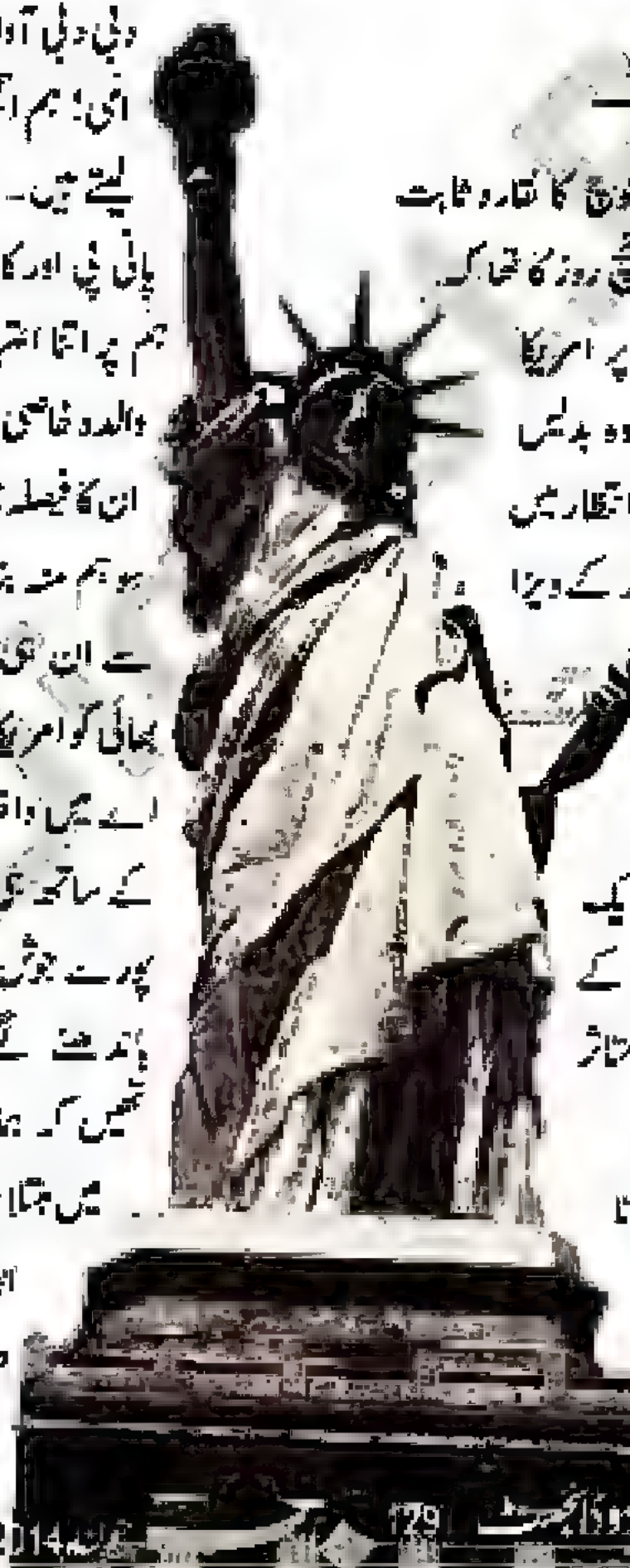
موقف پر بخیر و عافیت پہنچ گئے۔ زندگی میں پہلی بار والدہ نے ہماری ضد کو تسلیم کر لیا۔ اگر سوہنی مہینوال کو ملنے کے لیے کچے گھڑے پر دریا پار کر سکتی ہے تو یہ تو محض اٹھارہ بیس گھنٹے کا ایک ہوائی سفر تھا۔

خیر صاحب ہم وقت مقررہ پر روانہ ہوئے۔ والد صاحب نے کچھ ایسا اہتمام کیا کہ اگر خدانخواستہ ہم راستے ہی میں جام شہادت نوش کر جاتے تو پھر بھی منزل پر پہنچ ہی جاتے۔ یعنی ہم نے اپنے گلے میں ایک چھوٹا سا بیگ لٹکا رکھا تھا اور ہمارے دونوں کاندھے اور سر مختلف انداز میں زیر بار تھے۔ ہمیں یہ تاکید کی گئی کہ پاسپورٹ والا چھوٹا بیگ جو تین ہماری گردن میں لٹک رہا تھا، غسل خانے جاتے وقت بھی ہرگز نہیں اتارنا خواہ ہماری گردن اتار دی جائے۔ اب ہمارے گلے میں صرف وہ تختی لٹکانے کی کسر باقی رہ گئی تھی جس پر عموماً یہ درج ہوتا ہے:

''حامل ہذا کا دماغی توازن خراب ہے۔ منزل پر پہنچا کر ثواب دارین حاصل کریں۔''

بہر حال ہم نے فرماں برداری کا ثبوت دیتے ہوئے ''بیگ'' اپنے گلے میں طوق کی طرح لٹکا لیا۔ ہم پہلی نظر میں یقیناً اذان بھکاری معلوم ہوتے ہوں گے۔

امریکا میں نزول

خدا کا شکر کہ سفر بخیریت تمام ہوا۔ جہاز سے نکل کر امیگریشن کاؤنٹر کے سامنے ایک لمبی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ہم نے اتنی لمبی قطار صرف اپنے ہاں یوٹیلٹی اسٹورز کے باہر راشن کارڈ پر چینی کی خریداری کرنے والوں کی دیکھی تھی۔ مگر امیگریشن کے مراحل سے گزرے بغیر ہم امریکا کی سرزمین پر قدم رکھنے کا شرف حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اپنا ملک ہوتا تو کسی کو پیچھے دے کر قطار میں ذرا آگے کھڑے ہو جاتے۔

امریکا میں یہ چیز سب سے پہلے بڑی عجیب و غریب لگی کہ سارا گھر لکڑی کا بنا ہوا تھا یعنی سیڑھیاں چڑھتے تو وہ کسی تھیٹر کے سیٹ کی طرح لرزنے لگتیں۔ تب ہی تو امریکن خواتین نکھری نکھری اور تر و تازہ نظر آتی ہیں..... صفائی، منہ جھاڑ پونچھ۔ ان گھروں میں گرد کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ایک ہمارے گھر ہیں کہ سارا دن جھاڑ پونچھ اور صفائی کرو، کپڑے دھو دھو کر ہاتھ پاؤں گل جاتے ہیں اور منہ پر پھر بھی بارہ ہی بجے رہتے ہیں۔

ہم بیڈ روم میں داخل ہوئے تو تھکن سے نڈھال تھے۔ دل ویران اور اداس۔ جی مچل رہا تھا کہ اسی خوشبودار سرزمین کی طرف واپس لوٹ جائیں جہاں رفاقتوں اور محبتوں کے خزینے لٹائے جاتے ہیں۔ جہاں ہر طرف کچی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو من کو بھاتی ہے۔

ٹریفک کا نظام

امریکی عوام میں ٹریفک کا احترام ہے۔ حقیقتاً امریکا میں ٹریفک نظام بڑا منظم ہے۔ چوراہوں پر کوئی سنتری کھڑا نہیں ہوتا لیکن اشاروں کا باقاعدہ احترام کیا جاتا ہے۔ قوم اتنی ایماندار اور فرض شناس ہے کہ دیکھ کر حیرت ہونے لگتی ہے۔

اپنے وطن میں تو یہ حال ہے کہ لوگ تیز رفتاری کے جنون میں ٹریفک کے سپاہیوں کو روند ڈالتے ہیں۔ ہر طرف انتشار، افراتفری اور بے اعتدالی تو گویا ہمارا

قومی شعار بن چکا ہے۔ اور قانون ہمارے ہاں صرف توڑنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔

امریکا میں پیدل چلنے والوں کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ ایک شخص نے سڑک پار کرنی ہو تو ٹریفک خود بخود رک جاتی ہے۔ انسان کا احترام اگرچہ ہمارے مذہب کا سب سے نمایاں حصہ ہے لیکن یہ غیر ملکی معاشروں ہی میں زیادہ ملتا ہے۔

اگرچہ بعض اوقات یہ احترام حد پار کر جاتا ہے۔ مثلاً مغربی معاشرے میں آپ اس ڈر سے گھر میں چھینک بھی نہیں سکتے مبادا آپ کا ہمسایہ یہ دعویٰ دائر کر دے کہ آپ اس کے آرام میں خلل ڈال رہے ہیں۔

ڈاکٹروں کا موازنہ

بہرحال انسان تو پھر انسان ہیں، یہاں تو جانوروں کے آرام، خوراک اور نیند کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اور مریض کا رشتہ بھی ہمارے ملک سے بہت مختلف ہے۔ یعنی ڈاکٹر سے ذرا غفلت سرزد ہوئی یا اس نے مریض کے ساتھ بے پروائی کا رویہ اختیار کیا تو موصوف پر مریض نے کھٹ سے دعویٰ دائر کر دیا۔ ہمارے ہاں تو ڈاکٹر صاحبان بڑے اعتماد سے مریض کو غلط دوائیں اور انجکشن تجویز کر دیتے ہیں اور کوئی انھیں پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ آنکھوں کے آپریشن کے نام پہ لوگ منظم انداز میں بینائی سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔

بعض ڈاکٹر صاحبان تشخیص کے مراحل کو اتنا طویل کر دیتے ہیں کہ غریب مریض اپنی زمینیں اور مویشی بیچ کر علاج کے اخراجات پورے کرتے ہیں۔ جاں بلب مریض بعض اوقات ٹیسٹوں کے نتائج کا انتظار کرتے کرتے اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔

امریکا میں اسٹورز پر سیل لگے تو عوام الناس ٹوٹ پڑتے ہیں۔ چند سینٹ کی بچت کو بھی یہ لوگ بہت بڑا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ اس معاملے میں یہ قوم ہم سے زیادہ سمجھدار اور دور اندیش ہے۔ وہ پیسا بڑی عرق ریزی سے کماتے اور خرچ بھی سمجھداری سے کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں تو یہ حال ہے کہ کمانے والا ایک اور کھانے والے دس ہیں۔ گھر کے سارے افراد بڑی بے دردی سے پیسا خرچ کرتے ہیں بلکہ ہماری بیگمات پیسا اڑانے میں بڑا فخر محسوس کرتی ہیں۔ یہاں بیگمات نہیں پائی جاتیں، عورتیں بھی مردوں کی طرح محنتی اور جفاکش ہیں۔

اس بے رحم معاشرے میں جمعدار کا تو وجود ہی نہیں۔ اگر آپ صفائی کروانا چاہیں تو گھنٹوں کے حساب سے ادائی کرنا پڑتی ہے اور اتنے ڈالر ادا کرنے پڑتے ہیں کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔

امریکا میں عام لوگ صفائی کرانے کی مالی سکت ہی نہیں رکھتے، صرف دولت مند ملازموں سے صفائی کراتے ہیں۔ صفائی کرنے والی خاتون کار میں آئے گی۔ صفائی کر کے خود ہی کافی کا پانی چولہے پر رکھے گی، کافی پیئے گی، آپ کو پلائے گی اور چھتی مشتی باہر نکل جائے گی۔ یہاں مزدور طبقے یا ورکنگ کلاس کا رویہ دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ خدا کی قدرت پر حیرانی ہوتی ہے کہ اغیار نے اسلام کا مساوات کا اصول کتنی ایمانداری سے اپنا لیا ہے۔

ہمارے نفسیاتی عوارض

امریکی قوم خوش لباسی پر جان نہیں دیتی۔ وہ قیمتی کپڑوں کی دیوانی ہرگز نہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ حال ہے کہ خواہ کھانے کے لیے پیٹ بھر روٹی نہ ہو، حسب موقع لباس پہننا لازمی ہے۔ ہم لوگ زندگی بھر اس قسم کے نفسیاتی عوارض (Complexes) سے نہیں نکل پاتے۔

خاص طور پر معذرت کے ساتھ ہم عرض کریں گے کہ ہماری خواتین سارا دن اپنے ہی چکروں میں رہتی ہیں۔ پیسا خرچ کرنے کے نت نئے طریقے ایجاد کرنا اور مردوں کو مختلف طریقوں سے ذہنی اذیتیں دینا ان کا شیوہ ہے۔

مغربی خواتین کے پاس چغلی اور غیبت کے لیے کوئی وقت نہیں۔ یہ قوم وقت کا صحیح استعمال جانتی ہے اور یہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔ ہماری قوم کی زیادہ تر ذہنی صلاحیتیں اور مادی وسائل اُن چیزوں کے لیے وقف ہیں جنھیں مغربی اقوام لائق توجہ نہیں گردانتیں۔

امریکی خواتین کا حلیہ ملاحظہ فرمائیں.... پھٹی ہوئی، پیوند لگی جین، ٹی شرٹ یا فراک، پیروں میں چپل! اگر میک اپ کیا ہے تو معمولی سا! زیادہ تیز میک اپ صرف بزرگ خواتین کرتی ہیں۔

اشیائے خورونوش

سبزیاں اور پھل کٹے کٹائے منجمد حالت میں مل جاتے ہیں۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ان سبزیوں اور پھلوں میں ذائقہ ندارد ہے۔ تازہ پھل اور سبزیاں مہنگی ہیں۔ البتہ کٹی کٹائی سبزیوں کی سہولت زبردست ہے۔

ہمارے ہاں اگر پالک یا ساگ پکانے کا ارادہ کر بیٹھیں تو سارا دن انھیں صاف کرنے میں گزر جاتا ہے۔ ساگ دھونا اور کترنا علیحدہ مشقت ہوتی ہے۔ باقی سارے کاموں کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔

امریکا میں پھلوں کے رس تازہ پھلوں کی نسبت بہت سستے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں پھلوں کا رس صرف بیمار کو نصیب ہوتا ہے، وہ بھی اسی صورت میں جب تیماردار خوش حال ہوں۔

امریکا میں اشیائے خورونوش کی فراوانی دیکھ کر اپنے ہاں گلیوں میں کوڑا کریدتے ہوئے بھوکے ننگے بچے یاد آتے ہیں۔ یہاں کے معمر افراد بھی بڑے چاق چوبند اور کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔

امریکا میں میٹرک تک تعلیم مفت ہے۔ البتہ کالج بہت مہنگا ہے۔ اکثر طالب علم قرض لے کر پڑھتے ہیں۔ بعض طلبہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ جزوقتی ملازمت کرتے ہیں۔ شہری بڑے باضمیر اور فرض شناس ہیں۔ اپنی مدد آپ کے تحت اسکول، کالج اور اسپتال چلاتے ہیں۔

کیسے کیسے لوگ!

امریکا میں ہماری کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ سب سے پہلی ملاقات تو ہمشیرہ کی ہمسائی محترمہ روتھ سے ہوئی۔ موصوفہ کسی اسکول میں معلمہ تھیں۔ باتوں سے بڑی ہوشیار اور تیز طرار لگیں۔ اُن کی ہوشیاری تو خیر ہمیں گوارا تھی لیکن اُن کے شوہر نامدار فرینک کی چڈی نما نیکر اور نیم برہنہ ٹانگیں دیکھ کر ہم بڑے جزبز ہوئے۔ ہمارے ہاں بھلا ایسا کب ہوتا ہے؟

یہ حضرت چار انگل کی نیکر پہن کر دندناتے ہوئے چلے آتے اور ہم بغلیں جھانکنے لگتے۔ دن دہاڑے ایک غیر مرد کی یہ جسارت ہمیں بہت ناگوار گزرتی۔ موصوف ایک ٹیلی فون کمپنی میں انجینئر تھے اور گفتگو سے خاصے معقول لگتے۔ لیکن بعد میں دیگر لوگوں کو لباس سے باقاعدہ الرجک دیکھا تو ان کے مقابلے میں فرینک خاصے پردہ پوش معلوم ہوئے۔

ہمارے بہنوئی کی ایک سیکرٹری "این" تھیں۔ بہت موٹی، بے فکری اور حد درجہ باتونی۔ ہم نے انھیں پاکستانی تحائف دیے تو موصوفہ اتنی نہال ہوئیں کہ ہمارے لیے پیزا بنا لائیں۔ اپنا بنایا ہوا پیزا اچھی انڈیل انڈیل کر خود ہی کھائیں اور پیزا بنانے کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ ہمارے پلے تو خیر کیا پڑتا، البتہ این کے کھانے کی رفتار دیکھ کر حیران ہوتے رہے۔ زیادہ تر امریکی خواتین ہمیں بے فکری، باتونی اور چٹوری لگیں۔ یہ لوگ سارا دن کھاتے بلکہ چرتے رہتے ہیں۔ سنیکس، فاسٹ فوڈز، کولڈ ڈرنکس، کینڈیز، فرینچ فرائز، جوسز، آئس کریم اور نجانے کیا کیا الا بلا!

امریکا میں خاندانی نظام کافی کمزور ہے۔ اٹھارہ سال کے ہوتے ہی قانونی طور پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنی مرضی کے مالک ہو جاتے ہیں۔ پھر ماں باپ کی نافرمانی ان کا وتیرہ بن جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے کی پابندیوں اور حدود و قیود کا یہاں کوئی تصور موجود نہیں۔

ہمارا معاشرہ جن رشتوں کے تانے بانے سے تشکیل ہوتا ہے، ان کی خوبصورتی اور اہمیت کا اندازہ امریکا جیسے مادر پدر آزاد معاشرے کو دیکھ کر ہوا۔ وہاں پرانی نسل (والدین) کے تجربوں سے مستفید ہونے کی بجائے، انھیں "اولڈ ہومز" بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں خستہ حال بوڑھے اپنی بے نور آنکھوں سے لمحہ بہ لمحہ بڑھنے والی موت کو بے بسی سے دیکھتے رہتے ہیں۔ بڑھاپے کا کرب اور اذیت بانٹنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

ہمارا مذاق مت اڑاؤ

بہن اور بہنوئی کے پاکستانی دوستوں کو ہماری آمد کی خبر مل چکی تھی۔ لہٰذا دعوتوں کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ کھانے بہت متنوع اور مزیدار ملے۔ لیکن بدمزگی اس وقت پیدا ہوتی جب اکثر پاکستانی اس قسم کے سوال پوچھنے لگتے:

"ہور سناؤ! فیر کیہ حال اے پاکستان دا؟"

"اج کل فیر کیہڑا رولا پیا ہویا اے جی؟"

"ساڈے جی مچھراں تے مکھیاں دا کی حال اے؟"

ایسے سوالات سن کر ہمارے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ لیکن ہمشیرہ کی خصوصی ہدایات کے پیش نظر ہم کسی کے گلے نہیں پڑے بلکہ مسکرا مسکرا کر وار سہتے۔ لیکن جہاں تک ممکن ہو سکا ہم نے بھی کیمو فلاج کر کر کے طنز کے تیر چلائے اور کونین پر شکر لپیٹ لپیٹ کر انھیں کھلائی۔ جی تو چاہتا تھا کہ سب آداب بالائے طاق رکھ کر کہہ ڈالیں:

"ڈالروں کے دیس کی رنگینیوں میں گم ہو کر اپنے ملک کی غربت کا مذاق اڑانے والو! تم اسی ملک کی دھول بھری گلیوں میں کھیل کر جوان ہوئے۔ تمہارے اس غریب ملک نے آخر تم سے مانگا ہی کیا ہے! تم تو

اپنے ملک کو مسائل کی آگ میں جلتا چھوڑ کر اپنی زندگی خوبصورت بنانے اس مصنوعی جنت میں چلے آئے۔ اب کم از کم اس ولیس کا مذاق تو مت اڑاؤ جس کا خمیر آج بھی لہو کی صورت تمہاری رگوں میں زندہ ہے۔"

یو این او کی عمارت دیکھ کر مرحوم بھٹو یاد آ گئے۔ نیویارک کی عمارتیں خاموش اور باوقار انداز میں کھڑی ہیں۔ کتنے ہی لوگ آئے اور وقت کی تہوں میں دفن ہو گئے۔ ان عمارتوں کے سینوں میں بڑے بڑے راز دفن ہیں۔ انھوں نے کیسے کیسے لوگ اپنی بے جان آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ واقعی دنیا کی سب سے فانی شے انسان ہے جسے کسی طور ثبات حاصل نہیں۔ انسان دنیا میں آتا اور اپنا کردار ادا کر کے چلا جاتا ہے۔ صرف یادوں کی راکھ باقی رہ جاتی ہے۔

نیویارک میں ہمیں خاص طور پر یہ بات نمایاں نظر آئی کہ شہر میں کوئی شخص آپ کو آہستہ چلتا نظر نہیں آئے گا۔ لوگ یوں چلتے ہیں جیسے بھاگ رہے ہوں۔ اپنے ملک میں تو بیشتر لوگ یوں چلتے ہیں گویا پیر اٹھا کر زمین پر احسان کر رہے ہوں۔ جیسے وقت کی طنابیں ان کے ہاتھ میں ہیں، جدھر چاہیں موڑ دیں۔

ایک دفعہ ہم ایک پاکستانی انجینئر کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ ان کے ہاں پہنچے تو انھوں نے بے تکلفی کے کچھ ایسے مظاہرے شروع کر دیے گویا ہم بچپن میں ان کے ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے ہیں۔ بیگم بازار گئی ہوئی تھیں اور شوہر محترم زبان کا زنگ اتارنے کے لیے تھر برا جمان تھے۔

موصوف نے ہمیں اپنی کامیابی کی تفصیل سے آگاہ کیا کہ کس طرح انھوں نے اپنے بھانجوں اور بھتیجوں کو قصائی کی دکان کھول کر امریکا بلایا اور کسی کو نائی ظاہر کر کے امیگریشن دلوائی۔ ہر کہانی کا اختتام ایک زوردار قہقہے پر ہوتا۔

ہم برملا یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ وہ واقعی

اقوال زریں

☆ اللہ کا خوف انسانی خوف کو دور کر دیتا ہے۔

☆ ہر شام سوچو کہ دن کے وقت تم سے کوئی بات منشائے ایزدی کے خلاف تو نہیں ہوئی اور پھر سجدے میں گر کر اگلے دن کو بہتر طور پر گزارنے کی دعا کرو۔

☆ جب آئے دن تمھاری رائے بدلتی رہتی ہے تو پھر اپنی رائے پر بھروسہ کیوں کرتے ہو۔

☆ زیادہ خوشحالی اور زیادہ بدحالی دونوں برائی کی طرف لے جاتے ہیں۔

☆ اتنا کھاؤ جتنا ہضم کر سکو اور اتنا پڑھو جتنا جذب کر سکو۔

☆ جو دنیا کا طالب ہے وہ علم سیکھے اور جو آخرت کا طالب ہے وہ اپنے علم پر عمل کرے۔

☆ جو شخص انتقام کے طریقوں پر غور کرتا رہتا ہے اس کے زخم ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔

☆ بہترین قول ذکر، بہترین فعل عبادت اور بہترین خصلت حلم ہے۔

☆ تونگری کے مفاسد افلاس کے مصائب سے بدرجہا شدید تر ہیں۔ (انتخاب: ملک شاہد، اسلام آباد)

ایک زبردست منتظم اور ماہر منصوبہ ساز ہیں۔ امریکی حکام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے ہمیں امریکا میں اپنی جائداد کی تفصیلات سے بھی آگاہ کیا۔

ہم مرعوب ہو کر بے ہوش ہونے ہی والے تھے کہ ان کی بیگم تشریف لے آئیں۔ بیگم سے سلام دعا کے علاوہ کوئی بات چیت ممکن نہیں تھی کیونکہ شوہر موصوف نے انھیں جھاڑ پلا کر باورچی خانے کی طرف روانہ کر دیا کہ دیر ہو چکی۔ موصوف پھر بے سروپا باتوں سے ہماری تواضع فرمانے لگے۔

ان کی ساری کاوش اس نکتے پر مرکوز تھی کہ ہم ان کی عظمت کا برملا اعتراف کریں جو ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی سزا کے بعد کھانا تیار ہونے کی نوید ملی۔ گفتگو سے فیض یاب ہو کر حق نمک تو ہم ادا کر ہی چکے تھے۔ اب کھانا تو بہرطور ہمیں کھانا ہی تھا۔

کھانے کے دوران میزبان کی گولہ باری کا رخ اپنی بیگم کی طرف تھا۔ ہر کھانے پر ایسے ایسے اعتراضات صادر کیے جو ہمارے ذہن کے کسی کونے میں نہیں تھے۔ بیگم صاحبہ بھی شاید اس سلوک کی عادی تھیں، ہنس ہنس کر داد دیتی رہیں۔ نجانے ان ذات شریف کو وہ کب سے برداشت کر رہی تھیں جن کی محض دو گھنٹے کی رفاقت ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھی۔

ویسے سچی بات یہ ہے کہ امریکا میں ہمیں اکثر ایسے پاکستانی نظر آئے جنھوں نے امریکا آ کر نجانے کون سا کارنامہ انجام دے دیا تھا کہ وہ اسی فخر میں سر تا پا مبتلا تھے۔ اپنے ملک کا ذکر تحقیر آمیز انداز میں کرنا اور اپنی ذات سے وابستہ ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا ان پاکستانیوں کا وتیرہ ہے۔

خصوصاً وہاں کی بعض خواتین ہمیں بالکل ابنارمل لگیں۔ ذہنی طور پر وہ پاکستانی خواتین سے ہرگز مختلف نہیں۔ پاکستان میں مقبول ہر فیشن وہاں بھی موجود ہے۔ ہر نئے ڈیزائن کا کپڑا اور پہناوا وہاں ملا۔ لیکن یہ خواتین امریکی خواتین کی طرح عملی نہیں ہیں۔ بہرحال میزبان کی طرف سے رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔

عام پاکستانیوں کے حالات دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ ڈاکٹر تو یہاں خاصے خوش حال ہیں، باقی لوگوں کا حال پتلا ہے۔ سارا کنبہ کام کرتا ہے تب نان شبینہ کا انتظام ہوتا ہے۔ لوگ سالہاسال پاکستان نہیں آتے۔ قریبی عزیز انتقال کر جائیں تو وہیں بیٹھ کر فاتحہ پڑھ لیتے ہیں۔

ویسے بھی امریکا رہنے والوں کے جذبات سرد ہو جاتے ہیں۔ تبھی ان کے نزدیک رشتوں کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ تیز رفتار زندگی میں رشتے ایک ثانوی سی چیز بن کر رہ جاتے ہیں۔ ہم جیسے پُرسکون اور آسائشوں کے متلاشی یہاں آ کر مخبوط الحواس لگتے ہیں۔

واشنگٹن کا دورہ

ہم تو صرف تماشائے اہل کرم دیکھنے آئے تھے اور دیکھ رہے تھے۔ ہفتے کے آخری دن ہمارا واشنگٹن ڈی سی جانے کا پروگرام بنا۔ انور بھائی کے ایک دوست قدیر وتی کے گھر ٹھہرنا تھا۔ ہم لوگ گاڑی میں سوار ہوئے۔ چند گھنٹے کا سفر خاصا پُرفضا اور سرسبز تھا۔ بوریت بالکل نہیں ہوئی۔ قدیر وتی کے گھر پہنچ کر ایسا لگا

جیسے اپنے ہی گھر آ گئے ہوں۔ ان کی بیگم بڑی خلیق اور ملنسار تھیں۔ چہرہ بڑا پرکشش تھا مگر آنکھوں میں اداسی کی دبیز تہ لیے ہوئے۔

بات چیت کا سلسلہ چلا تو معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا خون کی کسی بیماری میں مبتلا ہے۔ شاید اسی لیے ان کی شخصیت پر اداسی کا بے نام سا تاثر تھا۔ صبح ناشتے کے بعد سیر و تفریح کو نکلے۔ سب سے پہلے واشنگٹن یادگار دیکھنے گئے۔ یہ ایک چوکور سا اونچا منار ہے۔ اوپر جانے کے لیے لفٹ کا انتظام ہے۔ ہمیں بلند جگہوں پر جانے سے خوف آتا ہے۔ لفٹ میں بند ہونے کا تو یا قاعدہ فوبیا ہے۔ لیکن میزبانوں کا ساتھ دینے کے لیے ہمیں بھی سوار ہونا پڑا۔

بعض امریکی جوڑے لفٹ میں راز و نیاز میں مصروف تھے۔ لاحول پڑھنے پر اکتفا کیا۔ ہمیں ویسے ہی میناروں اور عمارتوں پر کھڑے ہونے والے لوگ احمق نظر آتے ہیں۔ بھلا ان بے جان اینٹوں اور میناروں سے آخر کیا فیض حاصل ہوتا ہے؟ جھانکنا ہے تو کسی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو، دنیا کے کئی رنگ نظر آئیں گے۔

ہماری اگلی منزل جیفرسن میموریل تھا جو چاندی کی طرح سفید گنبدوں والی عمارت ہے۔ اس کے عین درمیان امریکا کے آنجہانی صدر جیفرسن کا قدِ آدم مجسمہ نصب ہے۔ ہر شخص نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں طرح طرح کے بت نصب کر رکھے ہیں۔ مشہور آدمیوں کے مجسمے بنانا انگریزوں کی روایت ہے۔ آج بھی پاکستان میں کئی جگہوں پر انگریزوں کے چھوڑے ہوئے بت نظر آتے ہیں۔

امریکی مرد...... دیکھنے کی چیز

ہمارے بیٹے کو زیادہ تر بہنوئی گود میں لیے رکھتے۔ ہمارا بھی کبھار جی چاہتا تو اٹھا لیتے۔ یہ دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ امریکا میں مرد کی بالادستی کا کوئی تصور موجود نہیں۔

یہاں مردوں کو برتن صاف کرتے، فرش چمکاتے، بچے کا ڈائپر بدلتے یا باقی کام کرتے دیکھ کر عجیب مسرت کا احساس ہوتا۔ جی چاہتا کہ صاحب کو پکڑ پکڑ کر یہ مناظر دکھائیں اور خوب طعنے دیں کہ جناب والا آپ تو خود چائے میں چینی ملانا بھی گوارا نہیں کرتے۔

امریکی عورتوں کی جفاکشی کی تو بہت مثالیں دی جاتی ہیں جبکہ دیکھنے کی چیز تو یہاں کے مرد ہیں جو خواتین کے شانہ بشانہ کام کرتے ہیں۔ ویسے حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے صاحب نہ صرف اپنے پیشہ ورانہ فرائض بڑی لگن اور ایمانداری سے بجا لاتے ہیں بلکہ گھر کے معاملات میں بھی بہت تعاون کرتے ہیں۔

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد وہائٹ ہاؤس دیکھنے کا پروگرام بنا۔ دیکھ کر شدید مایوسی ہوئی۔ گھنے درختوں میں گھری ہوئی معمولی سی عمارت ہے۔ ہمارے ذہن میں جو تصور موجود تھا کہ بہت پرشکوہ اور بلند و بالا عمارت ہو گی، وہ بالکل غلط ثابت ہوا۔

صاحب کی خدمت میں

آخر وہ دن بھی آ گیا جب ہم نے سات گھنٹے ہوائی سفر کے بعد اوکلوہاما سٹی کو چھوا۔ صاحب اسی

امریکی شہر کے مضافات میں فوجی کورس کر رہے تھے۔ وہ ہوائی اڈے پر سراپا انتظار اور مجسم شوق بنے کھڑے نظر آئے۔ ہم پر بھی نئی دلہنوں کی سی شرم اور گھبراہٹ طاری تھی اور خوامخواہ پیاری پیاری سے ہو رہے تھے۔ صاحب پر بھی تھوڑا تھوڑا دولہا پن طاری تھا۔

ان کے دوست ظفر بھائی اور فرحت بھابی بھی موجود تھے۔ فرحت بڑے پیار سے ملی۔ اس کا گھر بڑا خوب صورت اور آرام دہ ہے اور ساتھ ہی اس کا دل لبھانے والا مہمان نوازی کا قرینہ۔ دو روز ہم نے وہیں قیام کیا کیوں کہ صاحب کی بھی چھٹی تھی۔ ان دو دنوں میں فرحت نے تقریباً سارے پاکستانی کھانے ہمیں پکا کر کھلائے۔

ہمارے امریکا پہنچنے تک فرحت اور ظفر بھائی ہفتے کے دن ان کے گھر جاتے اور صاحب کو بہت سے کھانے پکا کر دے آتے۔ صاحب نے کورس کے آغاز میں تو امریکی کھانوں پر گزارا کیا کیونکہ وہ باورچی گیری کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔

مگر ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور کے مصداق امریکی کھانے صرف دکھانے کے ہوتے ہیں۔ ابلی گوبھی، آلو اور مایونیز بھلا کون روز روز کھا سکتا ہے؟ ان سے زیادہ ذائقہ دار تو ہمارے ہاں "چکڑ چھولے" ہوتے ہیں! یہ کھانے آپ ایک وقت سے زیادہ برداشت ہی نہیں کر سکتے" سو صاحب نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیے اور خود پکانے لگے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ فرحت سے فون پر ترکیبیں پوچھ پوچھ کر کھانا پکاتے۔ فرحت ہمیں یہ واقعات ہنس ہنس کر سنا رہی تھی اور صاحب خجل ہو رہے تھے۔ بہرحال ہم بہت محظوظ ہوئے کیونکہ شادی کے اوائل میں ہم پر جو کڑا وقت گزرا تھا، اس کا صاحب کو خوب اندازہ ہو چکا تھا۔

کھانا پکانے کا کام تو ہم منٹوں میں نمٹا لیتے، اصل مسئلہ استری کا تھا۔ صاحب کی وردی اتنی موٹی تھی کہ جسم و جاں کی ساری طاقت صرف کر کے استری کرنا پڑتی۔ اس سے اپنے فوجی دھوبی بہت یاد آئے جن کی خدمات کا ہم لوگ کبھی اعتراف نہیں کرتے۔

امریکیوں کی ترقی کا راز

امریکا آ کر سب سے زیادہ پیار اپنے مزدور طبقے پر آیا۔ اب پتا چلا کہ یہ ہمارے ملک کا سب سے مظلوم طبقہ ہے جو ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہے۔ اپنے گھروں میں کام کرنے والی ماسیاں بھی یاد آئیں جن کی سارے مہینے کی مشقت کا اجر صرف چند سو روپوں میں ادا کر کے ہم لوگ حاتم طائی کی قبر پر لات مار دیتے ہیں۔ دھوبی، نائی، جمعدار... ان لوگوں کی خدمات کا نہ صرف قلیل معاوضہ دیا جاتا بلکہ انھیں معاشرے میں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

لیکن امریکا میں صفائی کرنے والے بھی کار پر آتے اور مقررہ وقت میں کام ختم کرتے ہیں۔ پھر آپ کے باورچی خانے سے کافی پیتے اور لمحے لمحے کی قیمت وصول کر کے اپنی راہ لیتے ہیں۔ یہاں ہر طبقہ عزت اور خودداری کی زندگی گزارتا ہے اور کسی طبقے کو جبر و قہر کا لائسنس نہیں دیا گیا۔ یہی اس معاشرے کا حسن ہے اور یقیناً امریکیوں کی حیرت انگیز ترقی کا راز بھی یہی ہے۔

قارئین کے لیے تحفہ خاص

ذکر چند سرپھروں کا

ان غیر معمولی ہستیوں کا پُرلطف تذکرہ
جنھوں نے اپنے مخصوص ڈھنگ میں قلندرانہ زندگی گزاری
اور دنیاوی رغبتوں کی سمت کم ہی مائل ہوئے

پروفیسر ظریف خان

پنسلین کے موجد الیگزینڈر فلیمنگ خاصے غائب دماغ شخص تھے اور مردم بیزار بھی۔ وہ گھنٹوں لیبارٹری میں تنہا بیٹھے کام میں محو رہتے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اسی قسم کے "سرپھرے" لوگ ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے نام بھی کمایا۔ ایسے ہی چند سرپھروں کا تذکرہ پیش ہے۔

بھائی یوسف

فن خوش نویسی کے امام، خطاط اعظم اور دہلوی طرز کتابت کے بانی حافظ محمد یوسف دہلوی ادبی و سماجی حلقوں اور دوست احباب میں بھائی یوسف کے نام سے پکارے جاتے۔ موصوف غضب کے سرپھرے اور بددماغ تھے بدلحاظ نہیں! ان کا آبائی تعلق جنڈیالہ شیر خان (ضلع گوجرانوالہ) سے تھا۔ والد منشی محمد دین جنڈیالوی اعلیٰ درجے کے خوش نویس تھے جو انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں دہلی چلے گئے۔ اسی شہر میں 1894ء میں یوسف دہلوی کی ولادت ہوئی۔ ممتاز مورخ اور ادیب ضیاء الدین برنی ان کے بڑے بھائی تھے جو 1889ء میں پیدا ہوئے۔ بھائی یوسف سے چھوٹے منشی عبدالقدیر تھے جنھوں نے سیاست میں بڑا نام کمایا۔ وہ 1930ء سے تادم مرگ انڈین نیشنل کانگریس کی مرکزی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ضیاء الدین برنی تو فوراً یہاں آ گئے۔ لیکن بھائی یوسف اور منشی عبدالقدیر دونوں کانگریس کے وفادار اور طرف دار تھے اسی لیے انھوں نے بھارت ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔

بھائی یوسف نے 1914ء میں سینٹ اسٹیفن کالج دہلی سے بی اے کیا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان گریجوایٹ خال خال ہی دستیاب ہوا کرتے۔ بھائی یوسف اگر چاہتے تو باآسانی کوئی اعلیٰ سرکاری ملازمت اختیار

کر لیتے مگر انھوں نے اپنے خاندانی فن کو سرکاری منصب پر ترجیح دی۔ انھوں نے چند برس مولانا محمد علی جوہر کے روزنامہ "ہمدرد" اور کانگریسی علما کی جماعت یعنی جمعیت علمائے ہند کے اخبار "الجمعیۃ" سے وابستگی اختیار کر لی۔ بعد ازاں ذاتی کام شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی شہرت دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچی۔ آپ ماشا اللہ حافظِ قرآن اور قاری بھی تھے مگر اُن کی اس خصوصیت سے بہت کم لوگ واقف ہوئے۔

پاکستان کے پہلے وزیراعظم، شہید ملت لیاقت علی خان آپ کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ چنانچہ مملکت پاکستان قائم ہونے کے بعد جب ملک میں اپنے زرِ کاغذی (کرنسی نوٹ) جاری کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا تو اس پر تحریری کلمات لکھنے کے لیے کسی اعلیٰ درجے کے خطاط کی ضرورت پڑی۔ لیاقت علی خان اور وزیرِ خزانہ غلام محمد کے روبرو متعدد خطاطوں کے نمونۂ فن پیش کیے گئے مگر وہ کسی سے بھی مطمئن نہ ہوئے۔

آخرکار قرعہ انتخاب بھائی یوسف کے نام پر جا ٹھہرا۔ لیاقت علی خان نے بھائی یوسف کو بذریعہ سرکاری خط دعوت دی کہ وہ محض چند روز کے لیے پاکستان آ کر یہ کام انجام دے ڈالیں مگر وہ آمادہ نہ ہوئے۔ آخر لیاقت علی خان نے اُس وقت کے وزیرِ تعلیم ہند ڈاکٹر ذاکر حسین سے ذاتی حیثیت میں یہ درخواست کی کہ وہ بھائی یوسف کو آمادہ کریں۔ بھائی یوسف کے دل میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے لیے بڑا احترام تھا۔ اس لیے اُن کی فرمائش رد نہ کر سکے اور پندرہ یوم کے لیے کراچی آ گئے جو اُن دنوں پاکستان کا دارالحکومت تھا۔

بھائی یوسف کے بھتیجے علاؤ الدین خالد کراچی میں معروف ناشر و تاجرِ کتب تھے۔ بھائی یوسف نے بندر روڈ (موجودہ ایم۔اے۔جناح روڈ) پر واقع اُن کے فلیٹ میں قیام کیا۔ اُس دور کا کراچی انتہائی صاف ستھرا، ہرا بھرا اور دل کش شہر تھا۔ بھائی یوسف نے کام کاج تو رکھا ایک طرف اور کراچی کے گلی کوچوں اور مضافات کی تفریح میں مگن ہو گئے۔ وہ مچھلی کا شکار کرنے کے شوقین تھے سو کئی روز تک کراچی کے قریبی ضلع ٹھٹھہ کی جھیلوں اور ندیوں میں اپنی صیادی کا شوق پورا کرتے رہے۔

اس دوران کئی بار وزیراعظم بذاتِ خود ان کے پاس آئے اور نوٹوں پر لکھنے کا کام جلد انجام دینے کی درخواست کی۔ مگر بھائی یوسف ٹالتے چلے گئے۔ تاہم ایک روز جب ذوقِ کتابت اُمڈا تو پھر محض چند گھنٹوں کے دوران ایک، دو، پانچ، دس اور سو روپے کے نوٹوں پر کتابت لکھ ڈالی۔ اُن کی لکھائی آج بھی "کاغذی زر" پر نظر آتی ہے۔ پھر مزے کی بات یہ کہ اُنھوں نے اس خدمت کا معاوضہ بھی قبول نہیں کیا۔ انھیں کراچی اور پاکستان اس حد تک پسند آیا کہ پھر بھارت جانے کا ارادہ ترک کر بیٹھے اور یہیں کے ہو رہے۔ اُنھوں نے بے شمار کتب کے سرورق لکھے اور اعلیٰ درجے کی خطاطی کی۔

بھائی یوسف کے سرپھرے پن کا ایک "تاریخی" واقعہ اور پڑھ لیجیے۔ برصغیر کے ممتاز ادبی صحافی ظفر نیازی مرحوم نے کراچی سے "نقاد" نامی جریدے کا اجرا کیا۔ وہ بھی بھائی یوسف کے بے تکلف دوست تھے۔ انھوں نے بھائی یوسف سے درخواست کی کہ وہ اُن کے جریدے کی لوح سرورق لکھ دیں۔ بھائی یوسف نے حسبِ عادت کام کو تعطل میں ڈال دیا۔ ظفر نیازی نے بھی قسم کھائی تھی کہ وہ یہ کام بھائی یوسف ہی سے کروا کر

دم لیں گے۔ یوں تین ماہ تک پرچے کی پہلی اشاعت معرضِ التوا میں رہی۔ ظفر نیازی مرحوم کی یہ خواہش بھی تھی کہ پرچے کے دفتر کا سائن بورڈ بھی بھائی یوسف اپنے دستِ مبارک سے لکھ دیں۔ مگر ان کی یہ آرزو پوری ہونے کے آثار دور دور تک دکھائی نہ دیتے۔ البتہ ظفر نیازی نے ایک خوبصورت بالکل سادہ تختہ رنگ و روغن سے مزین کرا کر دفتر کے باہر نصب کر رکھا تھا۔

وہ سادہ تختہ تین ماہ تک یوں ہی معلق رہا۔ بھائی یوسف کا قیام "نقاد" کے دفتر سے چند گز کے فاصلے پر واقع تھا۔ ایک شام وہ چہل قدمی کرتے دفترِ نقاد کے سامنے سے گزرے۔ نہ معلوم انھیں کیا سوجھی؟ اُس وقت دفتر بند تھا۔ بھائی یوسف نے وہیں نزدیک واقع اسٹیشنری کی دکان سے ایک چاک خریدا۔ پھر اسی دکان کے مالک سے اسٹول لے کر دفتر کی سیڑھیوں پر رکھا اور اُس پر کھڑے ہو کر خالی بورڈ پر ماہنامہ نقاد کراچی کے الفاظ کا دل کش خاکہ بنایا، اسٹول سے اترے، مالک کے حوالے کیا اور پھر ہاتھ جھاڑتے خراماں خراماں اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔

اگلی صبح جب ظفر نیازی مرحوم دفتر آئے تو خالی بورڈ کو "بھرا" دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انھوں نے فوراً ایک ماہر پینٹر بلا کر خالی جگہوں کو پُر کروایا۔ پھر اس تیار شدہ بورڈ کی مختلف زاویوں سے عکاسی کی گئی۔ ایک بہترین تصویر کا انتخاب کر کے اُس کا گٹکا (Block) بنوایا اور یوں صاحب!...... دن کے دن سرورق کے لیے بہترین لوح تیار ہو گئی۔ باقی سب کام تو تیار ہی تھا۔ نیازی صاحب نے جھٹ پٹ سرورق بنوا کر پرچہ چھپنے بھیج دیا۔ یوں نقاد کا پہلا شمارہ منصۂ شہود پر آ گیا۔

لیکن جناب!...... کہانی ختم نہیں ہوئی یہاں سے تو اصل داستان شروع ہوتی ہے۔ پرچہ شائع ہوتے ہی مرحوم نیازی اُس کی ایک کاپی لیے بھائی یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ نذر گزاری۔ مگر یہ کیا؟...... جیسے ہی بھائی یوسف کی نظر پرچے کی لوحِ پیشانی پر پڑی تو اپنی "خطاطی" دیکھ کر چراغ پا ہو گئے۔ انھوں نے رسالہ ایک طرف پھینکا اور نیازی مرحوم کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اگلے ہی دن انھوں نے نیازی صاحب مرحوم پر مبلغ پانچ ہزار روپے ہرجانہ ادا کرنے کا عدالتی دعویٰ دائر کر دیا۔

بھائیو! اُس دور کے پانچ ہزار سکہ رائج الوقت 32 لاکھ روپیہ سے بھی زائد ہیں۔ یہ سر پھرا پن نہیں تو اور کیا ہے کہ جس فن کار نے سرکار سے ایک پیسا بھی نہ لیا' وہ دیرینہ دوست سے پانچ ہزار روپے طلب کر رہا تھا۔ مرحوم نیازی نے بڑی معافی تلافی کے بعد مبلغ پانچ سو روپے دے کر اپنی جان چھڑائی۔ چند روز بعد بھائی یوسف نے نہایت بے نیازی کے ساتھ وہ رقم انھیں واپس کر دی۔ دوستی پھر بحال ہو چکی تھی۔

ریڈیو پاکستان کا علامتی نشان (LOGO) "قولوا للناس حسنا" بھی بھائی یوسف کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ اُس وقت کے ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان، ممتاز شاعر اور صدا کار مرحوم زیڈ-اے-بخاری کا دل گردہ ہی تھا کہ وہ بھائی یوسف سے یہ خدمت لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ورنہ تو وہ ٹھینگے پر ہاتھ ہی نہ رکھنے دیتے تھے۔ بھائی یوسف کے تحریر کردہ طغرے اور الواح آج بھی دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ کرتی ہیں۔

بھائی یوسف نے تقریباً 83 برس کی عمر پائی لیکن تمام زندگی درویشانہ، قلندرانہ اور بے نیازانہ گزار دی۔

وہ شادی سے ہمیشہ مجتنب رہے۔ اُن کی بے نیازی محض ازدواجی جھمیلوں سے بچنے تک ہی محدود نہ تھی بلکہ وہ لباس تبدیل کرنے حتیٰ کہ منہ ہاتھ دھونے اور دانتوں کی صفائی کرنے سے بھی بچے رہنے کی کوشش کیا کرتے۔ اس کے باوجود حیرت انگیز طور پر اُن کی بینائی آخر عمر تک سلامت رہی۔ یہی نہیں بلکہ وقتِ رحلت اُن کے منہ میں تقریباً تمام دانت مضبوطی سے جڑے ہوئے تھے۔ وہ بوڑھے ضرور تھے دبلے پتلے، لیکن ضعیف یا نحیف و نزار نہیں۔ پیرانہ سالی کے باوجود بھائی یوسف کئی کئی میل پیدل چلتے۔ اُنھیں کبھی عصائے پیری کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک مرتبہ وہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر اور میلا کچیلا قمیص پاجامہ پہن کر بخاری صاحب کے دفتر جا دھمکے۔

جب وہ چند منٹ بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہونے لگے تو بخاری صاحب نے کہا: "بھائی یوسف!.....اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک عرض کروں؟"

بھائی صاحب بولے: "ہاں بھئی!.....کہو.....کیا بات ہے؟"

زیڈ۔اے بخاری نے بڑے ادب کے ساتھ جواب دیا: "بھائی یوسف!.....کبھی کبھی نہا بھی لیا کرو..... اللہ تعالیٰ تمھیں اور میل عطا کرے گا۔"

بھائی یوسف یہ بات سن کر مسکرائے اور کوئی جواب دیے بغیر باہر چلے گئے۔

بھائی یوسف کے صرف تین شوق تھے: سیر و تفریح، شکار اور کثرتِ چائے نوشی۔ اور وہ جو کہا جاتا ہے کہ "سیاح اور شکاری حضرات بڑی مبالغہ آرائی کرتے ہیں۔" یہ مثال بھائی یوسف پر صادق آتی تھی۔ ان کے بقول اُنھوں نے انسانوں کے علاوہ ہر ذی روح کا شکار کیا۔ اُنھوں نے پچیس فٹ لمبا شیر بھی مارا اور پندرہ فٹ اونچے گینڈے کو بھی نشانہ بنا ڈالا۔ جانوروں کے اس "حجم" سے بھائی یوسف کی شکاری داستانوں کی "صداقت" کا اندازہ خود لگا لیجیے۔ یہ لطیفہ بھی اُنھیں سے منسوب ہے کہ ایک بار اُنھوں نے شیر کے سر پر گولی ماری تو وہ اس کے ایک پچھلے پنجے سے ہو کر باہر نکلی۔ بعد میں اُن کے کسی مصاحب نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: دراصل شیر اپنے پچھلے پنجے سے اپنا سر کھجا رہا تھا۔"

قیامِ پاکستان سے کئی برس پہلے بھائی یوسف نے ہندوستان کے ایوانِ پارلیمان کو اپنی خطاطی سے مزین کیا۔ اُنھوں نے پورا قرآن کریم دہلوی خطِ نستعلیق میں کتابت کیا تھا۔ وہ نسخہ شائع بھی ہوا لیکن چند علما کرام کی مذمت اور مخالفت کے سبب عام نہ ہو سکا۔ آج وہ نادر نسخہ نایاب ہے۔

گیارہ مارچ 1977ء کو اس نابغہ روزگار ہستی کا سڑک کے حادثے میں انتقال ہو گیا۔ ایک ظالم اور سنگ دل بس ڈرائیور نے اس مجسمِ علم و فن کو اُن کی رہائش گاہ کے سامنے ہی قتل کر دیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

استاد حمید

کراچی کے دل "صدر" کا علاقہ رتن تلاؤ ایک دور میں خودکار گاڑیوں کی مرمت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اب وہاں موٹر سائیکلوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے جن کی سیکڑوں دکانیں وہاں قائم ہیں۔ مگر 60ء کی دہائی تک وہاں موٹر گاڑیوں کے مستریوں کا راج تھا۔ انھی میں ایک سرپھرے اور بددماغ کاریگر حمید الحمید بھی تھے جنھیں عرفِ عام میں اُستاد حمید کہا جاتا۔ بھائی

یوسف کی طرح اُن کا تعلق بھی دہلی سے تھا۔

اُستاد کی زندگی میں اُن سے بڑا موٹر مکینک کم از کم کراچی میں تو کوئی نہ تھا۔ وہ بہت دور سے آتی یا جاتی ہوئی گاڑی کی محض آواز سُن کر بتا دیتے کہ اس کے فلاں پرزے یا حصے میں کوئی خرابی ہے۔ وہ اس حد تک ماہر تھے کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کی گاڑی مرمت کرنے اُس کے محل یا کوٹھی میں نہ جاتے۔ اُنھیں گورنر جنرل حضرت قائداعظم اور وزیراعظم لیاقت علی خان کی سرکاری کاروں کی مرمت کرنے کا شرف حاصل رہا۔ مگر یہ گاڑیاں بھی اُن کے کارخانے ہی میں لائی جاتیں۔ وہ اپنے شاگردوں سے بے انتہا پیار کرتے مگر اُن کی خوب ٹھکائی بھی لگایا کرتے گالم گلوچ اس پر مستزاد۔ یہ اُن کے تھپڑوں اور مغلظات ہی کا ثمر ہے کہ اُن کے شاگردوں کے شاگرد بھی آج گاڑیوں کے شوروم اور مرمت کے کارخانوں کے مالک ہیں۔

اُستاد حمید کے ایک شاگرد نے دورانِ کار پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کرلیا۔ اُستاد حمید اُس کی کامیابی سے بہت خوش ہوئے۔ اُنھوں نے لڑکے کو اپنے ایک دوست محمد عثمان آزاد کے مشہور اخبار روزنامہ انجام میں بحیثیت پروف خواں ملازم کرادیا۔ وہ تین برس بعد وہ سب ایڈیٹر بن گیا۔ بعدازاں اُس نے یہ ملازمت چھوڑی اور فاضل پرزہ جات کا کاروبار کرنے لگا۔ پھر نجانے اُسے کہاں سے گیدڑ سنگھی ہاتھ لگی کہ موٹر سائیکل بنانے کا بہت بڑا کارخانہ قائم کرلیا۔ آج اُس "لڑکے" کی عمر 80 برس کے لگ بھگ ہے اور وہ ایک مشہور کارخانے کا مالک ہے۔ اب یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ اُسے اُستاد حمید یاد بھی ہے یا نہیں؟

پیشہ ورانہ دیانت تو استاد پر ختم تھی۔ ایک بار ایک مشہور تاجر اپنی قیمتی کار بغرضِ مرمت استاد کے پاس لے کر آئے۔ اُن کا کہنا تھا کہ میل دو میل چل کر یہ گاڑی خود بخود بند ہوجاتی ہے۔ پھر دھکے دے کر اسٹارٹ کرنا پڑتا ہے۔ اُن کے بقول وہ اس کار کی مرمت پر اُس دور میں ہزاروں روپے خرچ کر چکے تھے۔ اُستاد نے اُن سیٹھ صاحب سے کہا کہ گاڑی میں کوئی خرابی نہیں۔ سائلنسر کی نالی میں کوئی چیز پھنسی ہوئی ہے۔ ساتھ ہی اُنھوں نے اپنے ایک شاگرد کو اشارہ کیا۔ اُس نے منٹوں میں دھوئیں کی نالی کھول کر زمین پر پٹخی تو اُس میں سے ایک مردہ چوہا نکلا۔ وہ صاحب بڑے حیران ہوئے۔ اُنھوں نے استاد کو بطور انعام دو سو روپے کی خطیر رقم (اُس دور کے اعتبار سے) دی۔

خوشامد

☆ خوشامد اور تعریف کی محبت شیطان کے نہایت مضبوط داؤ ہیں۔ (حضرت علیؓ)

☆ دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ (سر سید احمد خان)

☆ خوشامد کرنے والا اور خوشامد سننے والا دونوں پست ہیں اور ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔

(والس ویلیس)

☆ خوشامد ایک میٹھا زہر ہے جو کانوں کے راستے جسم میں داخل ہوتا اور رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔

☆ نصیحت حقیقی خیر خواہی ہے جس پر ہم توجہ نہیں دیتے اور خوشامد صریح دھوکا ہے جسے ہم غور سے سنتے ہیں۔

(شیکسپیر)

(مراسلہ: حافظ احسان محی الدین)

چاہی تو استاد نے شانِ استغنا کے ساتھ یہ پیش کش مسترد کرتے ہوئے اُن امیر زادے سے کہا:

"بس میاں بھائی......لمڈے (لڑکے) کو ایک اُنّی پکڑا دو۔"

اُستاد کا ایک اہم قومی کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے لانڈھی (کراچی) میں ریڈیو پاکستان کراچی کے ٹرانسمیٹر نصب کیے۔ اُن دنوں وزارت اطلاعات و نشریات کی ایک برطانوی کمپنی سے بات چیت چل رہی تھی جو یہ کام انجام دینے کا معاوضہ پانچ لاکھ روپے طلب کر رہے تھے۔ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل زیڈ۔اے بخاری استاد حمید کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ اُنھوں نے یہ خدمات استاد حمید کے سپرد کر دیں۔

اُستاد نے اپنے دس بارہ "لمڈوں" کے ساتھ مل کر محض چند روز کے اندر اندر ٹرانسمیٹر نصب کروا لے اور اتنے بڑے کام کا معاوضہ صرف چودہ ہزار روپے طلب کیا......جی ہاں!......صرف چودہ ہزار۔ اور وہ بھی اُستاد کی جیب میں نہ گئے۔ اُنھوں نے دو ہزار تو خود رکھے اور باقی ایک ایک ہزار شاگردوں میں تقسیم کر دیا۔ استاد حمید جیسے لوگ ملک کو بنانے والے تھے اور آج؟......صرف بگاڑنے والے ہیں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ رحلت کے بعد اُستاد حمید داخلِ بہشت ہوئے ہوں گے۔

آغا جی

دہلی کے پشتی رئیس اور ممتاز ترین شاعر آغا قزلباش کے صاحب زادے آغا سرخوش قزلباش نے قیامِ پاکستان کے بعد کراچی کی معروف شاہراہ کانفلن اسٹریٹ (موجودہ شارع زیب النساء) پر کتب کی ایک شان دار دکان کھولی جس کا نام "کتابستان" تھا۔ آغا سرخوش قزلباش جو اپنے حلقۂ احباب میں صرف آغا جی کہلاتے تھے۔ اپنی دکان سے بھی زیادہ "شاندار" تھے۔ سرخ و سفید رنگت، دراز قامت اور تیکھے نقوش والے آغا جی ماضی کے ممتاز فلم اسٹار موسیٰ رضا (سنتوش کمار) سے غضب کی مشابہت رکھتے تھے۔ میں نے جب غالباً 1970ء میں اُنھیں دیکھا تو اُن کی عمر پچاس برس سے زائد نہ تھی۔ چہرہ بالکل جوانوں والا لیکن سر کے بال تو کیا بھنویں تک برف کی طرح سفید ہو چکی تھیں۔ غالباً یہ کوئی خاندانی عارضہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ سرتا پا سفید لباس میں ملبوس تھے۔ اُن کے انگریزی بوٹ بھی سفید تھے۔ حُسن اور سپیدی کا یہ امتزاج بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

اُن دنوں کتب بینی کا ذوق عام تھا اس لیے آغا جی کی دکان پر بھی کتب خرید کر پڑھنے کے شوقین خواتین و حضرات اچھی خاصی تعداد میں آیا کرتے۔ آغا صاحب کے لیے کتب فروشی کاروبار نہیں بلکہ ذوق کی تسکین کا ذریعہ تھا۔ وہ تو "صاحبوں" کے مانند گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر کسی کتاب کے مطالعہ میں غرق رہتے جب کہ اُن کے دو ملازمین گاہکوں کو بھگتاتے۔ البتہ خاص خاص گاہکوں یا احباب سے خود آغا صاحب لین دین کیا کرتے۔

آغا صاحب "کتب فروشی" سے زیادہ اُن کے آداب کا خیال رکھتے۔ بسا اوقات کسی کتاب کے دکان میں موجود ہونے کے باوجود "خریدار" کو اس لیے ٹکا سا جواب دے دیتے کہ بقول اُن کے:

"یہ کندۂ ناتراش اس کتاب کے معنی و مفہوم ہی سمجھ نہیں سکتا۔"

ایک بار کراچی کے ایک علم دوست کمشنر تقریباً دس ہزار روپے کی کتب خریدنے کتابستان آئے۔ اُنھوں

نے اپنی سرکاری گاڑی سڑک کی ایک جانب کھڑی کی اور پھر خود تو اُسی شکستہ گاڑی میں بیٹھے رہے، ڈرائیور کو فہرست کتب اور رقم دے کر کتابستان کی طرف روانہ کر دیا۔ آغا صاحب نے ڈرائیور کے ہاتھوں کتب فروخت کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا:

"کیا تمھارے صاحب کے پیروں میں مہندی لگی ہے جو خود نہیں آ سکتے؟"

ڈرائیور نے "صاحب" کو آغا صاحب کا پیغام پہنچایا، تو وہ گاڑی سے اتر کر تیر کے مانند آغا صاحب کے پاس پہنچے اور معذرت کرتے ہوئے کتب طلب کیں۔ آغا صاحب نے اُن کی اس سعادت مندی پر خوش ہو کر کتب بغیر کسی منافع کے یعنی صرف قیمت خرید پر اُن کے حوالے کر دیں۔

ایک مرتبہ کسی بڑے خاندان کی دل کش خاتون کتب خریدنے آئیں۔ انھوں نے آغا صاحب سے کہا کہ وہ کتب کا انتخاب کرے گی۔ آغا جی نے انھیں دکان کے اندر آ کر انتخاب کتب کی اجازت دے دی۔ اُن محترمہ نے سیکڑوں کتب مختلف خانوں سے نکال کر ڈھیر کر دیں اور پھر ہر ایک کی درمیانی پشت کو دیکھ دیکھ کر اس ڈھیر سے الگ کرنا شروع کر دیا۔ آغا صاحب یہ منظر بڑی خاموشی اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ خاتون صرف اُن کتب کا انتخاب کر رہی ہیں جن کی جلد بندی فیروزی رنگ کے کپڑے سے کی گئی ہے، تو انھوں نے خاتون سے اس بات کا سبب دریافت کیا۔

محترمہ نے بتایا کہ اُن کے ڈرائنگ روم میں موجود پردے "فیروزی رنگ" کے ہیں۔ وہاں کتب کے تین خانے بھی ہیں جن میں صرف ایسی کتب کو جگہ دی گئی ہے جن کی بندش فیروزی رنگ کے کپڑے یا ریگزین سے کی گئی ہو۔ اب ان خانوں میں چند کتب کی کمی ہے اس لیے وہ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے فیروزی جلد بند کتب خریدنے آئی ہیں۔ یعنی اُن کا مقصد صرف "میچنگ" ہے۔ خاتون کی یہ بات سن کر آغا جی تھے سے اکھڑ گئے اور پھر خاتون مذکور کو یہ کہہ کر کتب فروخت کرنے سے انکار کر دیا:

"کتابیں پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ آرائش یا سجاوٹ کے لیے نہیں۔"

آغا جی نے دکان کے اوقات صبح 10 تا شام 4 بجے مقرر کیے تھے۔ اس کے بعد اُن کا "کتابستان" "محفل دوستاں" بن جاتا۔ شہر کے کئی ممتاز ادیب باقاعدہ آغا جی کی محفل شام و شب میں شرکت کیا کرتے۔ اگرچہ دکان اُس وقت بھی کھلی ہوتی، مگر آغا جی شام چھے بجے کے بعد کتب فروخت کرنا حرام سمجھتے۔ ہائے افسوس! اب نہ آغا صاحب ہیں اور نہ کتابستان۔ اُس کی جگہ کمپیوٹر، موبائل فون، سی۔ڈیز اور "ایزی لوڈ" کی ایک دکان ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

تاؤ پوریا

اُس بوڑھے ہندو اچھوت کا نام رام دیال تھا جو انیسویں صدی کے اواخر میں مشرقی یو۔پی (بھارت) کے کسی شہر سے کراچی کی گودی پر پلے داری کرنے (بوجھ اُٹھانے) کے لیے کراچی میں آیا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ قیام پاکستان سے پہلے شہر کراچی میں اُس کی عام شہرت تھی۔ وہ اپنی بزرگی اور پیرانہ سالی کے سبب "تاؤ" (تایا،

سکالرشپ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا

ادارہ آمنہ جنت نے اپنے پہلے مرحلے کا آغاز حضرت محمد رسول ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہ سکالرشپ کے تحت 125 بچے بچیوں کو سکول کی تعلیم کی فراہمی سے کر دیا ہے ایک بچے کی فیس ماہانہ خرچ کے طور پر 300 روپے فی بچہ کے حساب سے درکار ہیں ہمارے ایک اہل خیر بھائی نے 10 بچیوں کی فیس آئندہ 6 ماہ کے لیے ادا کر دی ہے جزاکم اللہ تعالیٰ!

آپ بھی کسی عظیم ہستی یا اپنے پیارے رشتہ دار کے نام سے سکالرشپ کا اجرا کر سکتے ہیں۔ یہ سکالرشپ نادار بچوں کی تعلیم کے لیے ہوگا اور ایک بچے کے سکول کی فیس اور ماہانہ اخراجات تقریباً 300 روپے ہیں اور ایک سکالرشپ سے کم از کم پانچ بچے مستفید ہوسکیں گے۔ ہمیں جن ناموں سے سکالرشپ ملے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

☆ حضرت آمنہؓ والدہ ماجدہ حضور اکرم ﷺ سکالرشپ (برائے پانچ طالب علم)

☆ حضرت عبداللہؓ والد ماجد حضور اکرم ﷺ سکالرشپ (برائے پانچ طالب علم)

☆ مسٹر اینڈ مسز مرزا صادق بیگ سکالرشپ (برائے پانچ طالب علم)

☆ مسٹر اینڈ مسز محمد شفیق خان سکالرشپ (برائے پانچ طالب علم)

اُوپر دیے گئے چار سکالرشپ سے اس وقت 20 نادار بچے سکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ بھی اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند باقی ایک سو پانچ بچوں کا سہارا بنیں۔ ہماری راہنمائی فرمائیں اور دُنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

ادارہ آمنہ جنت فاؤنڈیشن سکول کے ماہانہ اخراجات

شعبہ انگلش میڈیم کے ایک طالب علم کا ماہانہ خرچ 300 روپے اور سالانہ 3600 روپے

شعبہ تعلیم القرآن کے ایک طالب علم کا تعلیمی ماہانہ خرچ 500 روپے اور سالانہ 6000 روپے

بمع کھانا و دیگر اخراجات فی بچہ ماہانہ 3500/- روپے

ادارہ کی 20 اسٹاف اراکین عملہ کی تنخواہوں، کچن، یوٹیلٹی بلز سمیت سکول کے ماہانہ اخراجات ایک لاکھ پچاس ہزار روپے ہیں۔

صدقات و خیرات و عطیات اور زکوۃ فنڈ!

ادارہ تمام اہل خیر خواتین و حضرات سے درخواست کرتا ہے کہ آپ نیک مقصد کی آبیاری کے لیے بھرپور تعاون فرمائیں رمضان المبارک و دیگر ایام میں اپنے صدقات و زکوٰۃ فنڈ دے کر عنداللہ ماجور ہوں اپنے عطیات بذریعہ منی آرڈر بنام ادارہ ارسال فرمائیں۔ شکریہ!

اگر آپ زرتعاون چیک یا ڈرافٹ کے ذریعے ارسال کرنا چاہیں تو چیک ڈرافٹ: آمنہ جنت فاؤنڈیشن اکاؤنٹ نمبر 02745 ایم سی بی چونیاں برانچ نمبر 0240 کے نام بھجوائیں۔ آن لائن بھی جمع کروا سکتے ہیں اس صورت میں مطلع ضرور کریں آن لائن کے لیے چیک اکاؤنٹ نوٹ فرمالیں۔

نائٹل اکاؤنٹ نمبر PK86MUCB0673740401002745 ایم سی بی چونیاں۔

آمنہ جنت فاؤنڈیشن ادارہ گورنمنٹ سے منظور شدہ ہے ادارے کو دیئے جانے والے تمام عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

مزید رابطہ: رضیہ پروین آمنہ جنت فاؤنڈیشن ماڈل سکول رجسٹرڈ نمبر 5584 چونیاں ضلع قصور

فون نمبر: 0300-4735932-0322-7614497

بڑے چچا) کہلاتا۔ جب کہ "پوربیا" کا مطلب ہے" پورب یعنی مشرق، کا رہنے والا۔ اُس کی زبان ٹھیٹھ ہندی تھی۔ وہ قریباً ساٹھ برس تک کراچی رہا مگر ہمیشہ اپنے مخصوص لہجے ہی میں بات کیا کرتا۔

تاؤ پوربیا ماہر جراح اور غضب کا اعضا بند تھا، مگر وہ یہ کام فی سبیل اللہ کیا کرتا۔ وہ صبح تڑکے گودی پر مزدوری کرنے جاتا جہاں سے اُسے دو روپے ملتے۔ سہ پہر تین بجے وہ کام ختم کر کے شہر کے مشہور میری ویدر ٹاور کے فٹ پاتھ پر آ بیٹھتا۔ اُس کی ادویہ اور آلات کی صندوقچی اُس کی بغل میں ہوتی اور درجنوں مرد، عورتیں اور بچے اُس کے منتظر ہوتے۔

وہ کسی کا پھوڑا چیرتا، تو کسی کی ہڈی جوڑتا۔ ٹوٹی ہڈیاں جوڑنے اور اترے ہوئے ہاتھ پیر بٹھانے میں اُسے کمال حاصل تھا۔ خدا جانے اُسے کون سی غیبی امداد عطا کرتی کہ وہ بلا معاوضہ سب کا علاج کیا کرتا۔ اگر کوئی مریض یا متاثرہ شخص اُسے معاوضہ یا انعام دینے کی پیش کش کرتا، تو وہ جھڑک کر اُسے بھگا دیتا۔

تاؤ پوربیا نہایت منکسر المزاج اور بے لوث انسان تھا۔ وہ رات گئے تک اپنی خدمات میں مگن رہا کرتا مگر کبھی کسی نے اُسے ناراض ہوتے یا غصہ کرتے نہیں دیکھا۔

سندھ کے ممتاز سیاست دان، سفارت کار اور صحافی پیر علی محمد راشدی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ تفریحاً پوربیا کے ٹھئے پر جا کر بیٹھ گئے۔ یہ غالباً 1936 کی بات ہے اور تاؤ پوربیا اُس وقت بھی خاصا بوڑھا تھا۔ اُس نے راشدی صاحب کو دیکھا تو مسکرا کر کہا:

"تہار کاہ ٹوٹت ہے؟" (تمھارا کیا ٹوٹا ہے؟)

راشدی صاحب نے ٹھنڈی سانس بھر کر اُس کے لہجے میں جواب دیا:

"ہمارا من ٹوٹت ہے" (ہمارا دل ٹوٹ گیا ہے۔)

اس پر تاؤ پوربیا نے حسب معمول تبسم کے ساتھ کہا:

"اوپر والے کے ہوجئے" (اوپر والے کے ہو جاؤ۔)

اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

کراچی کے مشہور سول اسپتال کے انگریز سول سرجن اور میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کا بارہ سالہ بیٹا اپنے مکان کی چھت سے گر کر ہڈی پسلی تڑوا بیٹھا۔ پورے ہندوستان میں اُس کا کہیں علاج نہ ہو سکا اور وہ بچہ معذور ہو کر رہ گیا۔ کسی کے مشورے پر "سرجن" صاحب نے تاؤ پوربیا سے رجوع کیا۔ اُس کی "جھاڑ بندیوں" نے بچے کو اس اذیت اور معذوری سے نجات دلا دی۔ وہ بچہ صرف ایک ماہ کے اندر اندر ہی بھلا چنگا ہو کر چلنے پھرنے لگا۔ انگریز بہادر کی خوشی کا تو ٹھکانہ نہ رہا۔ اُس نے بطور انعام تاؤ پوربیا کو پیش کش کی کہ وہ ہسپتال کے "شعبہ امراض استخوان" میں نائب سرجن ہو جائیں۔ انھیں مبلغ آٹھ سو روپے ماہوار (آج کے 10 لاکھ سے زیادہ) تنخواہ ملے گی۔ لیکن تاؤ پوربیا نے اس خدمت سے معذرت کر لی اور تادم مرگ بنا تفریق امیر، غریب، لوگوں کی مفت خدمت بجا لاتا رہا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی تاؤ پوربیا یہیں مقیم رہا۔ اب وہ کراچی میں اچھوت ہندوؤں کے ایک قبرستان (واقع پرانا گولی مار کراچی) میں مدفون ہے۔

چریا

لفظ "چریا" تو اب اردو اور پنجابی زبانوں میں بھی مستعمل ہے لیکن دراصل یہ سندھی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی ہیں "پاگل، دیوانہ یا مجنوں"۔ ظاہر ہے کہ معنوی اعتبار سے یہ کوئی اچھا کلمہ نہیں لیکن پاکستان میں ایک معروف شخص ایسا بھی ہے جو فخر سے خود کو چریا کہتا اور سمجھتا ہے۔ یہ ہے حیدرآباد سندھ کی مشہور سیاسی و سماجی شخصیت عبدالقیوم قریشی جو 1985ء سے 1988ء کے لیے سندھ کی صوبائی اسمبلی کا رکن رہا۔ لیکن کچھ بنانے کے بجائے اپنا بنا بنایا بھی بگاڑ دیا۔ تو ہوا نا چریا۔

عبدالقیوم قریشی عرف چریا حیدرآباد کے ایک غریب علاقے، حالی روڈ (سابق کالی روڈ) کا رہائشی ہے۔ ایک نوجوان غریب مزدور، چوڑی کے کارخانے کا کاریگر اور معروف مزدور راہنما تھا۔ 1985ء میں جب جنرل ضیاالحق مرحوم کی مارشل لا حکومت نے غیر جماعتی بنیاد پر قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کرائے، تو اپنے محلے والوں اور بے شمار مزدوروں کے اکسانے پر وہ بھی اس "یدھ" میں کود پڑا۔ اس کے انتخابی اخراجات بھی مزدوروں اور اہل محلہ ہی نے برداشت کیے۔ قیوم قریشی گلی گلی محلے محلے جلسے کرتا پھرتا۔ اس کا اسٹیج اس کے گھر کی ایک چارپائی ہوتی۔ وہ جہاں جاتا وہاں اُسے بچھاتا اور پھر محو تقریر ہو جاتا۔ ایک موقع پر "تقریر" کرتے ہوئے اس نے کہا:

"بھائی، پورے پاکستان میں صرف 2 "چریے" ہیں۔ ایک صدر ضیاالحق اور دوسرا میں۔ ایک کو تم نے صدر بنا رکھا ہے تو کیا مجھے ایم پی اے بھی نہیں بنا سکتے؟"

لوگ اُس کی تقاریر سن کر ہنستے مسکراتے اور کچھ اُس کا مذاق بھی اڑاتے۔ مگر اسی مذاق ہی مذاق میں "چریا" بھاری اکثریت کے ساتھ کامیاب ہو گئے۔ اُس کے مقابل سات امیدوار تھے جن میں ایک بڑے صنعت کار اور دوسرا بہت بڑا زمیندار تھا، مگر قیوم قریشی کے رائے دہندگان نے اُن کی ضمانتیں ضبط کرا دیں۔

صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہو کر بھی "چریا" کے مکان پر ٹاٹ کا پردہ ہی پڑا رہا۔ سینٹ کے انتخابات کے دوران جب اکثر ارکان صوبائی اسمبلی گھوڑے گدھوں کی طرح بک رہے تھے، تو اُس وقت اُس نے 50,50 لاکھ روپے سے بھرے ہوئے صندوقوں کو ٹھوکر مار دی اور انھیں پیش کرنے والوں کو گالیاں بک کر بھگا دیا۔ وہ بڑی بے نیازی اور جرأت کے ساتھ عوامی بس میں بیٹھ کر صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے کراچی آیا کرتا۔ اُسے حکومت کی طرف سے 50 لاکھ روپے کا جو صوابدیدی فنڈ ملا وہ اُس نے اپنے حلقے کے چند مسائل حل کرنے پر صرف کر دیا۔ ایک ایک پیسا... جی ہاں... ایک ایک پیسا۔ آج حالی روڈ کی سڑکیں اور محلے کے گلی کوچوں میں بجلی اور گیس اُس کے حسن عمل کا ثبوت ہے۔ افسوس! صد افسوس! ایسا مخلص راہنما 1988ء کے انتخابات میں اپنی ضمانت ضبط کرا بیٹھا۔ "لسانیت" کا سیلاب اس آزاد منش آزاد امیدوار کو بھی بہا لے گیا۔ کاش! پاکستان کے سیاسی راہنماؤں میں قیوم قریشی جیسے بہت سے "چریے" ہوتے۔

روسی ادب

آخری ملاقات

کرسی کی قوت کے سامنے سرنگوں ہو جانے والے لال بجھکڑ کا عبرت انگیز افسانہ......

باکمال ادیب انطون چیخوف کے قلم سے

نکولائی ریلوے اسٹیشن میں دو دوستوں کی اچانک ملاقات ہوئی۔ ایک موٹا تھا اور ایک دبلا۔ موٹا آدمی ابھی کمرۂ طعام سے کھانا کھا کر باہر نکلا تھا۔ اس کے چکنے لب سرخ چیریوں کی طرح چمک رہے تھے۔ لباس سے خروانہ کھانوں کی خوش بوئیں اٹھ رہی تھیں۔

دبلا پتلا آدمی تھوڑی دیر قبل ہی ریل سے اترا تھا۔ وہ چھوٹے بڑے بنڈلوں سے لدا پھندا تھا۔ اس سے کافی اور گوشت کی بو آ رہی تھی۔ آدمی کے پس پشت ایک لمبی ناک والی عورت اور ایک طویل قامت لڑکا استادہ تھا۔ یہ اس کی بیوی اور بیٹا تھے۔

موٹے نے جیسے ہی دبلے آدمی کو دیکھا تو خوشی سے چلایا "اوہ فرے! کیا یہ تم ہی ہو میرے دوست! اف کتنی گرمیاں گزریں، کتنی سردیاں بیت گئیں۔"

دبلے آدمی نے موٹے کو دیکھا، تو وہ بھی حیرت کے مارے بول اٹھا "اوہ میرے خدا! میشا، میرے بچپن کے دوست، تم کہاں سے ٹپک پڑے؟"

دونوں دوست ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو چٹاچٹ بوسے دیے۔ ان کی آنکھیں دیکھتے ہی دیکھتے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ دونوں بہت خوش اور حیران دکھائی دیتے تھے۔

ملاپ کی گرما گرمی ختم ہوئی اور حواس بحال ہوئے، تو دبلا آدمی کہنے لگا: "میرے پیارے دوست! بڑی غیر متوقع ملاقات ہے۔ کچھ دیر کے لیے تو میں پریشان ہی ہو گیا۔ آؤ، قریب آ کے مجھ پہ نظر ڈالو۔ میں پہلے کے مانند چست و چالاک ہوں۔ میری تیزی وطراری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خدا میری صحت یونہی بھلی چنگی رکھے۔"

"تم بتاؤ، کیسے ہو؟ کتنی دولت کما اور عزت پا چکے؟ شادی ہو گئی؟ میں تو شادی کر چکا، تم دیکھ ہی رہے ہو..... یہ میری بیوی لوئی ہے۔ یوکرائن سے آئی ہے اور یہ میرا بیٹا نانا ٹیل ہے۔ پیار سے ہم اسے نافیا کہتے ہیں۔ تیسری جماعت میں پڑھتا ہے۔ اور نافیا! یہ میرے بچپن کے دوست میشا ہیں۔ ہم اکٹھے اسکول میں پڑھتے تھے۔

نانا ٹیل نے چند لمحے سوچا اور پھر احترام سے سر پہ پہنی ٹوپی اتار ڈالی۔

دبلے آدمی نے بولنا جاری رکھا: "ہم دونوں پہلی سے نویں جماعت تک ساتھ پڑھتے تھے۔ میشا! تمھیں یاد ہے، لڑکے تمھیں کیا کہہ کر چھیڑتے تھے؟ انھوں نے تمھاری چھیڑ ہیروسٹراٹس (Herostratus) رکھی ہوئی تھی۔ کیونکہ تم نے ایک دن سگریٹ سے اپنی درسی کتاب جلا دی تھی۔" یہ کہہ کر دبلے آدمی نے قہقہہ مارا اور بولا: "لڑکوں نے میرا نام افیالٹیس (Ephialtes) رکھ چھوڑا تھا کیونکہ مجھے کہانیاں سنانے کا بہت شوق تھا۔ ہاہاہا..... وہ ہمارا بچپن بھی کیا خوب زمانہ تھا! ارے، نافیا، شرماؤ مت، ان کے قریب چلے

خاموشی

☆ خاموشی اختیار کر، خاموشی شیطان کو بھگاتی ہے اور امور دین میں تیری مددگار ہوتی ہے۔
(الحدیث)

☆ خاموشی دانا کا وقار اور نادان کا پردہ ہے۔
(حکیم لقمان)

☆ خاموشی میں کبھی شرمندگی نہیں اٹھانی پڑتی، اگر گفتگو چاندی ہے تو خاموشی سونا۔ (حکیم لقمان)

☆ عقل جب کامل ہو جائے تو کلام کم ہو جاتا ہے۔
(حضرت علیؓ)

☆ جو خاموشی فکر سے تہی ہو، سہو ہے۔
(بوعلی سینا)

☆ جو خاموشی حکمت سے خالی ہے وہ غفلت ہے۔
(حسن بصری)

☆ خاموشی عبادت ہے بغیر محنت کے، ہیبت ہے بغیر سلطنت کے، قلعہ ہے بغیر دیوار کے، فتح یابی ہے بغیر ہتھیار کے، جواب ہے جاہلوں کا۔
(امام غزالی)

(انتخاب: تحریم رمضان، پاکپتن)

جاؤ اور یہ میری بیگم ہیں، یوکرائن سے آئی ہیں......"

ناتافیل نے کچھ دیر سوچا اور پھر شرما کر باپ کے پیچھے جا چھپا۔

"اچھا دوست! یہ بتاؤ، زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ کیا تم سرکاری ملازمت میں ہو؟ کس گریڈ تک پہنچ چکے ہو؟" موٹے آدمی نے توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔

"میرا تیرھواں گریڈ چل رہا ہے۔ میں کئی سال ایک سرکاری کالج میں کلرک رہا۔ پھر ہیڈ کلرک کی حیثیت سے ایک دوسرے سرکاری محکمے میں میرا تبادلہ کر دیا گیا۔ میری تنخواہ زیادہ نہیں، اسی لیے نجی طور پر چھوٹا موٹا کاروبار بھی کرتا ہوں۔" دبلے آدمی نے تفصیل سے بتایا۔

موٹے نے دلچسپی سے پوچھا:

"کیا کاروبار؟" "میں چوبی سگریٹ کیس بناتا ہوں۔ گاہک رقم زیادہ دے، تو کیس کو منقش بھی کیا جاتا ہے۔ عام کیس فی ایک روبل فروخت کرتا ہوں۔ مزید برآں میری بیگم بچوں کو وائلن بجانا سکھاتی ہے۔ یوں گزارہ ہو رہا ہے۔ تم سناؤ، تم کیا کر رہے ہو؟ میں شرط لگاتا ہوں کہ تم کونسلر بن چکے۔"

"نہیں میرے دوست، میرا عہدہ اس سے بھی بلند ہے۔" موٹا آدمی شائستگی سے بولا "میں ابھی سے پریوی کونسلر بن چکا...... مجھے دو سرکاری اعزاز بھی مل چکے ہیں۔

یہ سن کر دبلا آدمی پہلے دم بخود رہ گیا۔ پھر اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ پھیلی اور وہ کچھ نروس سا نظر آنے لگا۔ اس کے رگ و پے میں شرارے و ستارے سے پھوٹ رہے تھے۔ دبلے نے پہلو بدلا، ہچکچایا، بڑبڑایا پھر سمٹ سا گیا...... اس کے کاندھے سے لٹکے

بنڈل بھی سکڑ سے گئے۔ بیوی کی ناک کچھ اور لمبی ہوگئی۔ ناتافیل تن کر کھڑا ہو گیا تاکہ نمایاں ہو سکے۔

"یور ایکسیلنسی......! میری خوشی کی انتہا نہیں! میرا دوست، میرے بچپن کا ساتھی اتنا بڑا آدمی بن جائے......! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا!!"

"موٹا آدمی بے پروائی سے بولا: "ارے تمہارا رویہ کیوں بدل گیا؟ میں اور تم بچپن کے دوست ہیں۔ ہمارے درمیان اس سرکاری جی حضوری کا کیا کام؟ کھل کر باتیں کرو۔"

مگر دبلے آدمی کی چاپلوسی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ فرماں برداری دکھاتے ہوئے بولا: "ایکسیلنسی! خدا آپ کو مزید ترقی دے۔ آپ کی ہم پر عظیم الشان توجہ تو نعمت ایزدی کے مترادف ہے۔ یور ایکسیلنسی! یہ میرا بیٹا ناتافیل ہے...... یہ میری بیگم لوئیا ہے، یوکرائن سے آئی ہے......"

موٹا آدمی اتنا زیادہ خوشامدی انداز اپنانے پر احتجاج کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دبلے آدمی کے پورے وجود پر اتنی کراہت انگیز اور ناگوار اطاعت شعاری چھائی ہوئی تھی کہ اسے دیکھ کر اس کا جی کھٹا ہو گیا۔ موٹا جانے کے لیے مڑا اور اپنا ہاتھ دوست کی طرف بڑھایا۔

دبلے آدمی نے بڑے احترام سے اس کا ہاتھ تھاما، آنکھوں سے لگایا اور پھر کورنش بجا لاتے ہوئے اُسے الوداع کہا۔ اس کی بیوی شرماتے ہوئے مسکرانے لگی۔ ناتافیل بھی فرماں برداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھکا اور اپنی ٹوپی اتار دی۔ موٹے دوست سے زیادہ اس کے سرکاری منصب سے مرعوبیت نے تینوں کے چہروں کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

◆◆◆
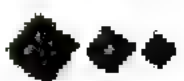
دنیائے ادب کے خامہ بگوش

کاٹ دار قلم رکھنے والے ایک بے بدل و منفرد ادیب کا دل افروز خاکہ

محمود احمد لئیق

مشفق خواجہ کا اصل نام خواجہ عبدالحیٔ تھا۔ 19 دسمبر 1935 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اپنے دس بھائی بہنوں میں چوتھے نمبر پر تھے۔ ان کا خاندان 1948ء میں ہجرت کرکے کراچی آ گیا اور یہیں ان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ جامعہ کراچی سے بی اے آنرز اور ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔ انھوں نے 21 فروری کو وفات پائی۔

مشفق خواجہ کے بھائی خواجہ عبدالرحمٰن طارق راوی ہیں کہ وہ اپنا تمام وقت پیشہ ورانہ ذمہ داری، مطالعہ اور تحقیقی کام میں صرف کرتے تھے۔ انھیں میل

ملاقات اور سیر و تفریح سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ ایسے معاملات سے کنارہ کش ہی رہے۔ عالی صاحب کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں "میں اپنی فقیری و گوشہ نشینی سے اتنا مطمئن ہوں کہ اس حصار عافیت سے باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" جب لوگوں نے ان کے پاس کثرت سے آنا شروع کیا تو انھوں نے یہ شعر کاتب سے لکھوا کر آویزاں کر دیا۔

اس سرائے میں نہیں قیام بہت　　زندگی مختصر ہے کام بہت

جب شعر سے کام نہ نکلا تو اپنے گھر کے دروازے پر ایک تختہ آویزاں کر دیا "مشفق اجازت کے بغیر زحمت نہ فرمائیں (بحوالہ 'جوش اور خامہ جوش'۔ مرتب خواجہ عبدالرحمٰن طارق)

خواجہ طارق اپنی کتاب 'جوش اور خامہ جوش' میں مزید لکھتے ہیں "میں نے کبھی انھیں کسی سے اونچی آواز میں بات کرتے اور قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا۔ دھیما لہجہ، آہستہ روی اور ہونٹوں پر معصوم سی شرارت آمیز مسکراہٹ ان کی جاذب نظر شخصیت کے نمایاں اور دل پذیر پہلو تھے۔

..... ☆ .....

اردو کے ممتاز محقق، تنقید نگار، شاعر اور کالم نگار مشفق خواجہ کے کالموں میں تنقید بڑی ظالم ہوتی۔ اس کی کاٹ بڑی بے رحم تھی، 'ممدوح' کو تڑپا کر رکھ دیتی تھی۔ اس کی زد میں بڑے بڑے لوگ آئے، سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا۔

جوش ملیح آبادی کی "انقلابی فکر"

جوش ملیح آبادی کی سوانح کا خاص طور پر مشفق خواجہ نے بھرپور تجزیہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں: جوش اپنی سوانح "یادوں کی برات" میں فرماتے ہیں: "یقین فرمائیے جب تک آدمی حجاج، ہلاکو، چنگیز، نادر، ابن زیاد اور یزید کے ہاتھ بیعت نہیں کر لیتا، سرمایہ دار اور صنعت کار نہیں بن سکتا۔ لیکن انھوں نے اپنی کتاب کا انتساب ایک سرمایہ دار کے نام کیا اور اسے اپنا محسن لکھا..... اسی سرمایہ دار نے یادوں کی برات کی طباعت کے مصارف برداشت کیے۔ یہ جوش کی انقلابی فکر کا نمونہ ہے۔

یادوں کی برات کے متعلق ان کا یہ تبصرہ بھی ذہن میں تازہ کر لیں "اس کتاب سے اگر گالیوں اور فحش لطیفوں کو حذف کر دیا جائے تو ضخامت ایک چوتھائی سے بھی کم رہ جائے گی۔"

جوش کی مشاعرے میں کارکردگی پر خواجہ نے لکھا "طفیل احمد جمالی کی رائے ہے کہ جوش جب مشاعرے میں اپنا کلام سناتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سامعین پر لاٹھی چارج کر رہے ہیں۔ لیکن 'یادوں کی برات' پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے جیسے جوش نے لاٹھی چارج چھوڑ کر آنسو گیس کا استعمال شروع کر دیا ہو۔"

خواجہ صاحب زندہ دل آدمی تھے اور جملے چست کرنا ان کی عادت۔ کالم کی طرح عام زندگی میں بھی شگوفے بکھیرتے رہتے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ دوست بھلے ہی ضائع ہو جائے مگر وہ اپنے اچھے فقرے کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔

ہندوستانی انشاپرداز مجتبیٰ حسین خواجہ صاحب پر لکھے گئے خاکے میں فرماتے ہیں: ایک محفل میں کسی نے کہا "ہندوستان کے اردو ادب پر بعض چندوں کا غلبہ ہے جیسے پروفیسر گوپی چند، پروفیسر گیان چند اور پروفیسر تنقیم چند۔" مشفق خواجہ نے فوراً کہا "مگر یہ تو معدودے چند ہیں۔"

مسکرانے کی ضرورت نہیں

خواجہ صاحب کو فوٹوگرافی کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ مجتبیٰ حسن لکھتے ہیں: ایک بار انھوں نے کئی قسم کے کیمروں سے میری تصویریں لیں۔ تصویر کھینچتے وقت میں نے رسماً مسکرانے کی کوشش کی تو بولے "سنجیدہ ہو جائیے" آپ کے مسکرانے کی ضرورت نہیں، مسکرائیں گے تو وہ لوگ جو آپ کی تصویر دیکھیں گے۔"

دہلی گئے تو ان کا قیام انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سیکریٹری خلیق انجم کے گھر تھا۔ ان کی مہمان نوازی کا اعتراف کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے فرمایا "خلیق انجم کے ہاں مجھے ہر طرح کا آرام ہے، لیکن ان کے ہاں رہنے سے میرا ایک بھاری نقصان بھی ہوا...... خلیق انجم کے ہاں رہ کر میری زبان بگڑ رہی ہے۔ میں غلط بات سن سکتا ہوں لیکن غلط زبان نہیں سن سکتا۔"

☆

قدرت نے خواجہ صاحب کو بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا لیکن اولاد کی نعمت سے محروم رکھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اسے محسوس نہیں کیا، ہر حال میں صبر و شکر کرتے رہے۔ وہ اکثر اپنی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے "ہمارے بچے یہ ہیں اور بہت اچھے ورنہ بچے تو ناخلف بھی نکلتے ہیں۔"

الطاف حسن قریشی نے کالم نگار ڈھونڈ لیا

خلیق انجم اپنی کتاب "مشفق خواجہ ایک مطالعہ" میں لکھتے ہیں: خواجہ صاحب کا کالم نگار بننا محض اتفاق ہے۔ وہ کتابوں پر جو تبصرے کرتے، ان میں طنز و مزاح کی ہلکی چاشنی ہوتی۔ اردو ڈائجسٹ کے ایڈیٹر اور مشہور ادیب الطاف حسن قریشی نے ان تبصروں سے اندازہ لگایا کہ مشفق صاحب میں اعلیٰ درجے کا کالم نگار چھپا ہوا ہے۔

قریشی صاحب نے کراچی سے جب روزنامہ "جسارت" شائع کرنا شروع کیا تو مشفق صاحب سے کالم لکھنے کی فرمائش کی۔ وہ پہلے تو راضی نہیں ہوئے لیکن قریشی صاحب کے اصرار نے انھیں مجبور کر دیا اور وہ کالم لکھنے لگے۔ توقع کے خلاف یہ کالم بہت مقبول ہوئے، ڈیڑھ دو سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بڑھتی ہوئی مصروفیت کی وجہ سے خواجہ صاحب نے کالم نگاری ترک کر دی۔ جب مولانا صلاح الدین "جسارت" کے ایڈیٹر ہوئے تو انھوں نے پھر اصرار کر کے "جسارت" کے لیے کالم لکھوائے۔

1984ء میں جب مولانا نے ہفت روزہ تکبیر نکالا، تو خواجہ صاحب اس میں "خامہ بگوش" کے قلمی نام سے کالم لکھنے لگے۔ یہ کالم ادبی و عوامی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ ذیل میں خواجہ صاحب کے انھی کالموں سے انتخاب پیش ہے۔ یہ تحریریں ان کے اسلوبِ تنقید کو بخوبی عیاں کرتی ہیں۔

ارے آپ ہی.....

ریل کے سفر کے دوران دو مسافر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا، عبدالعزیز خالد کے شعر کسی کو یاد نہیں رہتے، اگر آپ ان کے پانچ اشعار سنا دیں تو میں پچاس روپے دوں گا۔ دوسرے نے فوراً خالد کے پانچ شعر سنا دیے۔ پہلا بہت متعجب ہوا۔ اس نے پچاس روپے کا نوٹ نکالا اور شرط جیتنے والے کے حوالے کرتے ہوئے کہا، اپنا تعارف تو کرائیے۔ شرط جیتنے والے نے نوٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا "میں ہی تو عبدالعزیز خالد ہوں۔"

بشیر بدر سے متعلق ایک تبصرہ

ایک سوال کے جواب میں بشیر بدر نے بتایا کہ انھوں نے شاعری پہلے شروع کی اور لکھنا پڑھنا بعد میں سیکھا۔ ہمارے خیال میں بہتر یہی تھا کہ وہ شاعری شروع کرنے کے بعد کوئی اور شغل نہ فرماتے کیوں کہ کسی دوسرے شغل کا کوئی مثبت نتیجہ اب تک برآمد نہیں ہوا۔

گردن سے پکڑ کر

الطاف گوہر نے مختلف سرکاری عہدوں پر تعیناتی کا تذکرہ کیا ہے۔ خصوصاً اس بات کا کہ بقول صدر ایوب انھیں "گردن سے پکڑ کر" محکمہ اطلاعات و نشریات کا سیکرٹری مقرر کیا تھا۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد خود انھوں نے دوسروں کی گردنوں پر کس طرح ہاتھ ڈالا۔

☆

ایک مرتبہ حبیب جالب نے ناصر کاظمی مرحوم سے کہا "جب بھی آپ کی کوئی غزل کسی رسالے میں دیکھتا ہوں، دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ غزل میرے نام سے چھپتی۔"

ناصر کاظمی نے شکریہ ادا کیا۔ کچھ دیر بعد حبیب جالب نے پوچھا "میری غزل دیکھ کر آپ کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟"

ناصر کاظمی نے کہا "خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ غزل آپ ہی کے نام سے چھپی۔"

صفدر میر کا کہنا ہے کہ جالب شاعر اچھا ہے اور گاتا بھی خوب ہے۔ شاعری اور گانے کی ایک ہی جیسی تعریف کرنا حبیب جالب کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حبیب جالب اچھا شاعر ہے لیکن وہ جس مہارت سے گاتا ہے اس کی مثال شاعروں میں تو کیا گانے والوں میں بھی نہیں ملتی۔

گانے والوں پر حبیب جالب کو اس اعتبار سے بھی فوقیت حاصل ہے کہ وہ دوسروں کی لکھی ہوئی چیزیں گاتے ہیں لیکن حبیب جالب صرف اپنا کلام سناتا ہے۔ شاعر گلوکاروں کی بدولت مشہور ہوتے ہیں، حبیب جالب کے سامنے گانے والوں کی شہرت بھی ماند پڑ جاتی ہے۔

☆

معلوم نہیں وہ کون بزرگ تھے جو کشور ناہید کی شاعری کے ذریعے عزتِ سادات حاصل کرنا چاہتے تھے، حالانکہ موصوفہ جس قسم کی شاعری کرتی ہیں اسے اپنانے سے عزتِ سادات کا حاصل ہونا تو الگ رہا، بزرگی بھی مشکوک ہو جاتی ہوگی۔

ادبی سطح پر قمر جمیل کی جو حیثیت ہے اس سے کہیں زیادہ حیثیت ان کی تخلیقی سطح پر ہے۔ وہ بے مثال غزل گو ہیں۔ انھوں نے پابند نظمیں لکھی ہیں اور آزاد بھی۔ اب وہ ایک عرصے سے نثری نظمیں لکھ رہے ہیں جنھیں بعض لوگ مادر پدر آزاد شاعری کا نام دیتے ہیں۔

ہم نے انیس ناگی کو نثری نظم کا بانی کہا ہے۔ ممکن ہے قمر جمیل کو ہماری یہ بات ناگوار گزرے کیوں کہ انھیں بھی نثری نظم کا بانی ہونے کا دعویٰ ہے۔ لیکن حقائق سے انیس ناگی کے دعوے کی تائید ہوتی ہے...... نثری نظم کیا، ہر ادبی فساد کے بانی وہی رہے ہیں۔

اپنے مجموعے کا سرورق قمر جمیل نے خود بنایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے مصور بھی ہیں۔ یہ سرورق اتنا زیادہ جاذب نظر ہے کہ قاری اسی میں کھو جاتا ہے اور اسے کتاب کے باطن میں جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر اس کتاب پر صرف سرورق ہوتا اور اندر کے اوراق خالی ہوتے تو بھی یہ مجموعہ ہما شما کے مجموعوں پر بھاری

ہوتا۔ خالی اوراق، مطبوعہ اوراق کے مقابلے پر اس لیے بہتر ہوتے ہیں کہ کتاب خریدنے والے کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالتے۔

جمیل جالبی کے ہم پرانے نیازمند ہیں لیکن ان کے شیخ الجامعہ ہونے کا فائدہ ہم نے کبھی نہیں اٹھایا...... حد تو یہ ہے کہ کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ ہمیں بی۔اے یا ایم اے کی اعزازی سند دلا دیجیے۔ جب جعلی اسناد بازار میں سستے داموں مل جاتی ہیں تو ہم ڈاکٹر کا احسان کیوں لیں۔ یہ کون دیکھتا ہے کہ سند اعزازی ہے یا جعلی یا اصلی کیوں کہ ہر طرح کی سند رکھنے والے استعداد میں یکساں ہوتے ہیں۔

(یہ کالم اپریل 1986ء میں شائع ہوا تھا جب سیاستدانوں کی جعلی ڈگریوں کا راز طشت از بام نہیں ہوا تھا۔)

✰

قمر جمیل کی نثری نظموں میں کلیدی لفظ ہے "گھوڑا"...... اگر مثالیں پیش کی جائیں تو ہمارا "کالم" نہیں رہے گا اصطبل بن جائے گا۔ اب آخر میں قمر جمیل کا ایک مزے دار شعر سنیے:

ہم تمہاری ہر ادا کے ناز برداروں میں ہیں
جی میں آتا ہے تو ہم کو بھی اٹھا کر پھینک دو

قمر جمیل کی اس خوش فہمی پر بڑی خوشی ہوئی۔ آج کل شاعر کا مجموعہ کلام تو کوئی خریدتا نہیں، شاعر کو کون خریدے گا!

✰

مشفق خواجہ کا شمار کامیاب انسانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ انھوں نے پل، چاہ، مسجد و تالاب نہیں بنائے۔ مرتے وقت ان کے پاس اس دور کے چند لاکھ روپے بھی نہ تھے لیکن انور سدید کے بقول ان کے جنازے میں وہ لوگ زیادہ اشکبار تھے جنھیں خامہ بگوش (مرحوم) نے اپنے کالم کا موضوع بنایا، سخت تنقید کی اور تحسین گسترانہ باتوں کے ڈھیر لگا دیے۔

وہ علم رکھتے تھے۔ صاحب کردار تھے۔ حق سے قربت بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے مالی منفعت کی خاطر بڑے بڑے سرمایہ داروں کے قصیدے نہیں لکھے، فوجی اور سول ڈکٹیٹروں کے مطلوبہ مقاصد کی تکمیل کی خاطر بڑھ چڑھ کر بولی لگائی۔ نہ وہ ان انگریزی ادیبوں میں شامل تھے جو امریکی ادارے مکتبہ فرینکلن کے لیے بھاری معاوضوں پر کتابوں کے ترجمے کرتے رہے اور ان پر دوسروں کا نام چھپتا رہا۔

وہ بلاشبہ ایک کامیاب زندگی گزار کر گئے۔ انھوں نے علم پھیلانے کی سعی کی، ان کی تحقیق سے یقیناً برسوں لوگ مستفید ہوں گے۔ علم کی اہمیت اس قدر ہے کہ ایک جنگ میں گرفتار ہونے والے کافر قیدیوں کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ وہ چند مسلمانوں کو زیور علم سے مستفید کریں۔

ان کا کردار بھی مثالی تھا۔ انھوں نے حاکموں کی خوشنودی اپنا مقصد حیات نہیں رکھا۔ وہ حق سے بھی قریب تھے۔ ان کے کردار میں جھول نہ تھا۔ وہ دنیا کی چمک دمک سے مغلوب نہ تھے۔ ان کی زندگی کا اصول تھا:

ع نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

"تم میں اکرم و افضل وہ ہے، جس کا تقویٰ زیادہ ہے۔" بے شک قرآن کا بیان کردہ یہ معیار دنیا کے تمام معیاروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ مشفق خواجہ صاحب متقی بھی تھے۔ انھوں نے دنیاوی عہدوں اور حیثیتوں کو ٹھکرایا، شہرت، خودنمائی اور نام و نمود کو بھی اہمیت نہ دی۔ ہمیشہ علم کی ترویج پر توجہ دی اور اس پر گامزن رہے، کسمپرسی کا سامنا کیا لیکن ضمیر کا سودا نہ کیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

◆◆◆

بشریٰ رحمٰن

ظرف اور ظروف

ایک ستم رسیدہ بہو کا انوکھا قصّہ

قدرت نے نرالے انداز میں اسے ساس کے جبر سے نجات دلائی

بدبخت اور کتنا مجھے پھرائے گی۔ میرا کلیجا

"اری منہ کو آنے لگا ہے۔" مومنہ کی ساس نے رک کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کہاں تھی وہ تیری دکان؟"

"جی بس ذرا آگے ہے۔" سہمی ہوئی مومنہ نے جواب دیا۔

"ذرا آگے کہتے کہتے تو مجھے میلوں چلا چکی۔"

مومنہ نے ہاتھ میں وزنی کارٹن پکڑا ہوا تھا۔ اسے زمین پر رکھ دیا۔ دم لیا۔ پھر اپنے برقع کا نقاب درست کیا۔ دوپٹے سے منہ کا پسینا پونچھا اور ادھر ادھر گھوم کر ساری دکانوں کو دیکھا جیسے اپنی مطلوبہ دکان ڈھونڈ رہی ہو۔

اگرچہ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جس دکان سے اس کی امی نے یہ ڈنر سیٹ خریدا تھا، وہ اس نکڑ سے اندر جا کر گلی میں ہے۔ بہت بڑی دکان تھی..... مگر وہ اسے ڈھونڈنے میں دانستہ تاخیر کر رہی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ جانے اس دکان کے اندر جانے کے بعد اس کی قسمت کا کیا فیصلہ ہو.....

دو مہینے پہلے مومنہ کی شادی ہوئی تھی۔ اس کا باپ ایک کالج میں پروفیسر تھا۔ چھے بہن بھائی تھے۔ مومنہ سب سے بڑی تھی۔ ماں نے اپنی حیثیت کے مطابق جہیز میں ضرورت کی ہر چیز دی تھی۔ جب شادی طے ہو چکی تو مومنہ کی ساس نے مختلف طریقے سے پیغام بھیجنے شروع کیے..... اور اپنے مطالبات کو زبان دینا شروع کر دی۔

پہلے اس نے فرمائش کی کہ بیٹے کے لیے امپورٹڈ گرم سوٹ اور رولیکس گھڑی ہونی چاہیے۔ پھر امپورٹڈ ٹی وی، امپورٹڈ ریفریجریٹر مانگا۔ یہ تو اس نے خود سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کراکری اور ڈنر سیٹ بھی امپورٹڈ ہونا چاہیے۔

مومنہ کی ساس نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا بیٹا سی ایس ایس کر کے اچھی ملازمت میں آ گیا تھا۔ لہٰذا اب وہ اپنا معیار زندگی اونچا کرنا چاہتی تھی۔ اس کا یہی ایک اکلوتا بیٹا تھا۔ اپنے گھر کے لیے وہ ہر اس کے ذریعے کر سکتی تھی۔

مومنہ کے والد اب ریٹائر ہونے والے تھے۔ پھر بھی اس کی سلیقہ شعار ماں نے کوشش کی کہ بیٹی کی ساس کی ہر فرمائش پوری کرتی چلی جائے۔ اتفاق سے جب وہ ڈنر سیٹ خریدنے آئی تو اس کے پاس امپورٹڈ ڈنر سیٹ خریدنے کو پیسے نہیں بچے۔ امپورٹڈ ڈنر سیٹ ایک لاکھ سے شروع ہو کر پانچ لاکھ تک جاتے تھے۔

دکان پوچھتی ہوئی وہ اس گلی والی دکان پہنچ گئی۔ باہر لکھا تھا "جاپانی کراکری اسٹور" اندر گئی تو امپورٹڈ جاپانی اور چینی برتنوں کے علاوہ پاکستانی ڈنر سیٹ بھی پڑے ہوئے تھے جن کی قیمتیں مناسب تھیں۔ برتن دکھانے کے بعد اس کو سوچ میں گم دیکھ کر دکاندار نے پوچھا "آپ کا مسئلہ کیا ہے؟" حیران ہو کر اس نے دکاندار کی طرف دیکھا' پچاس اور ساٹھ کے درمیان اس کی عمر تھی اور کاروباری انداز سے وہ ایک ایک چیز دکھا رہا تھا۔ مومنہ بھی ماں کے ساتھ تھی۔ ماں کو خاموش دیکھ کر وہ بولی:

"امپورٹڈ ڈنر سیٹ تو بہت مہنگے ہیں۔ ہم نہیں خرید سکتے۔ کیا آپ ہمیں کوئی ایسا پاکستانی ڈنر سیٹ دکھا سکتے ہیں جو دیکھنے میں بالکل امپورٹڈ لگتا ہو؟"

دکاندار مسکرایا "بی بی! آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ہم تو روزانہ یہی کام کرتے ہیں۔" اس نے کہا۔

اس نے ایک بند الماری کھول دی اور بولا "آیئے بہن جی آپ دیکھ لیں۔"

اس الماری میں تین چار پاکستانی ڈنر سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان جاپانی سیٹوں کی ہو بہو نقل تھے جو دو لاکھ روپے مالیت کے تھے اور انھوں نے باہر شوکیس میں دیکھے تھے۔

مومنہ نے جلدی سے پلیٹ ہاتھ میں لے کر اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔

دکاندار تحمل سے بولا "لوگ فرمائش کرتے ہیں کہ پاکستانی ڈنر سیٹ کے پیچھے "میڈ ان پاکستان" نہ لکھوایا جائے کیونکہ معیار میں یہ بالکل جاپانی سیٹ کے برابر ہیں۔ بے شک ساتھ ساتھ رکھ کر دیکھ لیں۔" وہ باہر سے جاپانی ڈنر سیٹ کی ایک پلیٹ اٹھا لایا اور دونوں برابر برابر رکھ دیں۔ واقعی بالکل ایک سا ڈیزائن تھا۔ ذرا بھی اصلی اور نقلی میں فرق نہیں لگ رہا تھا۔

مومنہ نے ایم اے کیا ہوا تھا۔ سمجھدار تھی۔ پورا سیٹ اٹھا کر ایک ایک چیز پر غور کر رہی تھی پھر ماں سے بولی:

"امی جی...... یہ ٹھیک ہے۔"

"ہاں ہے تو ٹھیک...... ماں سوچتے ہوئے بولی مگر پتا نہیں اس کی قیمت کیا ہے؟"

دکاندار بولا "آپ کے پاس کتنی گنجائش ہے۔ میں ویسا سیٹ آپ کو دکھا دوں۔"

"نہیں... سیٹ یہی مناسب ہے۔ قیمت بتا دیں پلیز...!" مومنہ بولی۔

"پورے مکمل سیٹ کی قیمت تو پچاس ہزار روپے ہے۔ اگر اس میں سے کچھ پیس کم کر دیے جائیں تو قیمت اور بھی کم ہو جائے گی۔"

"پچاس ہزار..." اس کی ماں حیرت سے بولی۔

"آپ فیصلہ کریں میں کچھ اور کم کر دوں گا۔ آپ تو دیکھ چکی ہیں، جاپانی سیٹ دو لاکھ روپے کا تھا۔"

"اگر ہم کچھ پیس کم کروائے بغیر لیں تو آپ کتنی رعایت دیں گے۔" مومنہ بولی۔

"میں آپ کو پینتالیس ہزار میں دے دوں گا۔" دکان دار نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، ہم گھر جا کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔" مومنہ کی ماں نے کہا۔

"نہیں بہن! ابھی فیصلہ کر لیں۔ چیزیں پڑی نہیں رہتیں بک جاتی ہیں۔ یہ تو بالکل امپورٹڈ لگتا ہے اور اب یہ آخری سیٹ رہ گیا ہے۔ اس کی بہت مانگ ہے۔ آپ لے جائیں پیسے کل دے جانا۔" چناں چہ تھوڑی سی بحث کے بعد انھوں نے یہ سیٹ خرید لیا اور گھر آ گئے۔

پچھلے ماہ مومنہ کی ساس نے کچھ مہمانوں کو مدعو کیا اور مومنہ سے کہا کہ وہ اپنی شادی کا ڈنر سیٹ نکال لائے۔ سیٹ کے ہر برتن کو اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا...... اور گھور کر پوچھا "کیا یہ امپورٹڈ ہے۔"

مومنہ نے ہولے سے کہا "جی ہاں۔"

"وہ چونک کر بولی۔ اس پر تو کچھ لکھا ہوا نہیں۔"

مومنہ نے ہلکی آواز میں کہا "دکاندار نے تو ہم سے یہی کہا تھا کہ جاپانی سیٹ ہے اور ہم نے خرید لیا۔"

"اور تم نے الٹ کر دیکھا ہی نہیں...... جی نہیں۔"

"اتنی بے وقوف ہے تمہاری ماں اور تم......"

مومنہ چپ کر گئی۔

مومنہ کی ساس نے کہا "اس کو اسی طرح واپس پیک کر دو۔ اور کل مجھے اس دکاندار کے پاس لے جانا۔ میں خود جا کے پوچھوں گی کہ یہ کہاں کا بنا ہوا ہے۔"

مومنہ نے سیٹ پھر اسی طرح پیک کر دیا۔ لیکن اپنے شوہر کو یہ بات نہ بتا سکی کیونکہ وہ اپنے دفتری کام سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے ہفتے بعد آنا تھا۔

مومنہ کی ساس اس کے جہیز کی ہر چیز میں سے کیڑے نکال چکی تھی۔ حتیٰ کہ اسے سونے کے وہ کنگن بھی پسند نہیں آئے جو اس کی ماں نے اسے دیئے تھے۔ وہ سنار کے پاس جا کر ان کی قیمت بھی لگوا آئی اور کئی بار مومنہ کو سنا چکی تھی۔ مومنہ کی چھوٹی تین بہنیں گھر بیٹھی ہوئی تھیں، اس لیے وہ ایسی جلی کٹی سن کر بھی خاموش رہتی۔

آج جب اس کی ساس نے رکشا منگوا کر اسے ڈنر سیٹ لے کر بازار چلنے کو کہا تو وہ انکار یا احتجاج نہ کر سکی...... اور ساتھ چل پڑی۔ گو اس نے دکان ڈھونڈنے میں کافی دیر لگائی۔ تاہم اسے دکان ڈھونڈنا ہی پڑی۔ بمشکل اتنا بھاری ڈبا اٹھا کر جب وہ اندر داخل ہوئی تو کاؤنٹر پر ایک جوان لڑکا بیٹھا تھا۔ وہ گھبرا گئی...... آگے آ کے بولی "وہ جو بزرگ یہاں بیٹھتے تھے کہاں ہیں؟"

لڑکا کھڑا ہو گیا، بولا "وہ میرے والد ہیں۔ نماز پڑھنے گئے ہیں ابھی آ جائیں گے، فرمایئے! میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"نہیں ہم ان کا انتظار کر لیں گے۔" مومنہ نے کہا۔

اس کی ساس ایک اسٹول پر بیٹھ گئی اور ہانپنے لگی۔ مومنہ ادھر اُدھر دیکھ کر بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ دکاندار آ گیا۔

مومنہ نے اپنی آنکھوں میں نصیب کا سارا دکھ بھر کے اس کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہی۔ وہ بھی حیران ہو کر برقع پوش لڑکی کو دیکھنے لگا پھر اسٹول پر بیٹھی اس کی ساس کو دیکھا اور آگے آ گیا۔

"جی فرمایئے۔" ساس کے پاس آ کر بولا۔ اب مومنہ نے اپنا نقاب سرکا دیا تھا۔ ڈبا آگے کر کے بولی "یہ ڈنر سیٹ ہم نے آپ کی"...... ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس کی ساس کھڑی ہو گئی اور کرخت لہجے میں بولی "کیا یہ ڈنر سیٹ امپورٹڈ ہے، بس اتنا بتا دیں۔"

دکاندار نے پہلے مومنہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور نمی میں ایک التجا تیر رہی تھی...... یوں لگتا تھا ابھی رو دی کہ رو دی......

دکاندار نے کہا: "میں دیکھے بغیر کیسے بتا سکتا ہوں۔ ڈبا آپ کے آگے پڑا ہوا ہے کھول کر دیکھ لیں۔"

دکاندار ڈبا کھولنے لگا۔ اس کا بیٹا بھی آگے آ کے اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ پھر اس نے وہ چار پلیٹیں نکال لیں اور الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ ایک نظر اس نے مومنہ پر ڈالی، اس کے چہرے پر عجیب بے چارگی تھی۔ ساس ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ مومنہ منہ سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ بس آنکھوں ہی سے اپنی بے بسی کا اظہار کر رہی تھی۔

"بی بی! آپ اس کی رسید لائی ہیں؟" دکاندار نے براہ راست مومنہ سے پوچھا۔

"جی نہیں...... پتا نہیں اب رسید ہو گی یا گم ہو

چکی۔ میری شادی کو دو مہینے ہو گئے ہیں۔"

دکاندار کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔

"رسید سے کیا مطلب...... آپ دکاندار ہیں۔ آپ نے سیٹ بیچا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے یہ پاکستانی ہے یا امپورٹڈ ساس تلخ لہجے میں بولی۔"

"جی ...... جی ...... وہ آرام سے بولا۔ میرا خیال تھا یہ شاید واپس لوٹانے کو لائی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ پہلے بتاؤ...... کیا یہ جاپانی سیٹ ہے؟"

دکاندار ذرا سا مسکرایا۔ مومنہ کی سانس حلق میں پھنسنے لگی۔ وہ بولا...... "محترمہ یہ امپورٹڈ ڈنر سیٹ ہے۔ ہم براہ راست جاپان سے کراکری منگواتے ہیں۔ چونکہ پاکستان میں آئے دن امپورٹ ایکسپورٹ کے قانون بدلتے رہتے ہیں، اس لیے ہم انھیں ہدایت دیتے ہیں کہ کچھ برتنوں پر میڈ ان جاپان نہ لکھا جائے۔ اس سے ہمیں فائدہ ہو جاتا ہے۔"

"اچھا......" اس کی ساس غصے سے چنک کر بولی۔ اچھا بتاؤ تم نے کتنے کا دیا تھا؟"

"ایک لاکھ کا......" اس کے منہ سے اچانک نکل گیا۔

مومنہ کا رنگ فق ہو گیا۔

اس کی ساس اسی لہجے میں بولی۔ ہمیں یہ پسند نہیں آیا۔ استعمال بھی نہیں ہوا۔ یہ واپس لے لو...... اور ہمیں رقم لوٹا دو......

مومنہ جیسے پھانسی چڑھنے لگی کہ اب بھانڈا پھوٹے گا...... مگر دکاندار اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دراز کھولی اور پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں والی گڈی میں سے بیس نوٹ نکال کر اس کی ساس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ مومنہ کی آنکھوں میں ایک گھنٹے سے رکے آنسو جھر جھر بہنے لگے۔ اس نے منہ پر برقع کا نقاب ڈال لیا۔

اس کی ساس نے نوٹ اپنے پرس میں رکھ لیے اور شرمندہ سے لہجے میں بولی"...... آؤ...... چلو...... میں تمہیں کسی اور دکان سے اپنی پسند کا امپورٹڈ سیٹ خرید دیتی ہوں۔" مومنہ اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ کاؤنٹر کے قریب پہنچ کر اس نے اپنی دائیں ہاتھ میں پہنی ہوئی سونے کی چھ ماشے کی انگوٹھی اتار کر چپکے سے دکاندار کے آگے رکھ دی اور خود تیزی سے باہر نکل آئی۔ یہ انگوٹھی اس کی امی نے تب دی تھی، جب اس نے ایم اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ اسے وہ سینے سے لگا کر رکھتی مگر آج اس عالی ظرف انسان نے جس طرح اس کا پردہ رکھا تھا اور اس کی ازدواجی زندگی بچائی تھی، یہ اس کے عوض بہت کم تھی۔ مگر پھر بھی کچھ پیسے تو ادا ہو سکتے تھے۔

ساس نے باہر نکل کر رکشا روکا اور اس میں بیٹھ گئی۔ جب دوسری طرف سے مومنہ بیٹھنے لگی تو دکاندار باہر آ گیا اور رکشے کی چھت پر ہاتھ رکھ کر اسے رکنے کا اشارہ دیا۔ پھر دوڑ کر ان کے پاس آ گیا۔

اب مومنہ کا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا اور کسی نئی مصیبت میں گرفتار ہونے کے آثار نظر آنے لگے۔

دکاندار اس طرف آیا جہاں مومنہ کھڑی تھی اس کی ساس بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دکاندار کو دیکھنے لگی۔

وہ مومنہ کے قریب آ گیا اور ہاتھ میں پکڑی انگوٹھی اس کی طرف بڑھا کر بولا:

"بیٹی! یہ شاید آپ کی انگوٹھی ہے۔ جہاں آپ کھڑی تھیں، مجھے وہاں سے ملی ہے۔ اس کو سنبھال لیجیے۔ شکر ہے اس وقت دکان میں کوئی اور نہیں تھا۔"

◆◆◆

دوسری قسط
چناروں کی قطار

گزشتہ قسط کی تلخیص

اکہتر سالہ سیتھ ہیو برڈ نے چنار کے ایک درخت کے ساتھ پھانسی کا پھندہ لے لیا۔ اس نے نہایت عمدہ سیاہی مائل سوٹ پہن رکھا تھا۔ چونکہ بارش ہو رہی تھی اس لیے وہ مکمل طور پر بھیگا ہوا تھا۔ وہ خوش مزاج شخص تھا اور اکثر چرچ بھی جاتا تھا۔ اس کی دو سابق بیویاں تھیں جنھوں نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ اس کے دو بچے تھے جو کہیں اور رہتے تھے اور اس سے بہت کم ملتے تھے۔ سیتھ ہیو برڈ ایک فارم ہاؤس اور اس کے اردگرد وسیع قطعہ زمین کا مالک تھا۔ زمین پر جنگل تھا اور وہ عمارتی لکڑی کا کامیاب کاروبار کرتا تھا۔ خودکشی سے پہلے سیتھ نے اپنے ایک ملازم کیلون کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ اس کو اس جگہ ملے جب وہ وہاں پہنچا تو مسٹر سیتھ کی گاڑی وہاں کھڑی تھی اور ان کی لاش درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس نے پولیس کو فون کیا۔ پولیس افسروں نے آ کر سیتھ کی تصویریں لیں اور لاش کو اتار کر ایمبولینس میں رکھا۔ فورڈ کاؤنٹی کا شیرف اوزی والز بھی وہاں آ پہنچا۔ وہ سیتھ ہیو برڈ کو جانتا تھا۔ ایک افسر کیلون کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ جہاں اس کو باورچی خانے کے میز پر سیتھ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس نے اپنی جان خود لی ہے اور ان کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے۔ اس نے اپنی تجہیز و تکفین کے بارے میں کچھ ہدایات بھی لکھ دی تھیں۔ فورڈ کاؤنٹی میں جیک بریگنس ایک مشہور اور نیک نام وکیل تھا۔

صرف چار۔ اس کو بہت سے دوسروں کے نام معلوم تھے جو جیک کے خیال میں ابھی تک مشتبہ تھے۔ ان میں سے کچھ کہیں اور منتقل ہو چکے تھے۔ کچھ کہیں تھے لیکن وہ سب کھلے عام اپنی زندگیاں گزار رہے تھے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس لیے وہ باقاعدہ اجازت نامے کے ساتھ ایک پستول ہمراہ رکھتا تھا۔ ایک اس کے بریف کیس میں تھا، ایک اس کی کار میں۔ وہ اس کے دفتر میں اور کچھ اور بھی۔ ان کی شکاری رائفلیں آگ میں جل گئی تھیں لیکن جیک آہستہ آہستہ اپنے ہتھیاروں کو اکٹھا کر رہا تھا۔

اس نے گھر سے باہر اندھیرے سے بچتے ہوئے پورچ میں قدم رکھا اور ٹھنڈی ہوا میں سانس لیا۔ اس کے گھر کے عین سامنے گلی میں فورڈ کاؤنٹی شیرف کی گشتی کار کھڑی تھی جس میں لوئی ٹگ نامی پولیس افسر بیٹھا تھا جس کی بنیادی ڈیوٹی میں قبرستان کے علاوہ اس آبادی میں رات بھر گشت اور خصوصاً پیر سے ہفتے تک برتن پونے چھے بجے جیک کے گھر کے سامنے میل باکس (ڈاک کا ڈبا) کے قریب موجودگی شامل تھی۔ مسٹر بریگنس نے اس کو ہیلو کہنے کے لیے ہاتھ ہلایا۔ جواب میں اس نے بھی ہاتھ ہلایا۔ بریگنس فیملی نے ایک اور رات زندہ و سلامت گزار لی تھی۔

جب تک اوزی والز فورڈ کاؤنٹی کا شیرف تھا اور یہ مدت آئندہ تین سال یا اس سے بھی زیادہ طویل ہو سکتی تھی، وہ اور اس کے دفتر کا عملہ جیک اور اس کے کنبے کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ جب جیک نے کارل لی ہیلی کا مقدمہ لیا تو اس نے معمولی فیس کے عوض دن رات محنت کی، گولیوں سے بچا، حقیقی دھمکیوں کو نظر انداز کیا اور "قصوروار نہیں" کا فیصلہ لینے سے پہلے تقریباً سب کچھ قربان کر دیا۔ اس فیصلے کی گونج ابھی تک فورڈ کاؤنٹی میں سنائی دے رہی تھی۔ اس کی حفاظت کرنا اوزی کی اولین ترجیح تھی۔

تک نے سکون کا سانس لیا۔ جیک کی روانگی کے بعد وہ بلاک کا ایک چکر لگائے گا اور چند منٹ میں واپس آجائے گا۔ وہ اس وقت تک گھر کی نگرانی کرے گا جب تک وہ باورچی خانے میں روشنی نہیں دیکھ لیتا اور جان نہیں لیتا کہ کارلا بیدار ہو کر اپنا کام کر رہی ہے۔

جیک فورڈ کاؤنٹی میں اپنی دو "ساب" گاڑیوں میں سے ایک کو چلاتا تھا۔ سرخ رنگ کی جس کا میٹر 190,000 میل دکھا رہا تھا۔ اس کو ایک بہتر گاڑی کی ضرورت تھی لیکن وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔ ایک وقت تھا جب ایک چھوٹے قصبے میں غیر ملکی کار رکھنا ایک عمدہ خیال تھا لیکن اب مرمت کے اخراجات وحشیانہ حد تک بڑھ چکے تھے۔ قریب ترین ڈیلر ایک گھنٹے کی مسافت پر میمفس میں تھا اور ورکشاپ تک ہر سفر میں آدھا دن اور ایک ہزار ڈالر صرف ہو جاتے تھے۔ جیک ایک امریکی گاڑی خریدنے کے لیے تیار تھا اور ہر صبح جب وہ گاڑی میں چابی گھماتا اور انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنتا تو اس کے بارے میں سوچتا۔ انجن نے اسٹارٹ ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔ لیکن پچھلے چند ہفتوں میں جیک نے اس میں تاخیر ہوتے دیکھی تھی۔ چابی کو ایک دو دفعہ زیادہ گھمانا پڑتا جو خطرے کی تنبیہ ہوتی کہ کوئی خرابی پیش آنے والی ہے۔ وہ خوفزدہ ہو کر اور مختلف قسم کے شور اور کھڑکھڑ کی آوازیں سنتا اور ہر دوسرے دن ٹائروں کا معائنہ بھی کرتا۔ اس نے گاڑی کو کلبرٹ اسٹریٹ میں پسپا کیا جو کہ اگرچہ ایڈلو اسٹریٹ اور ان کے خالی گھر سے صرف چار بلاک دور تھی لیکن شہر کے کم پر رونق حصے میں تھی۔ ان کا ہمسایہ گھر بھی کرائے پر تھا۔ ایڈلو اسٹریٹ میں مکانات زیادہ پرانے، شاہانہ اور منفرد خصوصیات کے حامل تھے۔ کلبرٹ اسٹریٹ میں مکانات آڑے ترچھے اور مضافاتی انداز کے تھے جو شہر کے باقاعدہ حصوں میں تقسیم ہونے سے پہلے تعمیر کیے گئے تھے۔

اگرچہ وہ بہت کم باتیں کرتی تھی لیکن جیک جانتا تھا کہ کارلا کسی اور جگہ منتقل ہونے کے لیے تیار تھی۔ حقیقت میں انھوں نے کسی اور جگہ منتقل ہو جانے اور کلینٹن کو مکمل طور پر چھوڑ دینے کے متعلق گفتگو کی تھی۔ ہیلی کے مقدمے کے بعد کے تین سال جب یہ مالی لحاظ سے ان کی امید اور توقع سے بہت کم بار آور ثابت ہوا۔ اگر جیک کے مقدر میں یہی تھا کہ وہ کامیاب وکیل بنے کے لیے طویل عرصہ جدوجہد کرے تو پھر یہ جدوجہد کسی اور جگہ کیوں نہ کی جائے؟ کارلا کسی بھی جگہ اسکول میں پڑھا سکتی تھی۔ یقیناً وہ اپنے لیے ایک اچھی پرسکون زندگی گزارنے کی جگہ تلاش کر سکتے تھے جہاں ہتھیاروں اور مسلسل نگرانی کی ضرورت نہ ہو۔ فورڈ کاؤنٹی میں سیاہ فام جیک کا احترام کرتے ہوں گے لیکن بہت سے سفید فام اس سے ابھی تک ناراض تھے اور جنونی افراد ابھی تک باہر موجود تھے۔ دوسری طرف وہاں اتنے سارے دوستوں کے درمیان رہتے ہوئے تحفظ کا خصوصی احساس بھی ہوتا تھا۔ ان کے ہمسائے آنے جانے والے لوگوں پر نظر رکھتے تھے اور اجنبی کار یا ٹرک کو نوٹ بھی کرتے تھے۔ قصبے کا ہر پولیس والا اور کاؤنٹی کا ہر پولیس افسر جانتا تھا کہ مختصر برگینس فیملی کا تحفظ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

جیک اور کارلا کبھی وہاں سے نہیں جا سکیں گے۔ اگرچہ وہ کبھی کبھی 'تم کہاں رہنا پسند کرو گے' والے کھیل سے دل بہلاتے رہیں گے۔ یہ صرف ایک کھیل تھا کیونکہ جیک اس تلخ سچائی کو جانتا تھا کہ وہ کسی بڑے شہر

کی بڑی فرم میں بھی فٹ نہیں ہو سکے گا۔ لہٰذا سے کسی دوسری ریاست میں کوئی چھوٹا قصبہ ایسا ملے گا جو پہلے ہی بھوکے وکیلوں سے بھرا ہوا نہ ہو۔ وہ واضح طور پر اپنے مستقبل کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ اس سے مطمئن تھا۔ اس کو صرف ڈالر کمانے کی ضرورت تھی۔

وہ ایڈلو اسٹریٹ میں اپنے چلتے ہوئے خالی مکان کے پاس سے گزرا۔ اس نے زیرِ لب اپنے مکان کو نذرِ آتش کرنے والے مجرم کی خدمت میں کچھ گندی گالیاں اور انشورنس کمپنی کی شان میں چند منتخب گالیاں بکیں اور پھر گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ وہاں سے وہ جیفرسن اور پھر واشنگٹن اسٹریٹ پر مڑ گیا جو گلنٹن چوک کے شمال میں شرقاً غرباً گزرتی تھی۔ اس کا دفتر کچہری سے آگے واشنگٹن اسٹریٹ پر تھا اور وہ صبح سات بجے اپنی گاڑی اسی جگہ کھڑی کرتا تھا کیونکہ اس وقت انتخاب کے لیے کافی جگہ دستیاب ہوتی تھی۔ چوک میں مزید دو گھنٹے خاموشی رہے گی جب تک کہ اس کے اردگرد عدالتیں، دکانیں اور دفاتر کاروبار کے لیے کھل نہیں جاتے۔

جب جیک کافی شاپ میں داخل ہوا اور ٹیک سلیک شروع کی تو وہاں صنعتی کارکنوں، کسانوں اور پولیس افسروں کا ہجوم تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ واحد شخص تھا جس نے کوٹ اور ٹائی پہن رکھی تھی۔ دفتروں میں کام کرنے والے ملازمین ایک گھنٹے بعد چوک کے چاروں طرف سے چائے کی دکان پر اکٹھے ہوتے تھے اور سود کے نرخوں اور بین الاقوامی سیاست پر بحث مباحثہ کرتے تھے۔ کافی شاپ میں لوگ فٹ بال، مقامی سیاست اور مچھلی کے شکار پر باتیں کرتے تھے۔ جیک ان معدودے چند پیشہ ور افراد میں سے تھا جس کو کافی شاپ کے اندر برداشت کیا جاتا تھا۔ اس کی بہت سی

وجوہات تھیں۔ اس کو بہت پسند کیا جاتا تھا، وہ قوتِ برداشت کا مالک تھا اور سلیم الفطرت تھا اور ہمیشہ بغیر فیس کے فوری قانونی مشورہ دینے کے لیے دستیاب ہوتا تھا۔ جب کوئی مستری یا ٹرک ڈرائیور کسی ناخوشگوار صورتِ حال میں پھنس جاتا تھا۔ وہ اپنا کوٹ دیوار پر لٹکا دیتا تھا اور پولیس افسر مارشل پریچر کے ساتھ میز پر بیٹھ جاتا۔ وہ دن پہلے اوّل مس کی باسکٹ بال ٹیم تین پوائنٹ سے جارجیا کی ٹیم سے ہار گئی تھی اور یہی گفتگو کا گرم موضوع تھا۔ چیونگم چباتی ہوئی ست چپٹ ڈیلی نامی لڑکی نے اس کے کپ میں کافی انڈیل دی۔ ہفتے کی چھٹے تک یہی معمول ہوتا تھا۔ چند منٹ کے اندر وہ بغیر آرڈر کے معمول کا ناشتا سامنے رکھ دیتی..... ٹوسٹ، پیا ہوا کارن اور اسٹابری جیلی۔ جب جیک سرخ مرچ کی چٹنی انڈے پر لگا رہا تھا، پریچر نے پوچھا "جیک بتاؤ، کیا تم سمتھ میجوڈو کو جانتے ہو؟"

"میں اس سے کبھی نہیں ملا" جیک نے کہا۔ "میں نے اس کا نام دو مرتبہ سنا ہے۔ اس کا گھر پامرا کے قریب تھا ہے نا؟"

"بالکل وہی" پریچر نے منہ میں برگر کو چباتے ہوئے، جیک نے کافی کا گھونٹ لیا۔

جیک نے انتظار کیا، پھر کہا "میں اندازہ ہے کہ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ سمتھ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا کیونکہ تم نے اس کا ذکر فعل ماضی میں کیا ہے۔"

"میں نے کیا کہا؟" پریچر نے پوچھا۔ پولیس افسر کی یہ ناگوار عادت تھی کہ وہ ناشتے پر ایک بلند بھرپور سوال داغ دیتا اور پھر خاموش ہو جاتا۔ وہ اس کی تفصیلات اور اس کے ناخوشگوار پہلو کو جانتا تھا لیکن وہ ہمیشہ یہ دیکھنے کی کوشش کرتا کہ کیا کسی کے پاس کوئی

اضافی معلومات ہیں۔

''فعل ماضی۔'' تم نے پوچھا ''کیا میں اس کو جانتا تھا۔'' یہ نہیں پوچھا ''کیا میں اس کو جانتا ہوں۔'' جس کا مطلب ہوتا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ ٹھیک ہے نا۔''

''میرا خیال ہے ہاں۔''

''تو پھر کیا ہوا۔''

شیورلیٹ ورکشاپ کا مکینک ایڈی فر بلند آواز میں بولا ''اس نے کل اپنے آپ کو مار ڈالا۔ ایک درخت کے ساتھ لٹک کر پھانسی لے لی۔''

''اس نے ایک تحریر چھوڑی'' ڈیلی نے اضافہ کیا جب وہ کافی کے مگ کے ساتھ تیزی سے گزری۔ کیپٹے کو نکلے ایک گھنٹا گزر چکا تھا اس لیے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ڈیلی کو سیتھ ہیوبرڈ کی موت کے بارے میں اتنا ہی معلوم تھا جتنا کسی اور کو۔

''اچھا تو تحریر میں کیا لکھا ہے؟'' جیک نے سکون سے پوچھا۔

''تمہیں نہیں بتا سکتی پیارے۔'' اس نے کہا ''وہ بات میرے اور سیتھ کے درمیان ہے۔''

''تم سیتھ کو نہیں جانتی تھیں۔'' پرتھر نے کہا۔

ڈیلی اس قصبے میں پرانی چرب زبان طوائف تھی۔ اس نے کہا ''میں نے سیتھ کے ساتھ ایک مرتبہ یا شاید دو مرتبہ پیار کا کھیل کھیلا۔ ہمیشہ یاد نہیں رکھ سکتی۔''

''تم نے بے شمار مردوں کے ساتھ یہ کھیل کھیلا ہے۔'' پرتھر نے کہا۔

''ہاں، لیکن تم کبھی کسی کو ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے بڑے بچے'' اس نے کہا۔

''کیا واقعی تمہیں یاد نہیں ہے نا؟ پرتھر نے جواب دیا اور سب نے قہقہہ لگایا۔

''تحریر کہاں تھی'' جیک نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے پوچھا۔

پرتھر نے منہ میں کیک کا بڑا سا ٹکڑا ڈالا، کچھ دیر اسے چبایا، پھر جواب دیا'' باورچی خانے کی میز پر۔ یہ اب اوزی کے پاس ہے۔ ابھی تک تفتیش کر رہا ہے لیکن کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ایسا لگتا ہے کہ ہیوبرڈ پہنچ گیا، بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا، پھر گوڈی میں اپنی زمین پر گیا، ایک سیڑھی اور ایک رسہ لیا اور یہ کام کر گزرا۔ اس کے ایک ملازم نے اس کو کل سہ پہر دو بجے کے قریب بارش میں درخت سے جھولتے ہوئے دیکھا۔ اپنے اتوار کے بہترین سوٹ میں ملبوس۔''

دلچسپ، عجیب، المناک۔ لیکن جیک کو ایسے آدمی کے بارے میں کوئی تشویش نہ ہوئی جس سے وہ کبھی ملا ہی نہیں تھا۔ ایڈی فر نے پوچھا ''کیا اس کے پاس کوئی جائداد، دولت وغیرہ تھی؟''

''میں نہیں جانتا'' پرتھر نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اوزی اسے جانتا تھا لیکن وہ کچھ زیادہ بتا نہیں رہا۔''

ڈیلی نے ان کے کپ دوبارہ بھرے اور کچھ کہنے کے لیے رک گئی۔ ایک ہاتھ کولہے پر رکھ کر وہ بولی ''نہیں، میں اس کو کبھی نہیں جانتی تھی۔ لیکن میری عم زاد اس کی پہلی بیوی کو جانتی ہے۔ اس کی کم از کم دو بیویاں تھیں۔ پہلی کے مطابق سیتھ زمین اور دولت کا مالک تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خاموش طبع تھا، اپنے رازوں کی حفاظت کرتا تھا اور کسی پر اعتماد نہیں کرتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ نہایت بدتمیز اور برا آدمی تھا لیکن طلاق کے بعد لوگ ہمیشہ ایسا ہی کہتے ہیں۔''

''تمہیں جاننا چاہیے تھا۔'' پرتھر نے اضافہ کیا۔

''میں بالکل جانتی ہوں بڑے لڑکے۔ میں تم سے بہت زیادہ جانتی ہوں۔''

"کیا کوئی آخری وصیت یا دستاویز ہے؟" وصیت کی تصدیق اس کا پسندیدہ کام نہیں تھا لیکن بڑی زرعی جائداد کا مطلب تھا قصبے میں کسی وکیل کے لیے اچھی خاصی فیس۔ یہ کوئی مشکل اور پیچیدہ کام نہ تھا صرف عدالت میں ایک دو دفعہ پیشی اور کاغذات کی ادل بدل۔ جیک جانتا تھا کہ صبح تو بڑے قصبے کے وکیل خفیہ طور پر معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ سیٹھ کی آخری وصیت کس نے لکھی تھی۔

"ابھی تک نہیں جانتا۔" پریتھر نے کہا۔

"وصیتیں عوامی ریکارڈ تو نہیں ہوتیں جیک؟" بل ویسٹ نے پوچھا جو قصبے کے شمال میں ایک جوتا ساز فیکٹری میں الیکٹریشن تھا۔

"آپ کی موت تک نہیں ہوتیں۔ آپ اپنی وصیت آخری وقت پر تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس کو ریکارڈ کرنا بیکار ہوتا ہے۔ نیز شاید آپ نہ چاہتے ہوں کہ دنیا کو پتا چلے آپ کی وصیت میں کیا ہے جب تک آپ مر نہیں جاتے۔ جب آپ کی موت واقع ہوجاتی ہے اور جب ایک دفعہ وصیت کو عدالت میں پیش کر دیا جاتا ہے تو یہ عوام کے علم میں آجاتی ہے۔" جیک نے بات کرتے ہوئے اردگرد دیکھا اور کم از کم تین آدمیوں کو گنا جن کی وصیت اس نے تیار کی تھی۔ اس نے ان کو مختصر، سستا اور جلد بنایا تھا۔ یہ بات قصبے میں مشہور تھی۔ اس سے موکلین کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔

"وصیت کی تصدیق کا قانونی عمل کب شروع ہوتا ہے؟" بل ویسٹ نے پوچھا۔

"اس میں وقت کی کوئی قید نہیں۔ عام طور پر متوفی کی زندہ شریک حیات یا بچے وصیت کو پالیں گے، اسے وکیل کے پاس لے جائیں گے اور تجہیز و تکفین کے تقریباً ایک ماہ بعد وہ عدالت میں چلے جائیں گے اور قانونی عمل شروع ہوجائے گا۔"

"اگر کوئی وصیت نہ ہو تو کیا ہوتا ہے؟"

"یہ ایک وکیل کا خواب ہے۔" جیک نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ بہت خرابی والی بات ہوتی ہے۔ اگر مسٹر ہیوبرڈ وصیت کے بغیر مر گئے اور پیچھے سابق دو بیویاں، کچھ بالغ بچے، ہوسکتا ہے کچھ پوتے نواسے بھی چھوڑ گئے ہوں، تو وہ غالباً آئندہ پانچ سال اس کی جائداد اور منقولہ اثاثوں کی تقسیم پر لڑتے رہیں گے۔"

"اوہ! وہ اتنا سب کچھ رکھتا ہے" ڈیل نے کیفے کے دوسرے کونے سے کہا۔ وہ ہمیشہ ہمہ تن گوش ہوتی ہے۔ اگر آپ کھانسے تو اس نے آپ کی صحت کے متعلق پوچھا۔ اگر آپ چھینکے تو وہ جلدی سے ٹشو پیپر لے آئی۔ اگر آپ خلاف معمول خاموش تھے تو وہ آپ کی گھریلو زندگی یا ملازمت کے بارے میں پوچھ سکتی ہے۔ اگر آپ نے سرگوشی کی تو وہ آپ کی میز پر کھڑی کافی کے کپ دوبارہ بھر رہی ہوگی خواہ وہ پہلے ہی بھرے ہوئے کیوں نہ ہوں۔ وہ کسی چیز کو نظر انداز نہیں کرتی تھی، ہر بات کو یاد رکھتی تھی اور دوسروں کو تین سال پہلے کی کہی ہوئی باتیں یاد دلانے سے نہیں چوکتی تھی۔

مارشل پریتھر نے جیک کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھیں گھمائیں یہ کہنے کے لیے کہ "وہ خبطی ہے۔" لیکن سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ اس کے بجائے اس نے اپنا کیک ختم کیا اور باہر نکل گیا۔

جیک بھی پیچھے نہ رہا۔ اس نے چھ بج کر چالیس منٹ پر بل ادا کیا اور کافی شاپ سے روانہ ہوگیا، جاتے جاتے وہ ڈیل سے گلے ملا اور اس کے سستے پرفیوم سے اس کا سانس بند ہوتے ہوتے رہ گیا۔ مشرق میں صبح کا آسمان نارنجی رنگ کا تھا۔ کل کی بارش کے اثرات ختم

ہو چکے تھے اور ہوا صاف اور خنک تھی۔ ہمیشہ کی طرح جیک سبک رفتاری سے اپنے دفتر سے دور مشرق کی طرف رواں دواں تھا جیسے اسے کسی اہم میٹنگ کے لیے دیر ہو رہی ہو۔ سچی بات یہ تھی کہ اس دن اس کی کوئی اہم میٹنگ نہ تھی۔ صرف چند پریشان حال افراد سے معمول کے مطابق دفتر میں ملاقات متوقع تھی۔

جیک نے گلیسٹن چوک کے گرد صبح کی چہل قدمی کی۔ وہ بینکوں، انشورنس کمپنیوں، پراپرٹی کے دفاتر، دکانوں اور کافی شاپس کے پاس سے گزرا جو صبح کے اس وقت ابھی بند تھے۔ چند استثنائی صورتوں کے علاوہ تمام دو منزلہ عمارتیں سرخ اینٹوں سے تعمیر شدہ تھیں، جن کی لوہے کے جنگلے والی چھتیں عدالت اور اس کے لان کے گرد مکمل چوکور شکل میں ایستادہ تھیں۔ گلیسٹن کا قصبہ اتنا خوشحال نہیں تھا لیکن یہ جنوب کے دیہاتی علاقوں کے بہت سے چھوٹے قصبات کی طرح جاں بلب بھی نہیں تھا۔ 1980ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی آٹھ ہزار سے کچھ زائد تھی اور اگلی مردم شماری کے بعد تعداد میں کچھ اضافہ متوقع تھا۔ کوئی خالی یا بند اسٹور یا "کرائے کے لیے" کے اشتہار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ جیک گلیسٹن کے قریب ہی دو ہزار پانچ سو اٹھارہ میل دور ایک چھوٹے قصبے کیراوے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں کی بڑی اسٹریٹ ویرانی کا شکار تھی کیونکہ تاجر جگہ چھوڑ کر چلے گئے، کیفے بند ہو گئے اور بتدریج وکلا اپنی کتابیں باندھ کر کاؤنٹی کے صدر مقام آ گئے۔ اب گلیسٹن چوک کے گرد چھپن وکلا کے دفاتر تھے اور ان کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ مقابلہ بازی بتدریج سخت ہوتی جا رہی تھی۔ ہم اور کتنے وکلا کو برداشت کر سکتے ہیں؟ جیک اکثر اپنے آپ سے سوال کرتا۔

وہ دوسرے وکلا کے دفاتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے ان کے مقفل دروازوں اور تاریک استقبالیہ کمروں کو دیکھ کر لطف اٹھاتا تھا۔ یہ ایک قسم کا فتح کا احساس ہوتا تھا۔ وہ احساسِ مسرت کے ساتھ دن کا کام کرنے کے لیے تیار ہوتا تھا جبکہ اس کے حریف ابھی سوئے ہوتے تھے۔ وہ ہیری ریکس وونر کے دفتر کے پاس سے گزرا جو شاید بار میں اس کا سب سے گہرا دوست تھا۔ وونر اکا وکیل شاذ و نادر ہی نو بجے سے پہلے پہنچتا تھا جبکہ اس کا استقبالیہ کمرا طلاق کے خوفزدہ موکلین سے بھرا ہوتا تھا۔ ہیری ریکس کئی بیویوں کے ساتھ شادی کا تجربہ کر چکا تھا اور وہ بدنظمی کی شکار گھریلو زندگی کو جانتا تھا۔ اس لیے وہ رات کو دیر تک کام کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ جیک قابلِ نفرت سلیوان فرم کے پاس سے گزرا جہاں کاؤنٹی کے سب سے زیادہ وکلا کام کرتے تھے۔ وہ تعداد میں کل نو تھے۔ مکمل گدھے۔ جیک ان سے بچنے کی کوشش کرتا تھا لیکن یہ جزوی طور پر حسد کے باعث تھا۔ سلیوان کے پاس بینک اور انشورنس کمپنیاں تھیں اور اس کے وکلا باقی تمام وکلا سے زیادہ دولت کماتے تھے۔ وہ اپنے ایک پرانے دوست میک اسٹیفورڈ کے مقفل اور ویران دفتر کے پاس سے گزرا جو پچھلے آٹھ ماہ سے غائب تھا۔ وہ بظاہر اپنے موکلین کا روپیہ لے کر نصف شب کو فرار ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی اور دو بیٹیاں اس کی منتظر تھیں اور فردِ جرم بھی۔ جیک کا خیال تھا کہ میک خفیہ طور پر کسی ساحلِ سمندر پہ مے نوشی کر رہا تھا اور کبھی واپس نہ آنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ پریشان کن شادی کی وجہ سے ناخوش تھا۔ "بھاگتے رہو میک" جیک ہر صبح تالے کو ہاتھ لگا کر کہتا۔

وہ "دی فورڈ کاؤنٹی ٹائمز" اخبار کے دفتر اور چائے کی دکان کے پاس سے گزرا جو اب کھلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک ملبوسات کی دکان جہاں سے وہ سیل

پر سجے ہوئے سوٹ خریدتا تھا۔ ایک سیاہ فام کاؤنٹی کا کیفے جہاں وہ ہر جمعہ کے دن شہر کے آزاد خیال سفید فاموں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ ایک نوادرات کا اسٹور جس کے بے ایمان مالک نے دو دفعہ مقدمہ لڑا تھا، ایک بینک جس نے اس کے گھر کو گروی کیا ہوا تھا اور قانونی مقدمے میں ملوث تھا اور ایک کاؤنٹی کے دفتر کی عمارت جہاں نیا ڈسٹرکٹ اٹارنی کام کرتا تھا جب وہ اس قصبے میں ہوتا۔ سابق اٹارنی رونس بکلے گزشتہ سال انتخاب ہارنے کے بعد جا چکا تھا اور جیک اور دوسروں کے خیال میں الیکشن سے مکمل طور پر دستبردار ہو چکا تھا۔ اس نے اور بکلے نے ہیلی کے مقدمے میں ایک دوسرے کو بے بس کر دیا تھا اور دونوں ایک دوسرے سے اب بھی شدید نفرت کرتے تھے۔ اب وہ اپنے آبائی قصبے سمتھ فیلڈ جا چکا تھا۔ اپنے زخموں کو چاٹتے ہوئے مٹی اسٹریٹ پر وکلا کے درمیان روزی کمانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

اس کی سیر مکمل ہو چکی تھی اور جیک نے اپنے دفتر کے بڑے دروازے کا تالا کھولا۔ اس کے دفتر کو عموماً قصبے میں بہترین دفتر تصور کیا جاتا تھا۔ عمارت کو سو سال پہلے ول ہنگلس خاندان نے تعمیر کیا تھا اور اس وقت سے خاندان کا قانون کا دفتر بھی وہاں موجود تھا۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہو گیا جب آخری وکیل ول ہنگلس لیوسین کو بار سے نکال دیا گیا۔ اس نے جیک کو شروع میں ملازم رکھا تھا۔ وہ جیک کو بدعنوانی میں ملوث کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی اسٹیٹ بار ایسوسی ایشن نے آخری مرتبہ اس کا لائسنس معطل کر دیا۔ لیوسین کے جانے کے بعد جیک کو ایک شاندار دفتر ورثے میں مل گیا۔ وہ دس میں سے صرف پانچ کمروں کو استعمال کرتا تھا۔ نچلی منزل پر ایک بڑا استقبالیہ کمرا تھا جہاں موجودہ سیکرٹری کام کرتی تھی اور موکلین کا استقبال کرتی تھی۔ اس کے اوپر تیس مربع فٹ کے ایک شاندار کمرے میں آبنوس کی بڑی میز کے پیچھے بیٹھ کر جیک دن بھر کام کرتا تھا۔ اسی میز کو لیوسین، اس کے باپ اور دادا نے استعمال کیا تھا۔ جب وہ تھک جاتا تو دروازہ کھول کر کھلی چھت پر چلا جاتا جہاں سے وہ عدالت اور چوک کا نظارہ کر سکتا تھا۔

اپنے معمول کے مطابق صبح سات بجے وہ اپنی میز پر بیٹھ جاتا اور کافی سے لطف اندوز ہوتا۔ وہ دن بھر کی سرگرمیوں پر نظر ڈالتا اور اپنے آپ سے کہتا کہ یہ خوش آئند اور منافع بخش دکھائی نہیں دیتیں۔

موجودہ سیکرٹری چار بچوں کی ماں اکتیس سالہ ڈاکسی

گفتگو

☆۔کلام کی کثرت خطا سے خالی نہیں، ہونٹوں کو قابو میں رکھنے والا دانا ہے۔ (حضرت سلیمان)

☆۔مصیبت کی جڑ انسان کی گفتگو ہے۔
(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

☆۔جو زیادہ بولتا ہے وہ زیادہ غلطیاں کرتا ہے۔
(حضرت علی المرتضیٰؓ)

☆۔زیادہ ملامت اسے کی جاتی ہے جو زیادہ بولے۔ (حضرت علی المرتضیٰؓ)

☆۔جب تک اہل مجلس کی گفتگو نہ سن لو خود بھی گفتگو نہ کرو۔ (لقمان حکیم)

☆۔جب بولو تو بات مختصر کرو۔ (امام مالکؒ)

☆۔کلام میں نرمی اختیار کرو، لہجے کا اثر الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے۔ (امام غزالیؒ)

☆۔سخت کلامی سے ابریشم جیسے نرم دل بھی سخت ہو جاتے ہیں۔ (امام غزالیؒ)

(انتخاب: فاطمہ سعد، واہ کینٹ)

کو جیک نے پانچ ماہ پہلے اس لیے ملازم رکھ لیا تھا کہ اس کو اشد ضرورت تھی اور اس سے بہتر کوئی اور دستیاب نہ تھی۔ اس کے مثبت پہلو میں کئی چیزیں شامل تھیں۔ ہر صبح ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے دفتر آنا، مناسب انداز میں فون کالز کا جواب دینا، موکلین کو خوش آمدید کہنا، بیکار افراد کو بھگانا، ٹائپ کرنا، فائلیں تیار کرنا اور اپنی جگہ کو کسی حد تک منظم اور باترتیب رکھنا۔ اس کی منفی خصوصیات یہ تھیں کہ کام میں دلچسپی نہیں لیتی تھی، بہتر کام ملنے تک اس کام کو عارضی سمجھتی تھی، عقبی برآمدے میں سگریٹ نوشی کرتی تھی اور اس سے تمباکو کی بو آتی تھی، کم تنخواہ کی شکایت کرتی تھی، مبہم لیکن چبھتی تبصرے کرتی تھی کہ اس کے خیال میں تمام وکلا کتنے دولت مند ہوتے ہیں اور عمومی طور پر ناخوشگوار شخصیت کی حامل تھی۔ اس کا تعلق انڈیانا کی ریاست سے تھا اور کسی فوجی افسر سے شادی کر کے جنوب نہیں جانا چاہتی تھی اور شمال سے تعلق رکھنے والے بیشتر افراد کی طرح اس کے لیے ارد گرد کا ثقافتی ماحول ناقابل برداشت تھا۔ اس کی پرورش آرام و آسائش کے ماحول میں ہوئی تھی اور اب وہ ایک پسماندہ جگہ پر رہ رہی تھی۔ اگرچہ جیک نے پوچھا نہیں تھا لیکن اس کو کافی شک تھا کہ اس کی شادی اطمینان بخش نہیں تھی۔ اس کا شوہر فرائض میں کوتاہی کے جرم میں ملازمت سے برطرف ہو چکا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جیک اس کی طرف سے بحالی کے لیے قانونی چارہ جوئی کرے لیکن جیک نے انکار کر دیا تھا۔ اور یہ معاملہ ابھی تک درمیان میں اٹکا ہوا تھا۔ مزید یہ کہ دفتر کے کھلے کیش سے پچاس ڈالر غائب تھے اور جیک کو اس پر چوری کا شبہ تھا۔

وہ اس کو برطرف کر دیتا لیکن وہ ایسا سوچنے سے نفرت کرتا تھا۔ ہر صبح سکون کے لمحات میں وہ خدا سے دعا کرتا کہ وہ اس کو اتنا صبر دے کہ وہ اپنی زندگی میں آنے والی اس عورت کے ساتھ گزارہ کر سکے۔

بہت سی عورتوں نے اس کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس نے نوجوان خواتین کو ملازم رکھا کیونکہ وہ آسانی سے دستیاب ہوتی ہیں اور کم تنخواہ پر کام کر لیتی ہیں۔ ان میں جو بہتر ہوتی ہیں وہ شادی کر لیتی ہیں اور حاملہ ہو کر چھے ماہ کی رخصت چاہتی ہیں۔ جو کمتر ہوتی ہیں وہ محبت کا دکھاوا کرتی ہیں، تنگ اور چھوٹا اسکرٹ پہنتی ہیں اور ذومعنی تبصرے کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک کو جب جیک نے ملازمت سے فارغ کیا تو اس نے جنسی طور پر ہراساں کرنے کے جھوٹے الزام کی دھمکی دی، لیکن وہ ناقابل ادائی چیک دینے کی وجہ سے گرفتار ہوئی اور ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔ اس نے پختہ عمر عورتوں کو ملازم رکھا تاکہ جسمانی ترغیب کی نفی ہو لیکن اصولی طور پر ان سب کا مزاج حاکمانہ اور مادرانہ ہوتا ہے۔ وہ سن یاس اور دردوں کا شکار ہوتی ہیں۔ اکثر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہیں اور جنازوں میں شرکت کرتی ہیں۔

کئی عشروں تک اس دفتر پر اتھل ٹوپنی کا راج رہا۔ وہ ایک مشہور ماہر قانون تھی اور وول چینکس فرم کے اچھے دنوں میں اس کو چلاتی تھی۔ اتھل کے چالیس سال سے زیادہ تجربے کے باعث وکلا کو اس سے ملنے کے لیے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ وہ دوسری فرموں کے سیکرٹریوں کو خوفزدہ کرتی تھی اور نوجوان وکلا سے لڑتی تھی۔ اس لیے ان میں سے کوئی بھی ایک دو سال سے زیادہ نہیں ٹھہرتا تھا۔ لیکن اب اتھل ریٹائر ہو چکی تھی کیونکہ بیلی کے قانونی سرکس میں جیک نے اس کو باہر نکال پھینکا تھا۔ اس کے شوہر کو چوروں نے زدوکوب کیا تھا۔ وہ غالباً سفید فام امریکیوں کی خفیہ تنظیم کے ارکان تھے۔ اس مقدمے کا کوئی فیصلہ نہ ہوا اور تفتیش میں بھی

کوئی پیش قدمی نہ ہوئی۔ اس کے جانے پر جیک کو خوشی ہوئی تھی مگر چاہے وہ اس کی کمی محسوس کرتا تھا۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہ نیچے باورچی خانے میں آیا، کچھ اور کافی کپ میں ڈالی پھر اسٹور روم میں گھومنے لگا جیسے وہ کوئی پرانی فائل تلاش کر رہا ہو۔ جب راکسی آٹھ بج کر اکتالیس منٹ پر پچھلے دروازے سے اندر آئی تو جیک اس کے ڈیسک کے پاس کھڑا کسی دستاویز کے صفحے الٹ رہا تھا اور اس حقیقت کو یقینی بنا رہا تھا کہ وہ ایک دفعہ پھر دیر سے کام پر آئی ہے۔ یہ کہ اس کے چار چھوٹے بچے ہیں، ایک بے روزگار اور ناخوش شوہر ہے، کام جس کی تنخواہ کو وہ کم سمجھتی ہے اور اسی قسم کے دوسرے مسائل جیک کے نزدیک ان سب چیزوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اگر وہ اس کو پسند کرتا ہوتا تو وہ اس کے لیے کچھ ہمدردی محسوس کرتا۔ لیکن جوں جوں ہفتے گزر رہے تھے اس کی پسندیدگی کم سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک فائل تیار کر رہا تھا جس میں خاموشی سے اس کے نقائص نوٹ کر لیتا تھا تاکہ جب وہ اسے ناگوار گفتگو کرنے کے لیے بلائے تو اس کے پاس حقائق موجود ہوں۔ وہ ایک ناپسندیدہ سیکرٹری کو کام سے برطرف کرنے کے لیے سازش کرنے کو برا سمجھتا تھا۔

"گڈ مارننگ راکسی۔" اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہیلو، مجھے افسوس ہے کہ آج دیر ہو گئی ہے۔ دراصل بچوں کو اسکول لے جانا پڑا۔" وہ جھوٹ سے سخت نفرت تھا چاہے یہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا بے روزگار شوہر بچوں کو اسکول لاتا اور واپس لے جاتا تھا۔ کارلا نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔

"اوہ!" وہ بڑبڑایا جب اس نے وہ لفافوں کا بنڈل اٹھایا جو راکسی نے ابھی اپنے ڈیسک پر رکھا تھا۔ اس نے راکسی کے کھولنے سے پہلے ڈاک کو پکڑا اور کسی دلچسپ چیز کی تلاش میں اس کی چھان بین کی۔ یہ عام ڈاک کا معمول کا ڈھیر تھا جس میں وکیلوں کی الٹ سلٹ چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ دوسری فرموں سے خطوط، ایک جج کے دفتر سے خط، مقدمات کی سمریوں والے موٹے لفافے، قرار دادیں وغیرہ۔ اس نے ان کو کھولا نہیں۔ یہ سیکرٹری کا کام تھا۔

"آپ کچھ تلاش کر رہے ہیں؟" اس نے پرس اور جیک میز پر رکھے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔"

ہمیشہ کی طرح وہ بے سلیقہ دکھائی دے رہی تھی۔ منتشر بال اور میک اپ کے بغیر۔ وہ جلدی سے آرام گاہ میں چلی گئی تاکہ اپنی شکل و صورت کو بہتر بنا سکے۔ کچھ اور لفافے نوٹ کر لیے گئے۔ بنڈل کے نیچے آخری عام سائز کے لفافے پر جیک کا نام نیلی روشنائی میں ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ واپسی کے ایڈریس نے جیک کو سن کر دیا۔ اس نے باقی ڈاک کو ڈیسک پر پھینکا۔ پھر تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے دفتر میں آ گیا۔ اس نے دروازہ مقفل کر لیا۔ وہ ایک کونے میں ڈیسک پر ولیم فاکنر کی تصویر کے نیچے بیٹھ گیا جو لوسین کے والد مسٹر جان ول ہلکس نے خریدی تھی اور لفافے کا معائنہ کیا۔ ایک عام، سادہ، سفید سستے کاغذ والا لفافہ جو پانچ ڈالر فی سو کے حساب سے خریدا جاتا ہے۔ اس پر چھبیس سینٹ کا ٹکٹ چپکا ہوا تھا جو ایک خلاباز کے اعزاز میں جاری کیا گیا تھا۔ لفافہ اتنا موٹا تھا کہ کئی شیٹوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ یہ اس کے نام لکھا گیا تھا:

"محترم جیک بری گینس، اٹارنی ایٹ لا
146۔ واشنگٹن اسٹریٹ، کلینٹن، مسی سپی۔"

واپسی کا پتا تھا:

سیتھ ہبرڈ، پی او باکس 277، پالمیرا، مسی

پی۔38664 لفافے پر ہفتہ یکم اکتوبر 1988ء کو گلیسٹن ڈاک خانے کی مہر لگائی گئی تھی۔ جیک نے گہرا سانس لیا اور شعوری طور پر منظر نامے پر غور کیا۔ اگر کافی شاپ کی گپ شپ پر یقین کیا جا سکتا تھا اور جیک کے پاس اس پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی تو سیتھ ہیوبرڈ نے چوبیس گھنٹے سے کم عرصہ پہلے اتوار کی سہ پہر اپنے آپ کو پھانسی چڑھایا تھا۔ پیر کی صبح پونے نو بجے کا وقت تھا۔ چونکہ لفافے پر گزشتہ ہفتے کے دن گلیسٹن میں مہر لگائی گئی تھی اس لیے سیتھ ہیوبرڈ یا اس کے کسی آدمی نے لفافہ گلیسٹن پوسٹ آفس کے مقامی ڈاک والے ڈبے میں جمعہ کی شام یا ہفتے کی صبح ڈالا تھا۔ صرف مقامی ڈاک پر گلیسٹن میں مہر لگائی جاتی تھی۔ باقی تمام ڈاک ٹرک کے ذریعے ٹولیڈو کے علاقائی مرکز بھیجی جاتی تھی جہاں اس کو چھانٹا جاتا اور مہریں لگا کر مختلف منزلوں کی طرف ارسال کیا جاتا تھا۔

جیک نے ایک قینچی لی اور لفافے کو صاف ستھرے انداز میں ایک کنارے سے اس طرح کاٹا کہ لفافے کے اوپر واپسی کا پتا اور ڈاک خانے کی مہر محفوظ رہے۔ امکان تھا کہ یہ اس کے پاس واقعے کی ایک شہادت ہے۔ بعد میں وہ ہر چیز کی نقل حاصل کر لے گا۔ اس نے لفافے کو تھوڑا سا دبایا اور پھر اس کو جھٹکا حتیٰ کہ تہہ شدہ کاغذات باہر نکل آئے۔ جب اس نے احتیاط سے ان کاغذات کو کھولا تو اسے دل کی دھڑکن بڑھنے کا احساس ہوا۔ تینوں کاغذات سادہ، سفید بغیر لیٹر ہیڈ کے تھے۔ اس نے ان کو ڈیسک پر سیدھا کر کے رکھا اور پھر سب سے اوپر والے کو اٹھایا۔ لکھنے والے نے نیلی روشنائی سے خوب صورت لکھائی میں تحریر کیا تھا:

پیارے مسٹر جیکنس:

میرے علم کے مطابق ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے، نہ ہی ملیں گے۔ جس وقت آپ یہ پڑھیں گے میں مر چکا ہوں گا اور یہ خوفناک قصبہ جس میں تم رہتے ہو حسب معمول گپ شپ سے گونج رہا ہوگا۔ میں نے اپنی زندگی خود ختم کی ہے لیکن صرف اس لیے کہ پھیپھڑوں کے سرطان سے میری موت ناگزیر ہے۔ ڈاکٹروں مجھے زندہ رہنے کے لیے صرف چند ہفتے دیے ہیں اور میں درد کی اذیت سے تنگ آ چکا ہوں۔ میں اور بھی بہت سی چیزوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ اگر تم تمباکو نوشی کرتے ہو تو ایک مردہ آدمی کا مشورہ مانو اور اس کو فوراً ترک کر دو۔

میں نے تمھیں اس لیے منتخب کیا کہ تم دیانت داری کی شہرت رکھتے ہو اور میں نے کارل لی ہیلی کے مقدمے کے دوران تمھارے حوصلے کی تعریف کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تم قوت برداشت کے مالک ہو جو افسوس ناک حد تک دنیا کے اس حصے میں نہیں پائی جاتی۔

میں وکلا سے نفرت کرتا ہوں خصوصاً وہ جو گلیسٹن میں ہیں۔ میں اپنی زندگی کے اس موڑ پر کسی کا نام نہیں لوں گا۔ لیکن میں تمھارے پیشے کے بہت سے افراد کے خلاف بے پناہ بدخواہی کے جذبات کے ساتھ جو ختم نہیں ہوسکے، مر جاؤں گا۔ مردار خور گدھ اور خون چوسنے والے درندے۔

اس کے ساتھ ملفوف تمھیں میری آخری وصیت اور قانونی دستاویز ملے گی جس کا ہر لفظ میرا لکھا ہوا ہے۔ اس پر دستخط میں نے کیے ہیں اور تاریخ بھی میں نے لکھی ہے۔ میں نے مسسی سپی کے قانون کا جائزہ لیا ہے اور مطمئن ہوں کہ یہ میرے اپنے ہاتھ سے تحریر کردہ ایک مکمل وصیت ہے اور قانون کی رو سے مکمل طور پر نفاذ کے قابل ہے۔ کسی نے مجھے اس پر دستخط کرتے ہوئے نہیں دیکھا کیونکہ تم جانتے ہو، اپنے ہاتھ سے تحریر کردہ

وصیت کے لیے گواہوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک سال پہلے میں نے ٹپیلو میں رش لا فرم کے دفاتر میں ایک بڑی اور طویل وصیت پر دستخط کیے تھے لیکن میں نے اس دستاویز کو منسوخ کر دیا ہے۔

اس وصیت کے نتیجے میں کچھ کھینچا تانی اور جھگڑا شروع ہونے کا امکان ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں تمھیں اپنی جائداد کا وکیل بنانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس وصیت کا ہر قیمت پر دفاع کیا جائے اور میں جانتا ہوں تم یہ کر سکتے ہو۔ میں خصوصی طور پر اپنے دو بالغ بچوں، ان کے بچوں اور سابق بیویوں کو اس میں سے خارج کرتا ہوں۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں اور وہ لڑیں گے۔ اس لیے تیار ہو جاؤ۔ میری ذاتی جائداد کافی زیادہ ہے۔ ان کو اس کے رقبے اور وسعت کا کوئی اندازہ نہیں۔ اور جب انھیں یہ معلوم ہوگا وہ حملہ کریں گے۔ مسٹر بریگینس! ان سے آخر تک لڑو۔ تمھیں لازماً غالب آنا ہوگا۔

میں نے خودکشی کی تحریر کے ساتھ اپنی تجہیز و تکفین کی ہدایات بھی چھوڑی ہیں۔ میری آخری وصیت اور دستاویز کا ذکر میری تدفین کے بعد تک نہ کرنا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے کنبے کے افراد میری موت اور تعزیت کی تمام رسومات کو پورا کریں اس سے پہلے کہ انھیں احساس ہو کہ انھیں کچھ نہیں ملے گا۔ انھیں مگرمچھ کے آنسو بہانے دو۔ اس کام میں وہ ماہر ہیں۔ انھیں مجھ سے کوئی محبت نہیں۔

میں تمھاری پرجوش وکالت کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ کام آسان نہیں ہوگا۔ میرے لیے یہ علم سکون بخش ہے کہ میں ایسی اذیت ناک آزمائش کا سامنا کرنے کے لیے وہاں نہیں ہوں گا۔

مخلص سیتھ ہیوبرڈ...... یکم اکتوبر 1988ء

جیک اس وصیت کو پڑھتے ہوئے کافی زیادہ گھبراہٹ کا شکار تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا، اٹھ کر کھڑا ہو گیا دفتر کا ایک چکر لگایا، دروازہ کھول کر کھلی چھت پر چلا گیا اور عدالت اور چوک پر اچھی طرح نظر ڈالی۔ پھر ڈیسک پر واپس آ گیا۔ اس نے خط دوبارہ پڑھا۔ اس کو سیتھ ہیوبرڈ کی تصدیقی صلاحیت کی شہادت کے طور پر استعمال کیا جائے گا اور ایک لمحے کے لیے جیک تذبذب کی شدت سے مفلوج ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو اپنی پتلون کے ساتھ صاف کیا۔ کیا اسے خط، لفافہ اور دوسرے کاغذات وہیں چھوڑ دینے چاہئیں اور بھاگ کر اوزی کو یہاں لانا چاہیے؟ کیا اسے کسی جج کو بلانا چاہیے؟

نہیں۔ خط اس کے نام خفیہ طور پر لکھا گیا تھا اور اسے حق حاصل تھا کہ وہ اس کے مندرجات کا معائنہ کرے۔ پھر بھی اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ کسی ٹِک ٹِک کرتے ہوئے بم کو ہاتھ لگا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ اس نے خط ایک طرف ہٹایا اور دوسرے ورق کو گھور کر دیکھا۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے نیلی روشنائی سے لکھے ان الفاظ کو دیکھا اور اچھی طرح جان لیا کہ اس کی زندگی کا اگلا ایک سال یا ہو سکتا ہے دو سال ان کی تشریح اور تصدیق میں صرف ہو جائیں۔

لکھا تھا:

”ہنری سیتھ ہیوبرڈ کی آخری وصیت اور قانونی دستاویز“

میں، سیتھ ہیوبرڈ، اکہتر سال کی عمر میں، درست ہوش حواس لیکن مضمحل جسم کے ساتھ اسے اپنی آخری وصیت اور قانونی دستاویز بناتا ہوں:

1۔ میں ریاست مسسی سپی کا رہائشی ہوں۔ میرا قانونی ایڈریس ہے: 4498۔ سمپسن روڈ، پالمیرا، فورڈ کاؤنٹی، مسسی سپی۔

2۔ میں اپنی تمام دستخط شدہ سابق وصیتوں کو منسوخ کرتا ہوں خصوصاً وہ جس پر سات ستمبر 1987ء کی تاریخ درج ہے اور جسے ہیلینا، مسس پی میں رش لا فرم کے مسٹر لیوس میک گوائر کی تیار کردہ ہے اور وہ وصیت بھی خاص طور پر منسوخ کی جاتی ہے جس پر میں نے مارچ 1985ء میں دستخط کیے تھے۔

3۔ یہ میری اپنی تحریر کردہ وصیت ہے جس کا ہر لفظ میں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور کسی سے کوئی مدد نہیں لی۔ اس پر دستخط اور تاریخ میں نے ثبت کیے ہیں۔ اس کو میں نے یکم اکتوبر 1988ء کو اپنے دفتر میں تنہا تیار کیا۔

4۔ میرا دماغ بالکل صحیح اور صاف ہے اور میں پوری تصدیقی صلاحیت رکھتا ہوں۔ کوئی مجھ پر نہ دباؤ ڈال رہا ہے نہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

5۔ میں، 762۔ ایمر اسٹریٹ، ٹیوپیلو، مسس پی کے رسل ایمبرگ کو اپنی وصیت کے مطابق جائداد کی تقسیم کا عمل درآمد کنندہ مقرر کرتا ہوں۔ مسٹر ایمبرگ میری جسٹس کا کاروبار کرنے والی کمپنی کے نائب صدر تھے اور وہ میرے اثاثوں اور معاشی ذمہ داریوں کا پورا علم رکھتے ہیں۔ میں مسٹر ایمبرگ کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ کلنٹن مسس پی میں اتارنی ایٹ لا مسٹر جیک بری گینس کی خدمات کو برقرار رکھیں تاکہ وہ تمام ضروری نمائندگی مہیا کریں۔ یہ میری ہدایت ہے کہ فورڈ کاؤنٹی میں کوئی دوسرا وکیل نہ میری جائداد کو ہاتھ لگائے نہ میری وصیت کی تصدیق سے کوئی پیسا کمائے۔

6۔ میرے دو بچے ہیں.... ہرشل ہیوبرڈ اور رمونا ہیوبرڈ ڈیفو.... اور ان کے بھی بچے ہیں۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں وہ کتنے ہیں کیونکہ میں کچھ عرصے سے ان سے نہیں ملا ہوں۔ میں خصوصی طور پر اپنے دونوں بچوں اور اپنے تمام پوتوں نواسوں کو اپنی جائداد کی وراثت سے خارج کرتا ہوں۔ ان کو کچھ نہیں ملے گا۔ میں نہیں جانتا کہ کسی شخص کا نام وراثت سے کاٹ دینے کے لیے ضروری قانونی زبان کیا ہے لیکن میرا ارادہ یہ ہے کہ میں ان کو مکمل طور پر منع کر دوں۔ اپنے بچوں اور ان کے بچوں کو ۔ مجھ سے کوئی بھی چیز حاصل کرنے سے۔ اگر وہ اس وصیت کے خلاف مقدمہ کریں اور جائیں تو میری خواہش ہے کہ وہ اپنے لالچ کے نتیجے میں ہونے والے عدالتی اخراجات اور وکلا کی فیس ادا کریں۔

7۔ میری دو سابق بیویاں ہیں جن کا میں نام نہیں لوں گا۔ چونکہ وہ طلاق کے معاملات میں عملی طور پر سب کچھ حاصل کر چکی ہیں۔ ان کو اب مزید کچھ نہیں ملے گا۔ میں خصوصاً ان کو وصیت سے خارج کرتا ہوں۔ خدا کرے وہ میری طرح اذیت ناک موت مریں۔

8۔ میں گزشتہ چند برسوں کے دوران مخلصانہ دوستی اور خدمت کے تشکر کے طور پر اپنی جائداد کا 90فیصد اپنی دوست لیٹی لینگ کو دیتا اور منتقل کرتا ہوں۔ اس کا پورا نام لیٹیشیا ڈیلورز لینگ ہے اور اس کا پتا ہے 1488۔ ماٹر روڈ، باکس ہل، مسس پی۔

9۔ میں اپنی جائداد کا 5فیصد اپنے بھائی انسل ایف ہیوبرڈ کو دیتا ہوں اگر وہ ابھی تک زندہ ہے۔ میں نے کئی سالوں سے انسل کے بارے میں کوئی خبر نہیں سنی اگرچہ میں نے اکثر اس کے متعلق سوچا ہے۔ وہ ایک پراگندہ خیال اور پریشان حال لڑکا تھا اور بدتر حالات کا مستحق تھا۔ بچپن میں اس نے اور میں نے وہ کچھ دیکھا جو کبھی کسی انسان کو نہیں دیکھنا چاہیے اور انسل ہمیشہ کے لیے ذہنی صدمے کا شکار ہو گیا۔ اگر وہ اب تک مر چکا ہے تو اس کا 5فیصد حصہ میری جائداد میں شامل رہے گا۔

10۔ میں اپنی جائداد کا 5فیصد آئرش روڈ کے کرسچین چرچ کو دیتا ہوں۔

11۔ میں وصیت پر عمل درآمد کنندہ کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ میرا گھر، زمین، پلاٹ اور پالمیرا کے قریب لکڑی کا اسٹور بازاری مارکیٹ قیمت پر فروخت کر دے جتنی جلدی عملی طور پر ممکن ہو اور ان کی قیمت کو مجموعی سرمائے میں شامل کرلے۔

سیتھ ہیوبرڈ ... یکم اکتوبر 1988ء

دستخط مختصر اور صاف تھے اور پڑھے جاتے تھے۔

جیک نے دوبارہ اپنے ہاتھ اپنی پتلون کے ساتھ صاف کیے اور وصیت کو دوبارہ پڑھا۔ یہ دو صفحات پر پھیلی ہوئی تھی اور تحریر سیدھی لائنوں میں تھی جیسے سیتھ نے کسی قسم کا پیمانہ استعمال کیا ہو۔

جیک کے دماغ میں درجنوں بھر سوالات کلبلانے لگے جن میں سے نمایاں تھا: آخر یہ لیٹی لینگ کون ہے؟ دوسرا یہ کہ: اس نے کیا ایسا کام کیا تھا کہ وہ 90 فیصد جائداد کی حقدار ٹھہری؟ تیسرا: نقدی جائداد کتنی بڑی ہے؟ اگر یہ واقعی کافی بڑی ہے تو اس کا کتنا حصہ موت کے بعد ٹیکسوں کی نذر ہو جائے گا؟ اس کے جلد بعد ذہن میں آنے والا سوال تھا: وکیل کو کتنی فیس ملے گی؟

لیکن تیار ہونے سے پہلے جیک نے دفتر کا ایک اور چکر لگایا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا اور اس کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ کتنا حیرت انگیز قانونی مقابلہ ہوگا! اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس دولت کے حصول کے لیے سیتھ کا خاندان وکیل کھڑا کرے گا اور غیظ و غضب کے ساتھ آخری وصیت کی مخالفت کرے گا۔ اگرچہ جیک نے کبھی وصیت کی اتنی بڑی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا، وہ جانتا تھا کہ ایسے مقدمات چانسری کورٹ میں یا پھر جیوری کے سامنے لڑے جاتے تھے۔ فورڈ کاؤنٹی میں کسی متوفی کا اتنی بڑی جائداد چھوڑ جانا شاذ و نادر واقعہ تھا لیکن کبھی کبھار کوئی شخص جائداد کی منصوبہ بندی کے بغیر مشکوک وصیت کے ساتھ کچھ دولت چھوڑ جاتا تھا۔ ایسے مواقع مقامی وکلا کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتے کیونکہ وہ عدالت کے اندر اور باہر پھنکارتے پھرتے اور سارا اثاثہ فیسوں میں اڑا دیتے۔

اس نے آہستہ سے دو لفافے اور تینوں کاغذات ایک فائل میں رکھ لیے اور اسے نیچے راکسی کے ڈیسک پر لے گیا۔ اب تک اس کی شکل و صورت کچھ بہتر ہو گئی تھی اور وہ ڈاک کھول رہی تھی۔

"اسے آرام سے پڑھو" اس نے کہا۔

اس نے ہدایت کے مطابق اسے پڑھا اور جب وہ پڑھ چکی تو اس نے کہا "آہا! ہفتے کا شاندار آغاز۔"

"بیچارے سیتھ کے لیے ایسا نہیں" جیک نے کہا۔ براہ مہربانی نوٹ کر لو کہ یہ آج 3 نومبر کی صبح ڈاک میں پہنچا۔

"نوٹ کر لیا۔ کیوں؟"

"کسی دن عدالت میں اس کا وقت نازک اہمیت اختیار کر سکتا ہے۔ ہفتہ، اتوار، سوموار۔"

"میں اس کی گواہ ہوں گی۔"

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی، لیکن ہم احتیاطی تدابیر اختیار کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے؟"

"آپ وکیل ہیں۔"

جیک نے لفافے، خط اور وصیت کی چار نقول حاصل کیں۔ اس نے ایک نقل فرم کے تازہ ترین مقدمے کی فائل میں لگانے کے لیے راکسی کو دے دی اور دو نقول اپنے ڈیسک کے مقفل دراز میں ڈال دیں۔ اس نے 9 بجے تک انتظار کیا اور اصل اور ایک نقل کے ساتھ دفتر سے روانہ ہو گیا۔ اس نے راکسی کو بتایا کہ وہ عدالت جا رہا ہے۔ وہ دفتر سے متصل سیکیورٹی بینک گیا جہاں اس نے اصل کاغذات فرم کے لاکر میں رکھ دیے۔

اوزی والز کا دفتر کلنٹن چوک سے دو بلاک دور کاؤنٹی جیل کے ساتھ تھا۔ یہ ایک کنکریٹ کی عمارت تھی جو دس سال پہلے تعمیر کی گئی تھی۔ بعد میں اس کے ساتھ شیرف اور اس کے عملے کے دفاتر کا اضافہ کر دیا گیا۔ یہ جگہ سستی میزوں، فولڈنگ کرسیوں اور داغدار قالینوں سے اٹی پڑی تھی۔ سوموار کی صبحیں عام طور پر بہت مصروف ہوتی تھیں کیونکہ اختتام ہفتہ کے معاملات کو بھی سمیٹنا پڑتا تھا۔ ناراض بیویاں جیل میں بند شوہروں کو رہا کروانے کے لیے آتی تھیں۔ کچھ دوسری بیگمات اپنے شوہروں کو جیل میں ڈلوانے کے لیے اور کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے دوڑی چلی آتی تھیں۔ خوفزدہ والدین منشیات کے خلاف پولیس کارروائی کی تفصیل جاننے کے منتظر ہوتے تھے جس میں ان کے بچے بھی دھر لیے گئے تھے۔ فون کی گھنٹیاں معمول سے زیادہ بجتی تھیں جن کا اکثر جواب نہیں دیا جاتا تھا۔ پولیس افسر کیک گلے سے نیچے اتارتے ہوئے تیز کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اس میں ایک پُراسرار شخص کی عجیب و غریب خودکشی کا اضافہ کر لیں۔ سوموار کی صبح پر ہجوم بیرونی دفتر میں ہر کوئی بہت زیادہ مصروف تھا۔

ان دفاتر کے عقب میں ایک چھوٹی سی راہداری سے گزر کر ایک دروازہ تھا جس پر ہاتھ سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ اوزی والز۔ سینئر شیرف۔ فورڈ کاؤنٹی۔ دروازہ بند تھا۔ شیرف سوموار کو جلدی دفتر آ گیا تھا اور فون پر ایک جذباتی عورت سے بات کر رہا تھا جس کا نابالغ بیٹا ایک پک اپ ٹرک چلاتے ہوئے پکڑا گیا تھا جس پر اور سامان کے علاوہ کافی مقدار میں منشیات بھی لے جائی جا رہی تھیں۔ یہ واقعہ گزشتہ ہفتے کی رات کو چیتولا جھیل کے قریب پیش آیا تھا۔ بے شک بچہ بے گناہ تھا اور ماں اس کو وہاں آ کر اوزی کی جیل سے بازیاب کروانے کے لیے بے چین تھی۔

اوزی نے خبردار کیا کہ اس کی رہائی اتنی جلدی ممکن نہیں۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ اوزی نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر کہا "ہاں۔" دروازہ تھوڑا سا کھلا اور جیک نے اپنا سر اندر کیا۔ اوزی فوراً مسکرایا اور اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جیک نے دروازہ بند کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اوزی وضاحت کر رہا تھا کہ اگرچہ بچہ سترہ سال کا ہے لیکن وہ تین پاؤنڈ منشیات کے ساتھ پکڑا گیا ہے اس لیے اس کی رہائی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک جج اس کی منظوری نہ دے۔ جب ماں زیادہ غضبناک ہو گئی تو اوزی کی پیشانی شکن آلود ہو گئی اور اس نے ریسیور کو اپنے کان سے تھوڑا پرے ہٹا دیا۔ اس نے اپنا سر انکار میں ہلایا اور دوبارہ مسکرایا۔ وہی پرانی فضول باتیں۔ جیک بھی کئی مرتبہ یہ باتیں سن چکا تھا۔

اوزی نے کچھ دیر اور بات سنی، وعدہ کیا کہ وہ ہر ممکن مدد کرے گا اور آخرکار فون رکھ دیا۔ اس نے اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے جیک سے ہاتھ ملایا اور کہا "گڈ مارننگ وکیل صاحب۔"

"گڈ مارننگ اوزی۔"

انھوں نے تھوڑی سی گپ شپ کی اور پھر فٹ بال پر گفتگو شروع ہو گئی۔ اوزی فٹ بال کا اسٹار کھلاڑی رہ چکا تھا۔ اس کی عقبی دیوار پر فٹ بال کی یادگار تصویریں، تمغے، ٹرافیاں اور شیلڈز سجائی گئی تھیں۔ کسی اور دن اور کسی اور موقع پر اوزی وہ کہانی سنانا پسند کرتا تھا کہ کس طرح اس نے فٹ بال میچ کے دوران جیک کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ یہ کہانی سال میں ایک مرتبہ ضرور سنائی جاتی تھی۔

سوموار کی صبح تھی اور فون کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ اور دونوں مصروف آدمی تھے۔ ظاہر تھا کہ جیک وہاں کسی کام سے آیا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے مسٹر سیتھ ہبرڈ نے

اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔" اس نے کہا۔

اوزی نے اپنی آنکھوں کو سکیڑا اور اپنے دوست کی طرف بغور دیکھا۔ "اس کے وکیل مقرر کرنے کے دن گزر چکے ہیں۔ اس کو تو میگارگل کے میت خانے میں غسل بھی دیا جا چکا ہے۔"

"کیا آپ نے اس کو پھانسی کے پھندے سے اتارا تھا؟"

"سمجھ لیں ہم نے اس کو زمین پر اتارا تھا" اوزی نے ایک فائل پکڑی، اسے کھولا اور تین 8X10 کلر تصویریں نکالیں۔ اس نے وہ تصویریں جیک کی طرف سرکا دیں اور اس نے ان کو اٹھا لیا۔ سامنے، پشت سے، دائیں طرف سے، سب سیٹھ کی تصویریں تھیں، افسردہ اور مردہ، پارش میں لٹکا ہوا۔ جیک کو ایک لمحے کے لیے دھچکا لگا لیکن اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور کہا "میں کبھی اس شخص سے نہیں ملا۔" "اس کو سب سے پہلے کس نے دیکھا؟"

"اس کے ایک کارکن نے۔ لگتا ہے مسٹر ہبرڈ نے اس کی منصوبہ بندی کی ہوئی تھی۔"

"اوہ، ہاں۔" جیک نے جیب میں ہاتھ ڈالا، کاغذات کی نقول نکالیں اور اوزی کی طرف سرکا دیں۔

"یہ آج صبح کی ڈاک میں آئے ہیں۔ بالکل تازہ کہانی ہے۔ پہلے صفحے پر میرے نام خط ہے۔ دوسرے اور تیسرے صفحے پر اس کی آخری وصیت اور قانونی دستاویز معلوم ہوتی ہے۔"

اوزی نے خط اٹھایا اور اسے آہستہ آہستہ پڑھا۔ کوئی تاثر ظاہر کیے بغیر اس نے وصیت پڑھی۔ جب وہ پڑھ چکا تو اس نے اسے میز پر گرا دیا اور اپنی آنکھوں کو ملا۔

"واؤ!" اس نے کہا "کیا یہ قانونی دستاویز ہے جیک؟"

"دیکھنے میں تو ایسی ہی لگتی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ خاندان کے افراد اس پر حملہ کریں گے؟"

"حملہ کریں گے، کیسے؟"

"وہ ہر قسم کا دعویٰ کریں گے: بوڑھا اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا، یہ عورت اس پر نامناسب طور پر اثر انداز ہوئی اور اس نے اس کو وصیت تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ یقین کیجیے اگر ان کو روپیہ حاصل کرنے میں خطرہ محسوس ہوا تو وہ ہر قسم کے ہتھیار استعمال کریں گے۔"

"یہ عورت" اوزی نے دہرایا، پھر مسکرایا اور آہستہ آہستہ سر ہلانے لگا۔

"آپ اسے جانتے ہیں؟"

"اوہ، ہاں۔"

"سیاہ یا سفید فام"

"سیاہ"

جیک کو اس کا شک تھا اور اس کو کوئی حیرت ہوئی نہ مایوسی۔ بلکہ اس لمحے اس نے مسرت کی ابتدائی لہریں محسوس کرنا شروع کر دیں۔ ایک سفید فام آدمی اور اس کی دولت، آخری وقت پر وصیت جس میں اس نے سب کچھ ایک سیاہ فام عورت کے نام کر دیا جس کو وہ بہت پسند کرتا تھا۔ وصیت کا ایک تلخ تنازعہ جو جیوری کے سامنے پیش ہوگا اور جیک اس کا مرکزی کردار ہوگا۔

"آپ اس کو کتنا اچھی طرح جانتے ہیں؟" جیک نے پوچھا۔ یہ بات مشہور تھی کہ اوزی فورڈ کاؤنٹی میں ہر سیاہ فام فرد کو جانتا تھا: وہ جن کا نام ووٹر کے طور پر درج تھا یا نہیں تھا، وہ جو زمین کے مالک تھے اور وہ جو وظیفہ خوار تھے، وہ جو برسرِ روزگار تھے اور وہ جو کام سے احتراز کرتے تھے، وہ جو پیسے کی بچت کرتے تھے اور وہ جو نقب زنی کرتے تھے، وہ جو ہر اتوار چرچ جاتے تھے اور وہ جو سستے شراب خانوں میں پڑے رہتے تھے۔ ◆◆◆

لولو سر سے سیف الملوک تک

مظہر معین

ان دلفریب پاکستانی جھیلوں کا آنکھوں دیکھا حال

جو فطری خوبصورتی و رعنائی میں اپنی مثال آپ ہیں

وطن عزیز کے شمالی علاقوں کی سیاحت سحر انگیز تجربہ ہے۔ ان گنت وادیاں، جھیلیں اور پہاڑ اپنا دامن دل والے سیاحوں کی راہ تکتے ہیں۔ میدانی علاقوں کی گرمی اور حبس کے ستائے لوگ چند روز کے لیے وہیں گوشہ عافیت تلاش کرتے ہیں۔

دنیا میں دس چوٹیوں کی بلندی آٹھ ہزار میٹر (26427فٹ) سے زیادہ بلند ہے۔ ان میں سے پانچ پاکستان میں واقع ہیں..... کے ٹو، نانگا پربت، گیشا بروم 1، براڈ پیک اور گیشا بروم 2۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو دنیا کے کسی دوسرے ملک کو حاصل نہیں۔ یہ اعزاز آشکارا کرتا ہے کہ حکومت پاکستان مناسب اقدامات کرے تو سیاحت کو فروغ دے کر خاطر خواہ زرمبادلہ کمانا ممکن ہے۔

ہم چند دوست دفتر کے بندھے ٹکے معمولات سے اکتا کر کسی ٹھنڈے علاقے جانے کا سوچ رہے تھے۔

آخر وادی کاغان جانے کا منصوبہ بن ہی گیا۔

رات بارہ بجے ہم تین دوست..... خلیل، فرخ اور راقم گاڑی میں عازم سفر ہوئے۔ بذریعہ جی ٹی روڈ سفر کرتے ہری پور پہنچ کر سڑک کنارے ہوٹل سے ناشتہ کیا اور ذرا سا ستا لیا کہ میں اکلوتا ڈرائیور تھا۔ پھر روانہ ہوئے تو ناران پہنچ کر ہی دم لیا۔ لاہور سے ناران کا فاصلہ پانچ سو ساٹھ کلومیٹر ہے۔ ناران تک سڑک کی حالت تسلی بخش ہے، سوائے چند ایک مقامات کے جہاں سیلاب اور ہبوط ارض کے باعث راستے ٹوٹ پھوٹ چکے۔ شام چار بجے ناران پہنچے تو موسلا دھار بارش نے استقبال کیا۔ چھاجوں چھاج مینہ برس رہا تھا، گویا آسمان کے پرنالے کھل گئے ہوں۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے مینہ تھم گیا اور اس کی جگہ آسمان پر سورج چمکنے لگا۔ یہ موسم برسات کا

مخصوص انداز ہے۔ بارش کے باعث منظر ایسا نکھرا کہ ذرے ذرے کا چہرہ دمکنے لگا مگر یہ دل میں ہیروں کی تاب آگئی سارا ماحول اک آئینہ بن گیا۔ بہ فطرت پہ تازگی چھا گئی وادیٔ کاغان کا اپنا الگ حسن ہے۔ مری کی نسبت وہاں کے پہاڑ ذرا کشادہ اور وسیع ہیں۔ راستوں کی ڈھلوان بھی نسبتاً کم ہے۔ قدم قدم پہ چھوٹے جھرنے اور آبشاریں ماحول کی دلکشی اور رعنائی کو چار چاند لگاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مسلسل سڑک کے ساتھ بہتا دریائے کنہار مسافروں کا دل لبھاتا ہے۔ کبھی بالکل برلب سڑک بہنے لگتا تو کبھی سیکڑوں فٹ گہرائی میں اتر جاتا ہے۔ کہیں شوخ و شنگ بچوں کی طرح اٹھکیلیاں کرتا بپھرتا تو کہیں مدبر و متین بزرگ کے مانند ٹھہراؤ اور متانت سے بہنے لگتا ہے۔ ساتھ ساتھ بل کھاتی سڑک پہ سفر کرتے اکثر خطرناک مقامات پر مسافروں کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔

ناران پہنچے تو ہوٹل میں کمرہ حاصل کر کے فوراً سفر کی تکان اتارنے لیٹ گئے۔ موسم بے حد سرد مگر خوشگوار تھا۔ شام کو موسم کا لطف اٹھانے چہل قدمی کرنے نکلے۔ عید کے بعد بچوں کے اسکول کھلنے کے باعث سیاحوں کی تعداد خاصی کم تھی۔ اسی لیے اشیا کے نرخ بھی معقول حد تک اپنی حد میں تھے ورنہ یار لوگوں کے بقول موسم پہ ہر چیز کے نرخ آسمان سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ دکانوں پر مقامی دستکاری کے خوبصورت نمونے ارزاں نرخوں پر دستیاب تھے۔

اگلے دن لولوسر جھیل جانے کا پروگرام بنا۔ یہ جھیل ناران سے تقریباً پچاس کلومیٹر آگے چلاس روڈ پہ بابوسر ٹاپ کے راستے میں واقع ہے۔ سطح سمندر سے 3410 میٹر (11190 فٹ) بلند یہ جھیل دریائے کنہار کا نقطہ آغاز ہے۔ بعد میں دودی پت جھیل اور جھیل سیف الملوک کے علاوہ بے شمار چشموں اور آبشاروں کو اپنے دامن میں سموتا ہوا یہ دریا 166 کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے دریائے جہلم میں جا گرتا ہے۔

جل کھنڈ ناران سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ وہاں تک پختہ سڑک ہے، اس سے آگے تقریباً دس کلومیٹر کا فاصلہ کچے راستے پر مشتمل ہے۔ جل کھنڈ سے جیپ پر لولوسر جھیل جانا پڑتا ہے۔ مگر کچھ مقامی لوگوں سے مشاورت کے بعد ہم نے اپنی گاڑی پر ہی یہ سفر طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک خطرناک فیصلہ تھا کیونکہ گاڑی خراب ہونے کی صورت میں مرمت کا کوئی ذریعہ وہاں نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم بخیریت لولوسر جھیل پہنچنے میں کامیاب رہے۔

بلند و بالا پہاڑوں میں گھری وسیع اور پرسکون جھیل کے سبز پانیوں کا حسین منظر ہمارے سامنے تھا۔ یہ جھیل واقعتاً خالق کائنات کی صناعی اور کاریگری کا شاہکار ہے۔ جھیل کے پانیوں کا ٹھہراؤ اس کی گہرائی کا پتا دیتا ہے۔ بلاشبہ رب تعالیٰ کی عظمت سب پہاڑوں سے بلند اور اس کے علم کی گہرائی سبھی جھیلوں کی گہرائی سے زیادہ ہے۔ ماحول پر خاموشی کا راج تھا

ع ایسا سکوت جس پہ تقریر بھی فدا ہو

جھیل کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں لٹکا کر پتھر پر بیٹھنا کچھ خطرناک تو ہو سکتا تھا مگر اس کے بغیر رہا بھی نہیں گیا۔ بلا کی خاموشی، سکون اور اکا دکا سیاحوں کی اٹھکیلیوں کی آوازیں مل کر فطرت اور زندگی کا حسن دوبالا کر رہی تھیں۔ مگر یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ہماری قوم قدرت کے اس عظیم شہ پارے کے ساتھ بھی ناروا سلوک کرتی نظر آئی۔ جا بجا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے تھے۔ خالی بوتلیں، پلاسٹک کے ڈبے اور کاغذ جگہ جگہ مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کی طرح حسن فطرت کو گہنا رہے تھے۔ سرکاری سطح پر جھیل کی صفائی کا کوئی نظام نظر نہ آیا۔ ہم ردی کاغذ اور ڈبے باہر پھینکنے کے

بجائے گاڑی کی ڈگی میں محفوظ کرتے رہے جنھیں واپس لاہور آ کر ٹھکانے لگایا۔

دو گھنٹے اس دلکش جھیل کی قربت میں گزارنے کے بعد واپسی کا سفر شروع کیا اور نماز جمعہ تک ناران پہنچ گئے۔ نماز جمعہ پڑھنے کے بعد فرخ کا اصرار تھا کہ فوراً جھیل سیف الملوک کی سیر کے لیے روانہ ہوا جائے جب کہ خلیل آرام کے موڈ میں تھا۔ میں نے جھیل پر جانے کو ترجیح دی۔ اتنی دیر میں فرخ ایک جیپ والے سے بھاؤ تاؤ کر چکا تھا۔ لہٰذا ہم نے کھانے کا سامان بازار سے خریدا اور جھیل سیف الملوک روانہ ہو گئے۔

جھیل سیف الملوک ناران سے 14 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے 3224 میٹر (10578 فٹ) بلند یہ علاقے کی سب سے مشہور اور خوبصورت جھیل ہے۔ اس تک جانے کے لیے سڑک نام کی کوئی چیز نہیں لہٰذا گاڑی کا وہاں پہنچنا ناممکن ہے۔ البتہ سڑک کی تعمیر کا برائے نام کام ہوتا نظر آیا۔ جیپ کے ذریعے ایک گھنٹے بعد پُرخطر اور ہچکولوں سے بھرپور سفر کے بعد ہم وہاں پہنچے تو وہ اپنا حسین روپ لیے ہماری منتظر تھی۔

سرسبز پہاڑوں کے سنگم پر واقع نیلے رنگ کی یہ دلکش جھیل خوبصورتی و رعنائی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی خوبصورتی دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ چاند راتوں میں یہاں پریاں اترتی ہیں (جیسا کہ مشہور ہے) تو یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دلکش منظر اور خوشگوار ہوا، وہاں پہنچتے ہی ساری تکان اتارتی اور زندگی کا دلفریب احساس دیتی ہے۔ نیلے پانی کے وسط پھیلاؤ میں ملکہ پربت کا حسین چہرہ سیاحوں کو جنت کا منظر عطا کرتا ہے۔

لولوسر کے برعکس جھیل سیف الملوک کے کنارے اشیائے خورد و نوش کی بے شمار دکانیں سجی تھیں۔ دو ایک ہوٹل بھی تعمیر ہو چکے تھے۔ لوگ کشتی رانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے البتہ صفائی کی حالت زار لولوسر جھیل سے بھی دو ہاتھ آگے نظر آئی جسے دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا رہا۔

کشتی میں بیٹھ کر ہم جھیل کی دوسری طرف روانہ ہوئے تو راستے میں ڈرتے ڈرتے اپنے کوہستانی ملاح سے جھیل کی گہرائی دریافت کی۔ اس نے جواب دیا کہ "گورا آیا تھا مگر وہ بھی اس کی گہرائی نہیں ناپ سکا۔" مگر اردگرد کے پہاڑوں کی کھائیاں دیکھ کر اندازہ کرنا ممکن ہے کہ اس کی گہرائی یقیناً ہزاروں فٹ ہو گی۔ انٹرنیٹ پر غیر مصدقہ ذرائع اس کی گہرائی ایک سے ڈیڑھ کلومیٹر بیان کرتے ہیں۔

دوسری طرف اتر کر ہم نے جھیل میں پانی داخل ہونے کا مقام دیکھا۔ وہاں سے ایک راستہ آنسو جھیل کو بھی جاتا ہے جو سیف الملوک سے ایک کلومیٹر بلند ہے۔ آنسو جھیل کا راستہ سیف الملوک سے تین چار گھنٹوں کی پیدل مسافت پر ہے۔

ٹراؤٹ مچھلی جھیل سیف الملوک کی سوغات ہے۔ صاف اور سرد پانی کی یہ چھوٹی مچھلی پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت سفر کرتی ہے۔ ذائقہ اور لذت میں لاجواب ہے۔

دن ڈھلے جھیل سیف الملوک سے واپسی ہوئی تو راستے میں خلیل کہنے لگا "یہ جھیلیں اور اسی طرح کے دیگر مقامات پاکستان کا انمول اثاثہ ہیں۔ اگر ان کی صحیح دیکھ بھال کی جائے، دنیا میں موثر طریقے سے متعارف کرایا جائے اور دیگر سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تو لوگوں کو صحت مند تفریح کے مواقع مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ہم اپنے لیے معاشی ترقی کے دھانے بھی کھول سکتے ہیں۔ مگر افسوس اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔" میں اس کی تائید میں سر ہلا کر رہ گیا۔

◆◆◆

اُف! میں پاس ورڈ بھول گیا

ان تیر بہدف ٹوٹکوں کا بیان جن کی مدد سے پاس ورڈ کے بغیر کمپیوٹر کھولنا ممکن ہے

سلیم الٰہی

یہ چند دن قبل کی بات ہے، میرا بھائی اپنے کمپیوٹر کا پاس ورڈ بھول گیا۔ اس نے کافی دماغ کھپایا مگر وہ یاد نہ آسکا۔ اسے کمپیوٹر پر ضروری کام تھا لہٰذا بڑا پریشان ہوا۔ آخر ایک دوست کے گھر گیا اور وہاں نیٹ سے کوئی حل ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ آخر تلاش بسیار کے بعد اسے ایک ویب سائٹ سے ایسے طریقے دستیاب ہوئے جن کی مدد سے پاس ورڈ کے بغیر ونڈوز ایکس پی کھولی جاسکتی تھی۔

ذیل میں وہی طریقے قارئین کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ بوقت ضرورت کام آئیں۔ تاہم یہ آپ صرف اسی وقت استعمال کیجیے جب آپ اپنے کمپیوٹر کا پاس ورڈ بھلا بیٹھیں۔ ان طریقوں سے کسی دوسرے کا کمپیوٹر کھولنے کی کوشش کرنا جرم ہے اور اکو ڈالنے کے مترادف ہوگا۔

پہلا طریقہ

جب ہم کوئی ونڈوز انسٹال کریں تو وہ خودبخود طریقے سے "ایڈمنسٹریٹر" کا اکاؤنٹ تخلیق کرتی اور پاس ورڈ کا حصہ خالی چھوڑ دیتی ہے۔ سو اگر آپ بھی پاس ورڈ بھول جائیں تو درج ذیل طریقہ سب سے پہلے آزمائیے۔

کمپیوٹر چلائیں تو F8 دبائیے تاکہ "سیف موڈ" کی آپشن سامنے آجائے۔ سیف موڈ پر کلک کیجیے۔ جب آپ کے سامنے ونڈوز ویلکم سکرین / لاگ ان سکرین آئے تو دوبار ctrl + alt + del بٹن ایک ساتھ دبائیے۔ تب سامنے ونڈوز کا کلاسک لاگ ان باکس کھل جائے گا۔

اس میں یوزر نیم کے خانے میں Administrator ٹائپ کیجیے اور پاس ورڈ والا خانہ خالی چھوڑ دیجیے۔ پھر انٹر دبائیے۔ آپ کی ونڈوز کھل جانی چاہیے۔ اب آپ کنٹرول پینل اور پھر یوزر اکاؤنٹ میں جا کر نیا پاس ورڈ لگا سکتے ہیں۔

دوسرا طریقہ

اگر درج بالا ٹوٹکا کامیاب نہ ہو تو درج ذیل طریق اپنائیے۔ یہ دراصل ایک خلا (Loophole) ہے جو ماہرین نے ونڈوز ایکس پی میں چھوڑ دیا۔

(1) ونڈوز ایکس پی کی بوٹ ایبل سی ڈی کے ذریعے کمپیوٹر چلائیے۔

(2) اس کی ہدایات پر عمل کرتے رہیے۔ جب وہ یہ ہدایت مانگے کہ کیا ونڈوز کی مرمت (Repair) دبائیں تاکہ مرمت شروع ہو سکے۔

(3) سی ڈی ونڈوز کی مرمت کے واسطے فائلیں کاپی کرنے لگے گا۔

(4) چند منٹ بعد سیٹ اپ کمپیوٹر ری اسٹارٹ کرے گا۔ تب کسی بٹن/کی کو نہ دبائیے ورنہ سی ڈی کا سیٹ اپ نئے سرے سے شروع ہو جائے گا۔ سو اسے خود بخود اسی جگہ پہنچنے دیں جہاں سے کام چھوڑا گیا تھا۔

(5) اب سیٹ اپ مختلف کام انجام دینے لگا۔ بالکل نیچے ایک کراس بار میں آپ کام کی رفتار دیکھ سکتے ہیں۔

(6) اس کراس بار کو غور سے دیکھتے رہیے۔ جب اس میں یہ لکھا آئے: Installing devices تو فوراً F10+shift کیز دبائیے۔

(7) یہ کیز دبانے سے آپ کے سامنے کمانڈ پرومپٹ ونڈو کھل جائے گی۔ اس ونڈو میں یہ لکھیے: nusrmgr.cpl اور انٹر دبا دیجیے۔

(8) اب آپ کے سامنے وہی یوزر اکاؤنٹس ونڈو کھل جائے گی جو کنٹرول پینل میں دکھائی دیتی ہے۔ سو اب آپ پرانا پاس ورڈ ختم کر سکتے ہیں اور نیا پاس ورڈ لگا سکتے ہیں۔

تیسرا طریقہ

ونڈوز ایکس پی اور ونڈوز کے دیگر نئے ورژنوں میں بھلایا گیا پاس ورڈ پانے کی خاطر ایک بلٹ ان طریق کار موجود ہے۔ یہ ”پاس ورڈ ری سیٹ ڈسک“ کے ذریعے کام کرتا ہے۔ اگر یہ ڈسک ونڈوز انسٹال کرنے کے بعد بنالی جائے تو فراموش کردہ پاس ورڈ منٹوں میں حاصل کرنا ممکن ہے۔

”پاس ورڈ ری سیٹ ڈسک“ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے کنٹرول پینل کھولیے۔ پھر یوزر اکاؤنٹس پر کلک کیجیے اس کی ونڈو کھل جائے گی۔ اب یوزر اکاؤنٹ پر کلک کریں نئی ونڈو کھلے گی۔ اس نئی ونڈو کے الٹے ہاتھ پہ آپ کو یہ انگریزی جملہ لکھا نظر آئے گا۔ Prevent a forgotten password

اس لنک پہ کلک کرنے سے فارگاٹن پاس ورڈ وزرڈ کھل جائے گا۔ اس پہ دی گئی ہدایات پر عمل کیجیے اور آپ کے ہاتھوں میں پاس ورڈ ری سیٹ ڈسک آ جائے گی۔

چوتھا طریقہ

دنیائے انٹرنیٹ میں پاس ورڈ دوبارہ لگانے میں مدد دینے والے سافٹ ویئر دستیاب ہیں۔ اینٹی وائرس بنانے والی کئی کمپنیاں مثلاً کاسپرسکی بٹ ڈیفینڈر اور اویرا وغیرہ یہ سافٹ ویئر بناتی ہیں۔ انھیں ڈاؤن لوڈ کیجیے اور پاس ورڈ ازسرِنو متعین کرنے میں مدد لیجیے۔

پانچواں طریقہ

اگر درج بالا تمام طریقے ناکام ہو جائیں تو پھر کمپیوٹر کی سی ڈرائیو پہ نئی ونڈوز انسٹال کر لیجیے۔ اگر سی ڈرائیو میں ضروری ڈیٹا موجود ہے تو اُسے حاصل کرنے کے لیے ریکوری سافٹ ویئر سے مدد لیجیے۔ ایسے کئی سافٹ ویئر نیٹ پر دستیاب ہیں۔

◆◆◆

شکر پارے

خوشی و غم کے جذبات سے بھرپور
منفرد کھٹ مٹھے افسانچے

مبشر علی زیدی

مدرز ڈے

میری امی مجھ سے سال بھر خفا رہتی ہیں
اکثر تو میں ہی ان کی طرف نہیں جا پاتا......
کبھی چلا جاؤں تو وہ منہ دیکھنے کی روادار نہیں ہوتیں
رونا آجاتا ہے لیکن امی بات نہیں کرتیں
لیکن سال میں ایک دن ہوتا ہے جب وہ انتظار کرتی ہوئی ملتی ہیں۔ میں پھول لے جاتا ہوں، وہاں شمعیں جل رہی ہوتی ہیں۔
امی مجھے لاکھوں دعائیں دیتی ہیں:
"میرا بیٹا سلامت رہے، ہزاروں سال جیے، بہت سی خوشیاں ملیں......"
میں اپنے جنم دن پر......
جنم دینے والی ماں کی قبر سے لپٹ کر رو لیتا ہوں
جی ہلکا ہوجاتا ہے۔

جیلر

قبرستان کے دروازے پر پہنچ کر مجھ پر خوف طاری ہوگیا۔
اماوس کی رات تھی اور ہر طرف اندھیرے کا راج۔
بارہ بج چکے تھے۔
وہ قبرستان شہر سے باہر ویرانے میں تھا۔
گمنام لوگوں کی آخری آرام گاہ۔
وہاں کبھی کوئی فاتحہ پڑھنے یا چراغ جلانے نہیں آیا تھا۔
دور دور تک کوئی ذی روح نہیں تھا۔
اچانک سرسراہٹ ہوئی، جیسے کوئی میرے پیچھے تھا۔
خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔
میں نے گھبرا کے پیچھے دیکھا، وہاں ایک سایہ تھا۔
میں حرکت کرنا بھول گیا۔
پھر ایک سرد آواز آئی:
"چلو واپس اپنی قبر میں۔"

پروفیشنل

پیٹ کی خاطر مجھے کیا کیا کرنا پڑتا ہے،
پیٹ بھروں کو کیا پتا!
میں روزانہ سیکڑوں افراد کے سامنے خالی پیٹ فن

کا مظاہرہ کرتی ہوں۔
جھک جھک کے سلام کرتی ہوں،
جمناسٹک دکھاتی ہوں،
اُچھلتی کودتی ہوں، قلابازیاں کھاتی ہوں،
ہوا میں تیرتی ہوں، پانی میں ناچتی ہوں،
سیٹی پر رُکتی ہوں، اشارے پر چلتی ہوں،
پرفارمر ہوں اس لیے خود بھی سیٹی بجاتی ہوں، خود بھی اشارے کرتی ہوں۔
بچے تالیاں بجاتے ہیں، بڑے داد دیتے ہیں۔
پھر نہ جانے مجھے کھانے کو کچھ ملتا ہے۔
تماش بین سمجھتے ہیں کہ ڈولفن شوقیہ فن کار ہوتی ہے۔

فائر

اُس کے ہاتھ میں پستول تھا اور سامنے ہزاروں کا مجمع،
سب کے ہاتھ خالی،
کچھ کے تو پیٹ بھی خالی،
کسی کے جسم پر پورا لباس نہ تھا،
سب کی آنکھوں میں دہشت تھی، چہرے پر گھبراہٹ،
سب کی نظر اُس کے پستول پر تھی،
یہ بات سب جانتے تھے کہ پستول میں صرف ایک گولی ہے،
ایک گولی کافی ہے، یہ بات سب کو معلوم تھی،
سب ساکت تھے، کوئی ایک قدم آگے بڑھانے کو تیار نہیں تھا،
آخر اس نے پستول والا ہاتھ بلند کیا اور گولی چلا دی،
سب بھاگ کھڑے ہوئے،
اولمپک میراتھن شروع ہوگئی۔

بھوت ووت

"پاپا، میرے بستر کے نیچے ایک بھوت ہے۔"
میرے بیٹے نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ اُس کے چہرے پر بلا کا خوف تھا۔
میں خرم کی چیخ سُن کر کمرے میں گیا تھا۔
خرم کی عمر دس سال ہے۔
میں نے پہلے کبھی اُسے اتنا ڈرا ہوا نہیں دیکھا تھا۔
میں نے کہا "بیٹا! اس دنیا میں کہیں بھوت ووت نہیں ہوتے۔"
پھر اس کا خوف دور کرنے کے لیے میں نے بیڈ کے نیچے جھانکا۔
ڈرا ہوا، سہما ہوا خرم بیڈ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔
مجھے دیکھتے ہی بولا "پاپا، میرے بستر کے اوپر ایک بھوت ہے۔"

کشش

اونچے پہاڑوں کے درمیان تفریحی مقام پر، وہ پُل سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔
بمشکل ایک گاڑی اس پر سے گزر سکتی ہے۔
میں اس سرے پر کھڑا ہو کر پُل پر چڑھنے والوں سے فیس وصول کرتا ہوں۔
بچے، بوڑھے، جوان، تنہا افراد، ہر طرح کے سیاح گاڑیاں لاتے ہیں۔
"پُل کے دوسری طرف کیا ہے؟" ہر شخص یہی سوال کرتا ہے۔
"خود جا کر دیکھیں۔" میں جواب دیتا ہوں۔
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پُل میں کیا کشش ہے۔
لوگ کیوں اس کے دوسری طرف جانا چاہتے ہیں؟

اور اُدھر جانے والے کبھی واپس کیوں نہیں آتے؟

منزل

مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ لفٹ مجھے کہاں لے جائے گی۔

میرے دوست نے کہا تھا، لفٹ سیدھی میرے فلور پر لے آئے گی۔

بڑی سمجھدار لفٹ تھی۔

میں نے اس عمارت کے گراؤنڈ فلور پر لفٹ کا بٹن دبایا تو دروازہ کھل گیا۔

میں اندر داخل ہوا ہی تھا کہ ایک شخص باہر سے بھاگتا ہوا لابی میں آیا۔

باہر کھڑے کھڑے چیخ کر بولا:

"یہ دروازہ خراب ہے، بٹن دبانے سے کھل جاتا ہے، آپ لفٹ میں نہیں کھڑے، وہ تو اوپر سے نیچے آرہی ہے۔"

یہ سن کر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا..... اور دروازہ بند ہو گیا۔

ڈھکن

"میرے دماغ میں اتنی جان نہیں کہ روبوٹس کے ساتھ مسلسل کام کروں۔"

میں نے باس سے صاف صاف کہہ دیا۔

"آپ کو روبوٹس اچھے لگتے ہوں گے،

وہ چوبیس گھنٹے کام کرتے ہیں،

ہماری طرح چھٹی نہیں کرتے،

تنخواہ نہیں مانگتے،

لیکن وہ ہم انسانوں کی طرح سوچ بھی نہیں سکتے،

ان کے جذبات نہیں ہوتے،

خزینہ ادب

علم:

☆ جس نے علم تو حاصل کرلیا مگر سوچ بچار کی عادت نہیں ڈالی، اس کی ساری محنت ضائع گئی۔
(کنفیوشس)

☆ علم کو روٹی کمانے کا ذریعہ مت بناؤ، علم آپ اپنا صلہ ہے۔ (اقلیدس)

☆ ادھورا علم خطرے کا موجب ہوتا ہے، علم کے چشمے کا پانی سیر ہو کر پیو یا پھر اس سے الگ ہی رہو، چند گھونٹ پینے سے آدمی مدہوش ہو جاتا ہے، سیر ہو کر پینے سے دل و دماغ روشن ہو جاتے ہیں۔ (پوپ الیگزنڈر)

☆ انسان علم کا بہت زیادہ بوجھ اٹھانے کے باوجود خود کو پھول کی طرح ہلکا محسوس کرتا ہے۔
(ملٹن)

☆ علم موت اور مصیبت کے خوف کو یا تو کچل کر رکھ دیتا ہے یا اس پر غلبہ پا لیتا ہے۔
(راجر بیکن)

☆ علم سے آدمی کی وحشت اور دیوانگی دور ہو جاتی ہے۔ (راجر بیکن)

☆ چاند کے بغیر رات بیکار ہے اور علم کے بغیر ذہن۔ (سر سید احمد خان)

☆ جو راستے علم کی وادی کی طرف جاتے ہیں وہ زندگی کے حسین ترین راستے ہیں۔

(مراسلہ: انس زاہد، لاہور)

وہ وقت فیصلے سے عاری ہوتے ہیں۔
میں ٹھنڈی مشینوں کے ساتھ مزید کام نہیں کرسکتا۔"
باس نے بظاہر دھیان سے میری بات سنی۔
لیکن پھر کہا: "مرضی ہے نئی نوکری ڈھونڈلو۔"
اس کے بعد اپنے دماغ کا ڈھکن اٹھا کر بیٹری تبدیل کرلی۔

لاڈلا

"میں نے کبھی کامی کو ملائی نہیں کھانے دی، ہمیشہ تیرے لیے چھپا لیتی تھی۔" نانی نے کہا۔
"مجھے پتا ہے اماں۔" میں مسکرا دیا۔
"میں کامی کو ہمیشہ پانچ روپے عیدی دیتی تھی اور تجھے دس روپے۔"
"اچھا.....؟"
"سال گرہ پر کامی کو ایک کتاب اور تجھے دو کتابیں۔"
"جی.....؟"
"بالے، میں مرجاؤں تو ٹرنک میں سے پیسے نکال لیجیو، کامی کو پتا نہ چلے۔"
"اماں، مریں تمھارے دشمن۔"
"بالے، تُو اوّل دن سے میرا لاڈلا ہے۔"
"ہاں اماں، مجھے پتا ہے۔" میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ آیا۔
نانی کو یہ نہیں بتایا کہ میں بالا نہیں، کامی ہوں۔

سودا

میں نے آہٹ سنی تو آنکھیں کھول کے دیکھا، سر پر ملک الموت کھڑا تھا۔
میں اس وقت کمرے میں لیٹا تھا، امی سو رہی تھیں۔
"کیوں آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔
"تمھاری امی کو لے جانا ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
میرا دل ڈوب گیا، آنکھیں نم ہوگئیں۔
"ایسا مت کرو۔" میں گڑگڑایا، "مجھے امی سے بہت پیار ہے۔"
"میں اکیلا واپس نہیں جاسکتا۔" وہ بولا۔
"آؤ، ایک سودا کرتے ہیں۔" میں نے کہا، "تم امی کے بجائے مجھے ساتھ لے چلو۔"
"میں تمھیں ہی لینے آیا تھا۔" اس نے بتایا، "لیکن تمھاری ماں نے پہلے سودا کرلیا۔"

پتھر

پانچ سالہ بچہ نئی کار پر نوکیلا پتھر رگڑ رہا تھا۔
باپ نے آواز سنی تو غصے سے دیوانہ ہوگیا۔
پانا اٹھا کر بچے کے ہاتھوں پر برسانا شروع کر دیا۔
ہوش آیا تو بچہ درد سے بے ہوش تھا۔
پشیمان باپ نئی کار میں بھاگم بھاگ اسپتال پہنچا۔
ڈاکٹر کو بچے کی کچلی ہوئی انگلیاں ہاتھ سے جدا کرنا پڑیں۔
آپریشن کے بعد بچے نے باپ سے پوچھا:
"پاپا! میری انگلیاں کب واپس نکلیں گی؟"
باپ اسپتال سے لاجواب نکلا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔
اسی وقت اس کی بھیگی آنکھوں نے کار پر نوکیلے پتھر سے لکھی تحریر پڑھی: "لو یو پاپا......"

◆◆◆

ابراہام لنکن کی روح یقیناً اپنے ملک و قوم کی حالت دیکھ کر روتی ہوگی۔ اس امریکی صدر نے 1861ء تا 1865ء ان امریکی ریاستوں سے زبردست جنگ لڑی جو غلامی کی حامی تھیں۔ وہ جنگ جیت تو گئے لیکن فوراً ہی غلامی کے حامیوں نے انھیں قتل کروا دیا۔ پھر وہی امریکی استعمار پسند غلامی کی نئی شکل امریکا میں رائج کرنے میں کامیاب رہے..... ایسی قسم جس میں جیلوں میں بند

ظلم وجبر کا نیا روپ

قیدی جدید دور کے غلام بن چکے۔

آج امریکا میں انسانی حقوق کی تنظیمیں ان قیدیوں کی حالت زار اور امریکی طبقہ بالا کا ظلم و ستم اجاگر کر رہی ہیں۔ ان کی تحقیقی رپورٹیں یہ تلخ سچائی عیاں کرتی ہیں کہ امریکا میں قیدیوں کا بدترین استحصال ہو رہا ہے..... ایسے ملک میں جس کا حکمران طبقہ خود کو

امریکا کے جدید غلام

اکلوتی سپر پاور اور انسانی حقوق کے چیمپین دیس میں نئی قسم کی غلامی نے جنم لے لیا.......

ایک چشم کشا تحقیقی رپورٹ

محمد قاسم

جمہوریت پسند، مہذب اور انسان دوست کہلواتا ہے۔

امریکا کی وفاقی، ریاستی اور نجی جیلوں میں تقریباً 20 لاکھ قیدی ہیں۔ ان میں بیشتر سیاہ فام یا لاطینی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ قیدی معمولی رقم کے عوض مختلف صنعتی اداروں کے لیے کام کر رہے ہیں۔ امریکی صنعت کاروں اور کاروباریوں کے لیے یہ بے بس قیدی سونے کی کان جیسی حیثیت رکھتے ہیں۔

صنعت کاروں کو یہ بالکل فکر نہیں ہوتی کہ ان کے یہ ملازم (قیدی) ہڑتال کر دیں گے۔ نہ ہی انھیں کسی قسم کی انشورنس کروانا پڑتی ہے۔ یہ ملازم نہ تو چھٹی کرتے اور نہ ہی ذاتی کاموں سے باہر جاتے ہیں۔ یہ سبھی کل وقتی ملازم ہیں، کبھی غیر حاضر نہیں ہوتے اور نہ ہی دیر سے آتے ہیں۔ مزید برآں کوئی کارکن 25 سینٹ (25 روپے) فی گھنٹہ پر کام کرنے سے انکار کرے تو اسے تنہا لاک اپ میں بند کر دیا جاتا ہے۔

ایک امریکی این جی او، کیلی فورنیا پرزن فوکس کا کہنا ہے: "انسانی تاریخ میں کسی اور معاشرے میں اتنے زیادہ شہریوں کو جیلوں میں نہیں ٹھونسا گیا۔" اعداد و شمار کی رو سے آج دنیا بھر میں سب سے زیادہ قیدی امریکا میں ہیں۔ مثلاً چین کی آبادی امریکا سے پانچ گنا زیادہ ہے، لیکن وہاں کی جیلوں میں دس لاکھ قیدی بند ہیں۔

اس وقت دنیا کے 25 فیصد قیدی امریکا میں ہیں جب کہ وہاں دنیا کی کل آبادی میں سے صرف "5 فیصد" افراد بستے ہیں۔ واضح رہے، 1972ء میں امریکی جیلوں میں صرف تین لاکھ قیدی موجود تھے۔ لیکن آج ان کی تعداد بیس لاکھ تک پہنچ چکی۔ اسی طرح دس سال قبل ملک میں پانچ نجی جیلیں تھیں جن میں دو ہزار قیدی تھے۔ آج "ایک سو" نجی جیلیں ہیں جن میں باسٹھ ہزار افراد قید ہیں اور خیال ہے کہ آنے والے برسوں میں قیدیوں کی تعداد ساڑھے تین لاکھ تک پہنچ سکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ پچھلے دس برس میں کایا کیسے پلٹ ہوئی کہ قیدیوں کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی؟

دراصل امریکا میں نجی جیلوں کا کاروبار نہ صرف باقاعدہ صنعت بن چکا بلکہ خوب پھل پھول بھی رہا ہے۔ اس میں سرمایہ لگانے والے تمام صنعت کار وال سٹریٹ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک امریکی سماجی کارکن، الزبتھ وان بتاتی ہے: "اربوں ڈالر مالیت رکھنے والی یہ صنعت اپنی تجارتی نمائشیں، کنونشن، ویب سائٹس اور کیٹلاگ رکھتی ہے۔ یہی صنعت اپنی ایڈورٹائزنگ کمپنیاں، تعمیراتی کمپنیاں، سرمایہ کار کمپنیاں، غذائی کمپنیاں اور مسلح سیکورٹی رکھتی ہے۔"

پروگریسو لیبر پارٹی امریکا کی ایک سیاسی جماعت ہے۔ حال ہی میں پارٹی کی تحقیق نے انکشاف کیا کہ امریکا میں زیادہ سے زیادہ نجی ادارے قیدیوں سے کام کرانے لگے ہیں۔ یہی ادارے حکومت پر زور دے رہے ہیں کہ وہ سزاؤں کی میعاد بڑھائے تاکہ افرادی قوت میں اضافہ ہو سکے۔ تحقیق مرتب کرنے والوں کا کہنا ہے: "آج جیلوں کی امریکی صنعت نازی جرمنوں کے نظر بندی کیمپوں سے ملتی جلتی ہے۔ وہاں بھی قیدیوں کو زبردستی غلام بنایا گیا تھا۔"

ایک امریکی این جی او لیفٹ بزنس آبزرور کے مطابق "جیلوں میں بند قیدی ہی امریکی افواج کے لیے مطلوب "100 فیصد" فوجی ہیلمٹ، اسلحے، پیٹیاں، بلٹ پروف جیکٹس، آئی ڈی ٹیگس، قمیصیں، پتلونیں، خیمے اور بیگ تیار کرتے ہیں۔"

مسلح افواج کے علاوہ یہی بیس لاکھ قیدی امریکی مارکیٹ کے لیے 98 فیصد اسمبلی خدمات، 93 فیصد پینٹ

اور پینٹ برش، 92 فیصد جوتے، 36 فیصد گھریلو آلات، 30 فیصد ہیڈ فون، مائیکروفون اور اسپیکر، 21 فیصد دفتری فرنیچر فراہم کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ قیدی ہی نابینا انسانوں کی مدد کرنے والے کتوں کو تربیت دیتے ہیں۔

جرائم میں کمی، قیدی بڑھ گئے

انسانی حقوق کی تنظیموں کا کہنا ہے کہ معمولی جرائم پر سزا دینا اور طویل المیعاد سزائیں دینا ہی وہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر جیلوں کی امریکی صنعت خوب ترقی کر رہی ہے۔ مثال کے طور پر کسی شہری سے منشیات کی ایک قسم، کریک (Crack) صرف 5 گرام برآمد ہو جائے تو اسے پانچ برس کی مدت کے لیے قید رکھنا ممکن ہے۔

اسی طرح 12 اونس سے کم کریک یا لاٹ کوکین (ایک اور قسم) برآمد ہو تو ملزم کے دس برس جیل میں گزرتے ہیں۔ دوسری طرف کسی شہری سے 500 گرام کوکین نکلے تو وہ پانچ سال کی قید پاتا ہے۔

خاص بات یہ ہے کہ کوکین سفید فام متوسط یا اعلیٰ طبقہ استعمال کرتا ہے۔ جب کہ سیاہ فام، لاطینی اور غریب طبقوں میں لاٹ کوکین مستعمل ہے۔ گویا امریکی قانون غریب دشمن ہے جو معمولی منشیات کی برآمدگی پر غریبوں کو طویل سزائیں دیتا ہے۔ جب کہ جو امیر کئی گرام کوکین رکھے تب بھی وہ قانون کی گرفت میں نہیں آتا۔

تیرہ امریکی ریاستوں کا عجیب و غریب قانون یہ ہے کہ کسی ملزم کو تین بار سزا ہو جائے تو پھر اسے ساری عمر جیل میں رہنا پڑتا ہے۔ چناں چہ کوئی امریکی شہری تین بار، وقفے وقفے سے ایک کار اور دو موٹر سائیکلیں چرائے تو وہ سیدھا پچیس سال کے لیے جیل خانے پہنچ جائے گا۔

امریکا میں جیل خانہ جات کی تاریخ

1865ء میں صدر ابراہام لنکن قتل ہوئے تو ان امریکی رہنماؤں کا پلہ پھر بھاری ہو گیا جو غلامی برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہی قیدی "کرائے پر لینے دینے" کا نظام متعارف کرایا تا کہ غلامی کسی نہ کسی طرح برقرار رہے۔ اس پر جس طرح عمل درآمد ہوا، وہ امریکی حکومت کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

چشم کشا اعداد و شمار

☆ وفاقی جیلوں میں سوا لاکھ قیدی بند ہیں۔ ان میں سے 97 فیصد معمولی جرائم پر قید ہیں۔

☆ امریکی این جی اوز کا دعویٰ ہے کہ ریاستی جیلوں میں قید ساڑھے چھے لاکھ قیدیوں میں سے بیشتر بے گناہ ہیں۔ نیز ان میں سے کئی مقدمہ چلنے کے انتظار میں ہیں۔

☆ بیس لاکھ امریکی قیدیوں میں سے 16 فیصد نفسیاتی مریض بن چکے ہیں۔

خانہ جنگی کے دوران جن غلاموں کو آزادی مل گئی تھی، ان پر چوری یا ڈاکے کے جھوٹے الزامات لگا کر گرفتار کر لیا گیا۔ انھی بے گناہ قیدیوں سے پھر کارخانوں میں کام کرایا گیا اور سڑکیں تعمیر کرائی گئیں۔

مثال کے طور پر 1870ء تا 1910ء امریکی ریاست جارجیا نے جو قیدی کرائے پر لیے، ان میں 88 فیصد سیاہ فام تھے۔ اسی طرح ریاست الاباما کی کانوں میں کام کرنے والے 93 فیصد قیدی سیاہ فام تھے۔ ریاست مسسی سپی میں وسیع و عریض فارموں

میں وہی سیاہ فام بحیثیت قیدی کام کرنے لگے جو پہلے وہاں بطور غلام مصروف کار تھے۔

خانہ جنگی کے بعد امریکی حکومت نے تعصب پر مبنی "جم کرو قوانین" متعارف کرائے۔ ان قوانین کے ذریعے اسکولوں، بستیوں، شادی ہالوں، ریلوے اسٹیشنوں وغیرہ میں سیاہ فاموں اور سفید فاموں کو الگ الگ کر دیا گیا۔ انسانی حقوق کی تنظیموں کا کہنا ہے کہ اب جیلوں کو صنعت کا درجہ دے کر مجرمانہ اور غیر انسانی قوانین پھر متعارف کرائے جا رہے ہیں۔

فی الوقت 37 امریکی ریاستیں قانونی طور پر کمپنیوں کو یہ اجازت دے چکیں کہ وہ جیلوں میں قیدیوں سے کام کرا سکتی ہیں۔ اس فہرست میں نامی گرامی امریکی ملٹی نیشنل کمپنیاں شامل ہیں مثلاً آئی بی ایم، مائیکرو سوفٹ، بوئنگ، موٹورولا، اے ٹی اینڈ ٹی، ڈیل، کمپاک، ٹی ڈبلیو اور ٹارگٹ اسٹور وغیرہ۔ یہ تمام کمپنیاں قیدیوں سے کام لے کر بہت خوش ہیں کیونکہ انھیں سستی افرادی قوت جو میسر آ گئی۔

نجی اور سرکاری جیلوں میں قیدیوں کی تنخواہوں میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً نجی جیلوں میں فی گھنٹہ تنخواہ 17 تا 25 سینٹ فی گھنٹہ ہے۔ گویا ان میں قیدی روزانہ چھ گھنٹے کام کرے تو 20 ڈالر (دو ہزار روپے) ماہانہ کماتا ہے۔ جب کہ سرکاری جیلوں میں قیدی روزانہ آٹھ گھنٹے کام کرتا اور فی گھنٹہ سوا ڈالر کماتا ہے۔ بکرا سے اوور ٹائم بھی ملتا ہے۔ چناں چہ وہ ماہانہ 200 ڈالر (20 ہزار روپے) تا 300 ڈالر (30 ہزار روپے) تنخواہ کما سکتا ہے۔

قیدیوں سے کام لینے کی "برکت" ہی ہے کہ اب امریکی کمپنیاں غیر ممالک سے کارخانے واپس امریکا منتقل کر رہی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ایک مشہور ملٹی نیشنل کمپنی نے میکسیکن سرحدی شہر ماکولا دور میں اپنا اسمبلی پلانٹ بند کیا اور سارا کام سان کوئنٹن اسٹیٹ جیل (کیلی فورنیا) میں منتقل کر دیا۔ اسی طرح ٹیکساس میں ایک فیکٹری نے اپنے 150 ملازم نکالے اور ان کا کام نجی لاک ہارٹ ٹیکساس نامی جیل میں قیدیوں کے سپرد کر دیا۔

حتیٰ کہ کچھ عرصہ قبل ریاست اوریگن کے رکن اسمبلی کیون مینکس نے جوتے بنانے والی مشہور کمپنی نائکی (Nike) کو مشورہ دیا "انڈونیشیا میں اپنے کارخانے بند کرو اور واپس ریاست میں لے آؤ۔ یہاں کمپنی کا ٹرانسپورٹیشن خرچ بچے گا، نیز ہم قیدیوں کی صورت سستی افرادی قوت دیں گے۔"

نجی جیلیں

امریکا میں نجی جیلیں کھولنے کا رجحان 1980ء کے بعد رونالڈ ریگن اور بش سینئر کے ادوار میں شروع ہوا۔ یہ پھر بل کلنٹن کے دور میں پھلا پھولا۔ جب صدر کلنٹن نے وفاقی اداروں میں ملازمین کی تعداد کم کی تو محکمہ داخلہ نے نجی اداروں کو نجی جیلیں کھولنے کی اجازت دے ڈالی۔

آج نجی جیلیں کھولنے کا دھندا بڑا منافع بخش کاروبار بن چکا۔ فی الوقت 27 ریاستوں میں واقع 100 نجی جیلوں میں ہزاروں قیدی بند ہیں۔ منافع بخش ہونے کا ایک راز یہ بھی ہے کہ جیلیں کم سے کم گارڈ جب کہ زیادہ سے زیادہ قیدی رکھتی ہیں۔

کوریکشنل کارپوریشن آف امریکا نامی کمپنی سب سے زیادہ نجی جیلیں رکھتی ہے۔ اس کی بیشتر جیلوں میں ہر 750 قیدیوں پر صرف پانچ گارڈ نگران ہیں۔ ان جیلوں میں کوئی اچھے رویے کا مظاہرہ کرے تو بمشکل اس کی سزا کم ہوتی ہے۔ لیکن قیدی معمولی مار پیٹ بھی کر ڈالے تو اس کی سزا "30 دن" بڑھ جاتی ہے۔

◆◆◆

دنیائے طب میں جنم لینے والا انوکھا کرشمہ

بچہ جس نے مرنے سے انکار کر دیا

صباحت حمید

موت اس کے سر پر پہنچ چکی تھی کہ اچانک......!

یہ 18 اگست 2012ء کی دوپہر کا واقعہ ہے کہ امریکی شہر ٹیکساس میں واقع آسٹن ہسپتال میں کچھ ہلچل نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ نصف درجن نرسیں ایک حاملہ خاتون کو آپریشن تھیٹر لے جا رہی ہیں کیوں کہ زچگی کا وقت آن موجود ہوا تھا۔

پہیوں والا صاف و شفاف بستر فرش پر رواں دواں تھا۔ اس پر 34 سالہ کیری کریگ دراز تھی۔ کیری کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے کیونکہ زچگی کا مرحلہ 14 ہفتے پہلے آن موجود تھا۔

خطرناک بات یہ تھی کہ چھ ہفتے قبل رحم میں اچانک وہ تھیلی پھٹ گئی جس کے اندر بچہ سے ماں کے جنین پلتا بڑھتا ہے۔ اس حادثے نے جنین کی نشوونما پر منفی اثرات مرتب کیے۔

ننھا منا آسٹن دنیا میں آیا تو نرسیں اور ڈاکٹر اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے جدید ترین طبی ٹیکنالوجی پر مبنی تدابیر اختیار کیں تاکہ نومولود کی جان بچائی جا سکے۔ افسوس کہ کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی۔ دراصل آسٹن کے پھیپھڑے ابھی اتنے قوی نہیں ہوئے تھے کہ اسے زندہ رکھ سکتے۔

ڈاکٹر راجر واٹز کو اس سارے عمل کا انچارج تھا۔ جب تمام تدابیر ناکام ہو گئیں، تو اس نے والدین کو بتایا "بچے کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔"

کریگ خاندان یہ جملہ سننے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ پچھلے چند ہفتوں کے دوران انھوں نے قبل

از وقت پیدا ہونے والے ایسے کئی بچوں کی داستانیں پڑھی تھیں جو زچگی کے مختلف مہینوں میں پیدا ہوئے اور بچ چلا ہے۔

اب میاں بیوی نے اپنی ایمانی قوت کو تولا۔ قطعی فیصلہ کرنے میں وقت لیا۔ روح کی گہرائیوں میں جاکر سوچ بچار کرتے رہے۔ آخر طے کیا کہ بچے کو محض اپنی خاطر زندہ رکھنا خود غرضی ہوگی۔ لہٰذا آسٹن کو زندہ رکھنے والی مشینوں سے الگ کر دیا گیا۔

نرسیں بچے کو کمرا نمبر 407 میں لے آئیں۔ وہاں غم زدہ ماں کیری نے چشم نم اُسے اپنی نرم گرم آغوش میں لے لیا۔ اس کا باپ بھی بچے پر جھک گیا۔ دونوں خاموشی سے اپنے معصوم ننھے کی موت کا انتظار کرنے لگے اور یہی وہ وقت ہے جب حقیقی کہانی کا آغاز ہوا۔

بیٹے کی تمنا

43 سالہ چپ کریگ اور کیری دو پیاری سی بچیوں کے والدین تھے۔ 6 سالہ کینڈرا اور 3 سالہ اریکا کو جنم دیتے ہوئے کیری کو کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

2011ء میں انھوں نے تیسرا بچہ پیدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ دراصل انھیں بیٹے کی تمنا تھی۔ سوچا کہ شاید اس بار خدا انھیں اولادِ نرینہ سے نواز دے۔ لیکن اس بار حمل انجام نہ پایا۔ تب انھوں نے ان وٹرو (In Vitro) طریق کار اپنایا جو کامیاب رہا۔ چناں چہ فروری 2010ء سے کیری کے رحم میں تین بچے پرورش پانے لگے۔ اگلے چند ہفتوں میں دو بچے مر گئے۔

حمل جب بیسویں ہفتے تک پہنچا تو مائع سے بھری تھیلی پھٹ گئی۔ کیری بھی کہ زچگی کا لمحہ آن پہنچا، لہٰذا وہ تیاری کرنے لگی۔ مگر معاملہ جوں کا توں رہا۔

ڈاکٹروں نے کیری کو بستر پر لٹا دیا تاکہ تیسرا اور آخری بچہ بچ سکے۔ کیری تھراپسٹ کی حیثیت سے مرسی میڈیکل سینٹر نامی علاج گاہ میں کام کرتی تھی۔ اس نے چھٹیاں لے لیں تاکہ چوبیس گھنٹے آرام کرتے گزارے۔ کیری نے مختلف مائع جات بھی کثرت سے پیے تاکہ جسم میں پانی کی کمی نہ جنم لے۔

جب وہ بستر میں لیٹے لیٹے اُکتا جاتی، تو اکثر اپنے رب سے شکایت کرتی "اے خدا! میں ہی کیوں؟"

کیری نے قبل از وقت پیدا ہونے والے بچوں کی کہانیاں بھی پڑھیں۔ ایسے بعض بچے فوری طبی امداد ملنے سے بچ بھی گئے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوا جب مائع تھیلی سلامت تھی۔ اس نے ایک کیلنڈر لیا اور ہر گزرنے والے دن پر نشان لگانے لگی۔ اس کی منزل 26 واں ہفتہ تھا۔

دراصل کریگ خاندان کو یقین تھا کہ اگر حمل 18 اگست تک برقرار رہا تو بچے کے بچنے کا امکان بڑھ جائے گا۔ وہ پھر اُسے بچانے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے۔

اسی دوران چپ اور کیری کو معلوم ہوا کہ ان کے ہاں بیٹا متوقع ہے، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے اس کا نام آسٹن لیوک (Luke) رکھ دیا۔ عیسائی دنیا میں سینٹ لیوک ڈاکٹروں اور جراحوں کا سرپرست بزرگ ہے۔ کیری کہتی ہے "ہم نے اپنے بیٹے کا نام لیوک اس لیے رکھا کہ ہمیں علم تھا، اُسے بچانے کی خاطر بہت سے ڈاکٹروں کی ضرورت ہوگی۔"

قدرتِ خدا کی مدد سے حمل ٹھیک رہا۔ منزلِ مقصود قریب آتی گئی کہ اچانک 17 اگست بروز جمعہ کیری کو دردِ زہ شروع ہو گیا۔ اسی دن دوپہر کے وقت یہ جوڑا

آسٹن ہسپتال آ پہنچا۔ کیری کو کمرا نمبر 407 میں داخل کر لیا گیا۔ اس کمرے میں عموماً وہ حاملہ خواتین ٹھہرائی جاتی تھیں جن کا حمل پیچیدگیاں لیے ہوتا۔

الٹرا ساؤنڈ سے انکشاف ہوا کہ آسٹن کی جسامت 26 ویں کے بجائے 23 ویں ہفتے کے بچے جتنی ہے۔ تب پتا چلا کہ مائع تھیلی کے ضائع ہونے سے آسٹن کی نشوونما کا عمل سست ہو چکا تھا۔

ماں چاہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ دیر تک بیٹے کو اپنے پاس رکھے۔ دراصل رحم میں بچہ روزانہ غیر معمولی رفتار سے بڑھتا ہے۔ پھر اگلے دن وہ ویسے بھی 26 ویں ہفتے کی اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچ جاتی، نتیجہ جو بھی نکلے۔

کیری کو کامیابی تو ملی مگر خاصی مشکل سے!

جب بچے کے دل کی دھڑکن نوٹ کرنے والا آلہ کیری کے شکم سے لگا، تو نرسیں اور ڈاکٹر دھڑکن کے قلب پر نظر رکھنے لگے۔ ہفتے کو صبح ساڑھے دس بجے دھڑکن اچانک مدھم پڑ گئی۔ طبی اصطلاح میں یہ حالت "سست پڑتی حرکت قلب" (Decelerating heartbeat) کہلاتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ بچہ دباؤ میں ہے۔

نرس جوڈی جولسن تین بیٹوں کی ماں تھی۔ اس نے کیری کو تسلی دی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جیپ بھی اسے دلاسا دیتا رہا۔ گیارہ بجے نومولود بچے دیکھنے والا بڑا ڈاکٹر راجر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے جوڑے کو بتایا کہ فوراً زچگی ہوگی ورنہ بچہ زندہ نہیں بچے گا۔

12 بج کر 17 منٹ پر آسٹن لیوک ٹریک دنیا میں آ گیا۔ اس کی دائیں آنکھ جسم سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ قد میں عام فٹ (رولر) کے برابر تھا۔ وزن صرف ایک پونڈ نو اونس تھا۔

تاہم وہ دیکھنے میں کمزور و ناتواں نہ تھا۔ ڈاکٹر راجر کو اس کا رنگ صحت مندانہ لگا۔ جیپ نے قسم کھا کر بتایا کہ اس نے آسٹن کی ہلکی سی چیخ بھی سنی ہے۔

پیدائش کے فوراً بعد آسٹن کو موبائل انکیوبیٹر میں لٹا کر انتہائی طبی نگہداشت کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں ڈاکٹر راجر دیگر معالجین اور نرسوں کی ٹیم کے ساتھ اسے بچانے میں محو ہو گیا۔

سب سے پہلے آسٹن کے حلق میں ایک ٹیوب داخل کی گئی تاکہ اسے غذا مل سکے۔ پھر اس کے پھیپھڑوں تک سرفیکٹنٹ (Surfactant) نامی کیمیائی مادہ پہنچایا گیا۔ پھیپھڑوں کو محفوظ رکھنے والا یہ مادہ عام طور پر قبل از وقت پیدا ہونے والے بچوں میں مفقود ہوتا ہے۔ بعد ازاں اوسیلیٹر (Oscilator) اس کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ یہ مشین انسانی پھیپھڑوں کی جگہ سانس لیتی اور انسان کو زندہ رکھتی ہے۔ مگر ان تمام احتیاطی تدابیر کا آسٹن نے مثبت جواب نہیں دیا۔

آسٹن کے خون میں آکسیجن صرف 55 فیصد حد تک جذب ہو رہی تھی۔ جبکہ اس کو 90 فیصد تک جذب ہونا چاہیے تھا۔ اس خرابی کی وجہ ڈاکٹر راجر جلد ہی سمجھ گیا۔ مائع تھیلی پھٹنے کے بعد آسٹن کے پھیپھڑے فطری نشوونما سے محروم رہے تھے، یوں وہ عمر کے حساب سے بڑھ نہ سکے۔

ڈاکٹر راجر کمرا نمبر 407 پہنچا تو چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہاں کیری اور جیپ کسی خوشخبری کے منتظر تھے۔ مگر ڈاکٹر راجر نے لگی لپٹی رکھے بغیر سچ سے جوڑے کو آگاہ کیا: "بچنے کی امید صفر ہے۔" اس نے

کیری اور چپ کو بتایا کہ اگر آسٹن مشینوں کے سہارے زندہ رہا تب بھی اس کے پھیپھڑے نشوونما نہیں پا سکتے۔ لہٰذا اس کی موت یقینی ہے۔

جب ڈاکٹر کیری کو یہ اندوہناک خبر دے رہا تھا تو کمرے میں جوڈی جانسن نامی نرس موجود تھی۔ ایک دل گرفتہ ماں اور ہمدرد معالج کی گفتگو سنتے ہوئے وہ خود پر قابو نہ پا سکی اور رو پڑی۔

تھوڑی ہی دیر بعد آسٹن ماں کی ممتا بھری گود میں تھا۔ دراصل جوڑے نے بچے کی پیدائش سے قبل ہی اپنا ضمیر مطمئن رکھنے کی خاطر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے سائنسی تجربات کی بھینٹ نہیں چڑھائیں گے۔ انھوں نے اسے بچانے کی بھرپور کوششیں کیں، افسوس کوئی تدبیر چارہ گر ثابت نہ ہو سکی۔

اب ننھے سے جسم میں مقید روح کے آزاد ہونے کا وقت آ پہنچا تھا۔ جوڑے کی خواہش تھی کہ اگر آسٹن کے مقدر میں موت ہی لکھی ہے تو لازم ہے، وہ ماں کی آغوش میں اطمینان و سکون سے دنیا کو خیرباد کہے۔

جب نرس جوڈی نے آسٹن کو دیکھا، تو آنکھوں میں آنسو لیے کیری کو بتایا "میں نے 26 ہفتے کا اتنا خوبصورت بچہ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

یہ ڈیڑھ بجے دوپہر کی بات ہے جب کیری اور چپ اپنے بیٹے کے ساتھ یکجا ہوئے۔ پہلے اور جلد بچھڑ جانے والے بیٹے کو آغوش میں لیتے ہی ننھی ماں نے اس کے کان میں سرگوشی کی "مجھے تم سے محبت ہے۔ ہم سب تمھیں چاہتے ہیں۔"

اس دوران چپ ہال کے میں واقع گرجا گھر چلا گیا۔ وہ بیٹے کے بچھڑنے سے قبل اسے بپتسمہ دینا چاہتا تھا۔ اگلے چند گھنٹوں میں لواحقین کمرا نمبر 407 میں آسٹن کو الوداع کہنے کے لیے جمع ہو گئے۔ ان میں چپ اور کیری کے والدین اور بھائی بہن شامل تھے۔ کیری نے کسی کو آسٹن نہ دیا، اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ دوسرے کی آغوش میں چل بسے۔

ایک گھنٹے بعد چھوٹے بڑے مغموم جوڑے کو تسلی دیتے رخصت ہوئے۔ تنہائی میسر آئی تو ماں باپ پھر بیٹے پہ جھک گئے اور اس کی صورت اپنے دل میں سمونے لگے۔

کیری بولی "اس کی پلکیں کتنی خوبصورت ہیں۔"

"اور ناخن اور بال بھی۔" چپ پیار بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

اپنائیت اور پژمردگی کے دور سے گزر کر دونوں شانت ہو چکے تھے۔ انھوں نے یہ تلخ حقیقت قبول کر لی تھی کہ موت دبے پاؤں آسٹن کی سمت بڑھ رہی ہے۔

کمرے میں صرف مشینوں کی بیپ کی آواز آ رہی تھی۔ لگتا ہے کہ جب نرس علیسا گیانی کمرے میں آ جاتی تاکہ آسٹن کے دل کی دھڑکن نوٹ کر سکے۔ جیسے ہی حالت غیر ہوتی دھڑکن کم ہونے لگتی۔

چار گھنٹے گزر گئے، آسٹن اب تک سانس لے رہا تھا۔ صحت مند دل فی منٹ 120 بار دھڑکتا رہا۔ ایک بار مشین نے بیپ کیا، تو آسٹن نے آنکھیں کھول دیں اور ننھی انگلیاں ماں کی انگلیوں کے گرد لپیٹ دیں۔ یہ ماجرا دیکھ کر ماں باپ حیران ہوئے۔ انھیں یہ خیال ستانے لگا کہ وہ بیٹے کو مرنے کی اجازت دے کر کیا درست قدم اٹھا رہے ہیں؟

آخر انھوں نے ڈاکٹر روز کو بلوا لیا۔ معالج نے بتایا "کبھی کبھی بچہ چل بسنے میں دیر لگاتا ہے۔" اس نے یقین دلایا کہ آسٹن طاقتور دل رکھتا ہے اور ممکن ہے

کہ وہ زندہ رہے۔ لیکن آگے چل کر انھیں بار بار ڈاکٹروں کے سہارے اور مدد کی ضرورت پڑے گی۔ اس امر نے پھر والدین کی ساری اُمیدیں آئینے کے مانند چکنا چور کر دیں۔

چپ نے سوچا کہ آسٹن کو بچانے کے انتظامات کیے جائیں۔ وہ مختلف لوگوں کو فون کرنے لگا۔ اس اثنا میں میلسا داخل ہوئی۔ اس نے آسٹن کے سینے پر اسٹیتھو سکوپ رکھا۔ دل دھیمی دھیمی دھک دھک کی آواز سے چل رہا تھا۔ چار گھنٹے پانچ میں بدلے اور پھر چھے بھی بیت گئے.....دل کی دھڑکن وہی 120 فی منٹ رہی۔

کیری اور چپ بار بار یہی سوچتے، یہ کیا ہو رہا ہے؟

شام سات بجے نرسوں کی شفٹ بدلی اور اب نرس اریکا آسٹن کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ بچہ اپنے والدین کے ساتھ کمرا 407 میں مقیم، فرشتہ موت کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ تب تک سارے ہسپتال میں ایسے بچے کی خبر پھیل چکی تھی جو گور کنارے کھڑا تھا، مگر اس کی حرکات کسی مردے جیسی نہیں تھیں۔

گھڑیال کی سوئیاں مسلسل حرکت میں رہیں۔ منٹ گزرے اور پھر گھنٹے بھی۔ اُدھر کمرا 407 میں انتظار جاری رہا۔ رات آٹھ بجے ڈاکٹر راجر گھر چلا گیا۔ اس کی جگہ نئی ڈاکٹر، کیسلر فراں آ پہنچی۔ نرس بدستور وقفے وقفے سے آسٹن کا معائنہ کرتی رہی۔

اریکا نے بچے کی ساری داستان ڈاکٹر کیسلر کو سنائی، تو وہ بھی اس سخت جان بچے میں دلچسپی لینے لگی۔ دس بجے آخرکار وہ بھی کمرا 407 پہنچی اور اپنا تعارف کیری اور چپ سے کرایا۔ آسٹن کو دیکھا بھالا اور والدین سے کہا: ''آپ کی اجازت سے میں بچے کے چند ٹیسٹ لینا چاہتی ہوں۔ دراصل اس کا دل مضبوط ہے۔ پھر یہ ردعمل بھی دکھا رہا ہے۔ میں آپ کا فیصلہ تبدیل نہیں کرنا چاہتی، بس یہ دیکھنا مقصود ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟''

کیری اور چپ نے اجازت دے دی۔ ٹیسٹوں سے انکشاف ہوا کہ آسٹن کے خون میں 80 فیصد تک آکسیجن جذب ہو رہی ہے جو صحت مندی کی علامت

غزل

خدا جانے دلوں کے درمیان یہ کیسا پردا ہے
کہ جو بھی آشنا ہے ایک بیگانہ سا لگتا ہے
یہ میرے شوق کی ہے ابتدا یا انتہا کیا ہے
کہ جو بھی بات لب پر آ گئی حرفِ تمنا ہے
نظر کی بات ہے ورنہ حجابوں میں رکھا کیا ہے
تمھارے منہ چھپانے پر بھی کیا کیا ہم نے دیکھا ہے
وفورِ ذوقِ نغمہ سے ملی منقار بلبل کو
مرا حُسنِ نظر میری ہی تخلیقِ تمنا ہے
جو کچھ ہم دیکھنا چاہیں وہ آئے نظر ہم کو
یہ دنیا تو ہماری آرزوؤں کا سراپا ہے
یونہی کہہ دی غزل ورنہ بقول حضرت غالبؔ
''اثرِ فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے''
یہ آنسو ہی نہیں تنہا فسانہ دردمندی کا
تبسم بھی تو آخر بے کسی کا ایک ٹکڑا ہے
(صوفی تبسم)

تھی۔ پھر خون میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی بھی قابل قبول سطح پائی گئی۔ خون میں تیزابیت کم تھی، مطلب یہ کہ جسم کو مطلوبہ مقدار میں آکسیجن مل رہی تھی۔

وہ ہر وقت اپنی ڈگر پہ گامزن رہا اور رات بارہ بجتے ہی اگلا دن شروع ہو گیا۔ گویا آسٹن کی زندگی دوسرے روز میں داخل ہو گئی۔ کیری کی نظر میں یہ ایک سنگ میل تھا لیکن کیوں؟ وہ اس امر کو نہ سمجھ سکی۔

ٹیسٹوں کے نتائج دیکھ کر ڈاکٹرنی نے ڈاکٹر راجر کو فون کیا۔ اسے یہ حقیقت ہضم کرنے میں مشکل پیش آئی کہ آسٹن کی صحت بہتر ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر سوچنے لگا ''کیا وجہ ہے کہ کام فطری منصوبے کے مطابق نہیں ہو رہا؟''

ڈاکٹر راجر نے پھر چپ کو فون کیا اور بتایا ''بھائی! کھیل حل ہو چکا۔'' چپ بتاتا ہے، وہ یہ جملہ ساری عمر یاد رکھے گا۔

اس وقت بارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ گویا انھیں کمرا 407 میں آئے گیارہ گھنٹے گزر چکے تھے تاکہ اپنے راج دلارے کی موت کا نظارہ کر سکیں۔ اب طبی عملہ بچے کو دوبارہ انتہائی نگہداشت کے کمرے میں لے گیا۔ طبی عملے نے اب آسٹن کو بچانے کی بھرپور سعی کرنا تھی۔

کیری نے حیرت بھری نظروں سے شوہر کو دیکھا اور پوچھا ''یہ کیا ہوا؟''

چپ سر کھجاتے ہوئے بولا ''کرشمہ!''

آپریشن تھیٹر میں سب سے پہلے یہ کوشش ہوئی کہ آسٹن خود سانس لینے کے قابل ہو سکے۔ مگر پھر اس کے پھیپھڑوں کی کمزوری آڑے آ گئی۔ چنانچہ اسے بذریعہ مشین ہی سانس دیا جاتا رہا۔

اس کی حالت رفتہ رفتہ بہتر ہوتی گئی۔ صبح تک آسٹن زندہ رہا، جس کے متعلق ڈاکٹروں کو یقین تھا کہ وہ دنیا میں چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ سچ ہے، جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے؟

ڈاکٹر راجر کہتا ہے ''میں اپنی بات غلط ثابت ہو جانے پر کبھی اتنا زیادہ خوش نہیں ہوا۔ میں اٹھارہ برس سے اسی ہسپتال میں کام کر رہا ہوں۔ اب تک میرے ساتھ ایسا حیرت انگیز ماجرا پیش نہیں آیا تھا۔''

اس سمیت تمام معالجین یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ آسٹن نے کیونکر موت کو شکست دی؟ اس ضمن میں ڈاکٹر راجر بتاتا ہے ''سائنس کا کہنا تھا کہ بچے میں پھیپھڑے افزائش نہیں پا سکتے۔ بیشتر بچوں میں حسب توقع یہی عمل جنم لیتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ مگر آسٹن نہ صرف کسی بیرونی مدد کے سہارے 12 گھنٹے زندہ رہا، بلکہ اس کا جسم شکر بھی خود بنانے لگا۔ حقیقتاً اس نے ٹیکنالوجی کے بغیر زندہ رہنے کا کارنامہ کر دکھایا۔''

آسٹن نے مجموعی طور پر 100 دن ہسپتال میں گزارے۔ اس دوران کچھ خطرناک لمحے بھی آئے، مگر وہ ہر بار موت پہ بازی لے گیا۔ آج اسے بعض ادویہ کھانی پڑتی ہیں، مگر وہ صحت مند بچے کی حیثیت سے پرورش پا رہا ہے۔

جس رات ہسپتال سے رخصت ہونا تھا، کیری نے اپنے فیس بک پیج پہ لکھا ''ننھا میری آغوش میں ہے۔ مجھے اب یہ فکر ستا رہی ہے کہ نجانے اس بستر پر کیسی ماں آئے گی۔ خدا سے میری بس یہی دعا ہے کہ اسے ان مصائب سے نہ گزرنا پڑے جو ہمیں سہنے پڑے۔ اور یہ کہ آخرکار نتیجہ ہماری طرح خوشگوار اور پسندیدہ ہی نکلے۔''

◆◆◆

میکسیکو کی سطح سمندر سے سات ہزار ساڑھے تین سو فٹ کی بلندی پر واقع دنیا کا بلند ترین اور تیز رفتار آبادکاری والا شہر ہے۔ اس کی آبادی دو کروڑ سے زائد اور شکاگو سے تین گنا زیادہ ہے۔ 1968ء میں منعقدہ اولمپک گیمز کے بعد وہاں ہوٹلوں، پارکوں اور دیگر تجاوزات کی تعمیر میں اور بھی زیادہ تیزی آگئی۔ اسے دیکھتے ہوئے کسی کو بمشکل یقین آئے گا کہ یہ عظیم شہر اپنی بقا کی جنگ میں فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ چکا...... کیوں کہ وہ رفتہ رفتہ زمین کے اندر دھنس رہا ہے۔

اس عظیم شہر کے غیر محسوس طریقے سے زیر زمین دلدل میں دھنسنے کی رپورٹیں نصف صدی قبل ماہرین ارضیات نے جاری کی تھیں۔ لیکن انہیں درخور اعتنا نہ سمجھا گیا۔ ان انتہائی رپورٹوں کی صداقت کا ثبوت اس وقت منظر عام پر آیا جب 1950ء میں شہر کے وسطی علاقے کئی فٹ بلند سیلابی پانی میں ڈوبنے لگے۔

بڑھتی آبادی کا عجب روپ

زمین میں دھنستا شہر

کثیر مقدار میں زیر زمین محفوظ پانی نکالنے کی وجہ سے
میکسیکو سٹی کے شہری اپنی قبریں خود کھودنے لگے

فرزانہ ثابت

یہ علاقے تیس برس میں تیس فٹ تک زمین کے اندر دھنس گئے۔

دھنسنے کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز تھی۔ شہر کی پیدل راہیں اور سڑکیں جو ایک دن ہموار دکھائی دیتی تھیں، اگلے ہی دن کہیں سے پست کہیں سے بلند دکھائی دینے لگیں۔ اکثر عمارات پیسا کے مینار کی طرح ایک طرف جھک گئیں جس وجہ سے کچھ عمارتیں گرانا پڑیں۔ سنگِ مرمر سے تعمیر شدہ پیلس آف فائن آرٹس جو 1935ء میں مکمل ہوا تھا، چند برس کے دوران اتنا گہرا زمین میں دھنس گیا کہ اس کی دوسری منزل سطح زمین تک آ پہنچی۔ اس کے آس پاس کی زمین بھی دلدل بنتی جا رہی تھی۔

1951ء میں دھنساؤ کی رفتار اتنی تیز ہوئی کہ اسے روکنے کے لیے جنگی بنیادوں پر کام کرنا پڑا۔ لیکن سرتوڑ کوششوں کے باوجود دھنسنے کی رفتار کو کم نہ کیا جا سکا۔ چناں چہ میکسیکو کا یہ دارالحکومت پانچ تا آٹھ انچ فی سال کے حساب سے زمین میں دھنستا رہا۔

اگر یہ شہر اپنی غرقابی یا مکمل دھنساؤ کے خطرے سے دوچار ہے تو اس کا سبب "پانی کی قلت" ہے۔ صدیوں تک اس شہر کو کنوؤں کے ذریعے پانی مہیا کیا جاتا رہا۔ رفتہ رفتہ آبادی میں زبردست اضافے کے ساتھ پانی کی طلب اور استعمال میں بھی اضافہ ہوا۔ چونکہ پانی نیچے سے کھینچ کھینچ کر نکالا جاتا رہا لہٰذا زمین میں دھنساؤ کا عمل شروع ہو گیا۔ لوگ گویا اپنے گھروں کی بنیادیں کھوکھلی کرنے لگے۔ بھاری بارشوں کے بعد پانی کی نکاسی کا مسئلہ بھی ایک دردِ سر بن جاتا۔ میکسیکو سٹی آتش فشانی سلسلہ ہائے کوہ ایناہواک کی وادی میں پھیلا ہوا ہے۔ 1325ء میں آزٹک انڈینوں کے ہاتھوں بنیادیں رکھے جانے کے بعد سے اسے آئے دن سیلابوں کا سامنا ہے۔ جب آزٹک وہاں پہنچے تو وادی کا غالب حصہ جھیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے جھیلوں کے درمیان ایک جزیرے میں اپنے عظیم شہر "ٹینوچٹیٹلان" کی بنیاد رکھی۔ وہاں سے زمین کی طرف کئی راستے نکلتے تھے۔ یہ جگہ نہروں اور آب راہوں سے بھری ہوئی تھی اس لیے نقل و حمل کے واسطے کشتیاں اور بجرے استعمال ہوتے۔

جب 1521ء میں ہسپانوی بحری مہم جوؤں نے اس شہر پر قبضہ کیا، تو انھوں نے آزٹکوں کی تعمیر کردہ تمام عمارات مسمار کر دیں۔ بجرے اور کشتیاں سب برباد ہوئیں اور بیگار میں پکڑے گئے انڈینوں کے ذریعے اتھلے پانیوں والی جھیلوں کا پانی نکال نکال کر انھیں پاٹ دیا گیا۔ اس طرح وہاں "میکسیکو" کا دارالحکومت... میکسیکو سٹی ہسپانوی شہر والے خدوخال لیے نمودار ہوا۔

اس دوران ہسپانوی بطور ایندھن اور چاندی کی کانوں میں استعمال کرنے کے لیے مسلسل درخت کاٹتے رہے۔ سو گرد و غبار کے طوفانوں کے ساتھ جو سیلاب آتے وہ اس لیے بے حد تباہی و بربادی مچاتے کہ پہاڑی ڈھلوانوں پر انھیں روکنے والے درخت نہیں رہے تھے۔ سیلابوں کی تباہ کاریوں کے پیشِ نظر چند سال بعد پانی روکنے کے لیے پہاڑیوں کے دامن میں ایک چار میل لمبی خندق اور نکاسی آب سرنگ کھودی گئی۔ لیکن مٹی کے کٹاؤ نے پانی کے بہاؤ میں رکاوٹیں پیدا کرنی شروع کر دیں۔

1629ء میں چھتیس گھنٹوں کی لگاتار موسلا دھار بارشوں سے تیس ہزار کے قریب نفوس پانی میں ڈوب کر اور بارشوں سے کمزور پڑتی عمارات کے گرنے سے ہلاک ہوگئے۔ اس پر چند نو آبادیاتی حکام نے تجویز پیش کی کہ دارالحکومت کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے۔ لیکن وہاں جن لوگوں نے بھاری سرمایہ کاری کر رکھی تھی' انھوں نے شدومد سے اس کی مخالفت کی۔ سو تجویز پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔

اگلی پانچ صدیوں کے دوران شہر کی آبادی میں اضافہ ہوتا رہا۔ 1845ء کے اختتام تک وہ دو لاکھ چالیس ہزار تک جا پہنچی۔ 1930ء میں یہ دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ بیس سالوں میں تین گنا بڑھی۔ پھر اگلے پندرہ سالوں میں دو گنا۔ ساتھ ساتھ شہر دھنسنے کا عمل بھی جاری رہا۔ اس نے لوگوں کو چونکانا بھی شروع کر دیا۔ 1938ء اور 1880ء کے درمیان دھنساؤ کا عمل ڈیڑھ انچ فی سال تھا۔ لیکن اگلے آٹھ سالوں میں یہ آٹھ فٹ تک زمین میں دھنس چکا تھا۔

اب شہر کا دھنساؤ مقامی باشندوں کو خوف زدہ اور پریشان کرنے لگا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ دھنسنے کے عمل سے نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ شہر کا قدیم ترین گرجا' ساحنا ماریا ایک طرف سے ترچھا ہو گیا۔ عمارت میں دراڑیں پڑ گئیں۔ دیگر یادگار عمارات بھی اسی حالت سے دوچار تھیں۔ پانی کے ذخائر اور بدروئیں ٹوٹنا پھوٹنا شروع ہو گئیں۔ 1900ء میں شہر کے گندے پانی کی نکاسی کے لیے تیس میل لمبی نہر کھودی گئی جو ڈھلوانیں اترتی دور پہاڑوں میں بنائی ایک سرنگ میں جا داخل ہوتی۔ یوں استعمال شدہ پانی شہر میں یا اس کے قرب و جوار میں نہ ٹھہرتا۔

اس کے باوجود 1950ء میں شہر بیس فٹ تک دھنس گیا اور گندے پانی کو پمپوں کے ذریعے نہر میں ڈالنا پڑا۔ انجینئروں نے خبردار کیا کہ بھاری بارشیں یا پمپنگ میں ذرا سا بھی تعطل تباہ کن ثابت ہوگا۔ 1951ء میں آنے والے سیلاب نے یہ بات واضح کر دی کہ فوری طور پر ہنگامی اقدام کی واقعی ضرورت ہے۔

1952ء میں ارنسٹو اُرچرو جب میکسیکو سٹی کا میئر بنا تو اسے دو سنگین قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اوّل پانی کی پائپوں کے ذریعے فراہمی، تاکہ کنوؤں سے پانی کھینچا جانا ممنوع قرار پائے۔ دوسرے گندے پانی کی تیز رفتار نکاسی کا انتظام۔ اس نے شہر میں مختلف مقامات پر بڑے بڑے تالاب بنوائے تاکہ بارشوں کا پانی ان میں ذخیرہ ہو سکے۔ پھر اسے پمپوں کے ذریعے شہر سے باہر نکال دیا جاتا۔ اس نے شہر کے گرد بڑے بڑے نالے بھی تعمیر کروائے تاکہ پہاڑوں سے آنے والا پانی شہر میں داخل نہ ہو سکے۔ اس نے تیس کے قریب نئے پمپنگ اسٹیشن بھی تعمیر کروائے۔ نیز نجی ملکیت کے چھے ہزار کنوؤں میں سے پانچ ہزار بند کروا دیے۔ یوں شہر کے دھنساؤ کا عمل وقتی طور پر رُک گیا۔

لیکن ان تمام اقدامات کے باوجود 1962-63ء کی تیز و تند بارشوں نے بڑی نہر کو لبالب بھر دیا۔ اگر اس پانی کی سطح چند انچ اور بلند ہو جاتی تو تمام شہر پانی میں ڈوب جاتا۔ شہر کے باہر جو چند سو نئے کنوئیں کھودے گئے تھے' ان کی بدولت شہر کے دھنسنے کا عمل پھر شروع ہو گیا۔ چودہ برس کی سخت ترین کوششوں کے

باوجود ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔

جب کوئلہ اور تیل زمین سے نکالے جائیں تو سطح زمین ناہموار اور بھربھری ہو جاتی ہے۔ اس میں کٹاؤ اور دھنساؤ کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن میکسیکو سٹی ہی دنیا میں ایسی واحد مثال ہے جہاں سطح زمین کے بگاڑ کا سبب زیر زمین پانی کی گھٹتی سطح ہے۔

"پمپوں سے کھینچا جانے والا ایک گیلن پانی بھی زمین کے اندر سوراخ کر دیتا ہے۔" ایک انجینئر بتاتا ہے "اسی باعث زیر زمین مٹی میں شگاف پڑ جاتے ہیں اور سطح زمین اسی تناسب سے دھنس جاتی ہے۔ اب یہ حال ہو چکا کہ سو فٹ کی گہرائی میں جابجا مٹی کے چھوٹے چھوٹے جزائر بن چکے۔ ان میں بعض اتنے مضبوط ہیں کہ عمارات کی بنیادوں کو بخوبی سہار سکتے ہیں۔ کئی مقامات پر زمین دلدل کا روپ دھار چکی۔ سو ان مقامات پر جو تعمیرات ہو چکیں، وہ رفتہ رفتہ دھنس رہی ہیں۔"

"شہر میں تہ خانوں اور بنیادوں کے لیے کھدائی ایک اعصاب شکن کام بن چکا۔" انجینئروں کی کونسل کے سربراہ برنارڈو گونانا کا کہنا ہے۔ "جونہی کسی جگہ کھدائی کی جائے، وہاں گڑھا نمودار ہو جاتا ہے جس میں پانی رس رس کر جمع ہونے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ قریبی عمارات کی بنیادیں لرزنے لگتی ہیں۔ سڑکیں ٹیڑھی ہوتیں اور قانونی کارروائیوں کے لیے دوڑیں لگ جاتی ہیں۔ اگر اس جگہ ایک چھوٹا سا ڈیم بھی تعمیر کیا جائے تو کھدائی ہوتے ہی زمین بوس ہو جائے گا۔ تب عمارتیں پانی میں تیرنے لگیں گی یا پھر زیر آب چلی جائیں گی۔

لاطینی امریکا کی بلند ترین عمارت چوالیس منزلہ "ٹورے مایور" بھی دلدل میں تیر رہی ہے۔ اسے مکمل طور پر زمین میں غرق ہو جانے سے بچانے کے لیے اس کے نیچے سٹیل اور کنکریٹ کے فرش اور ستون لگائے گئے ہیں۔ عمارت کو سہارا دینے کے لیے چاروں طرف دیوہیکل "کندھے" بھی لگے ہیں۔

پاسیو ڈی لا ریفارما میں امریکی سفارت خانے کی عمارت بھی کنکریٹ کے بہت بڑے تختے پر تعمیر کی گئی۔ یہ بھی زیر زمین دلدل میں تیر رہی ہے۔ جب بھی زلزلے کے جھٹکے لگیں جو میکسیکو سٹی میں معمول کی بات ہیں تو یہ عمارت بری طرح لرزنے ڈولنے لگتی ہے۔

میکسیکو سٹی کے وسیع و عریض اور خوبصورت ہوائی اڈے کا زیادہ تر رقبہ نم زدہ اور دلدلی ہے۔ یہ اس جگہ واقع ہے جہاں پہلے جھیل میکسکو واقع تھی۔ جھیل کو سابقہ حالت میں لانے کے لیے یہ تجویز زیر غور ہے کہ اس جگہ ایک دھماکا کر دیا جائے۔ یوں شہر کے تمام گندے پانی کو وہاں قابل استعمال بنا کر اسے گرین بیلٹ میں ڈالا جائے گا۔ ایک منصوبہ یہ ہے کہ اسی فٹ کی گہرائی میں نیم نالہ تعمیر کیا جائے جو کئی میل لمبا ہو۔ اس کے ذریعے زیر زمین پانی زمین کے اندر ہی شہر سے باہر نکال دیا جائے۔ اس نیم نالے کی تعمیر میں ورلڈ بینک نے حکومت میکسیکو کو ایک خطیر رقم بطور امداد دی ہے۔ مزید آب راہوں کی تعمیر بھی زیر غور ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر شہر کا دھنساؤ روکنا مطلوب ہے تو باقی ماندہ کنوؤں سے پانی نکالنا روک دیا جائے۔

◆◆◆

بہار 1894ء کی بات ہے، لندن میں

موسم

رونالڈ اڈیر کے قتل نے ہلچل مچا رکھی تھی۔ پولیس نے سرتوڑ کوشش کی کہ قاتل کا پتا چلا لے مگر ناکام رہی۔ حتیٰ کہ وہ یہی نہیں جان پائی کہ قتل کیونکر ہوا۔ تب مجھے اپنا سراغ رساں دوست شرلاک ہومز بہت یاد آیا۔ وہ تین سال قبل دنیا کے ذہین ترین مجرم، پروفیسر موریارٹی کے ساتھ گتھم گتھا ہوتے سوئٹزر لینڈ کی آبشار رائیشن باخ میں گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔

رونالڈ اڈیر لندن کی اشرافیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ ارل آف مے نوتھ آسٹریلوی نوآبادی، سڈنی کا گورنر تھا۔ اس کا گھرانا لندن کے علاقے، پارک لین کے مکان نمبر 427 میں مقیم تھا۔ رونالڈ تاش کھیلنے کا شوقین تھا اور اکثر رات کو دوستوں کے ساتھ جوا بھی کھیلتا۔

30 مارچ 1894ء کو رات کا کھانا کھا کر وہ بالڈون کلب چلا گیا۔ وہاں وہ اپنے تین دوستوں، مرے، سرجان ہارڈی اور کرنل کے ساتھ بازیاں کھیلنے میں مصروف رہا۔ اس رات وہ جوئے میں پانچ پاؤنڈ ہار گیا تاہم یہ زیادہ بڑی رقم نہیں تھی۔ پھر ایک ہفتہ قبل ہی اس نے سرجان ہارڈی کے ساتھ مخالف جوڑے کو ہرا کر جوئے میں چار سو پاؤنڈ کی خطیر رقم جیتی تھی۔

بالڈون کلب سے رونالڈ رات 10 بجے گھر واپس پہنچا۔ اس کی ماں اور بہن کسی رشتے دار کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ وہ پہلی منزل پر واقع اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ملازمہ نے اسے چائے دی اور پھر واپس چلی آئی۔

ماں اور بہن ساڑھے گیارہ بجے لوٹیں۔ ماں کا معمول تھا کہ وہ سونے سے قبل بیٹے کا ماتھا چومتی تھی۔ ماں نے بیٹے کے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا، تو وہ خلاف معمول بند تھا۔ ماں نے کئی بار دستک دی، مگر دروازہ نہ کھلا تو وہ متوحش ہو گئی۔ چنانچہ گھر کے ملازم کو بلایا گیا جس نے دروازہ توڑ ڈالا۔

پریشان اہل خانہ اندر پہنچے تو دیکھا کہ رونالڈ اپنی میز کے نزدیک گرا پڑا ہے۔ اس کا سر و چہرہ خون خون تھا۔ ریوالور کی ایک گولی نے کھوپڑی میں خاصا بڑا سوراخ کر دیا تھا۔ میز پر کرنسی نوٹ تین چار ڈھیریوں کی شکل میں پڑے تھے۔ ساتھ ہی ایک کاغذ پڑا تھا جس میں رونالڈ کے دوستوں کے نام درج تھے۔ یہ عیاں تھا کہ وہ جیتی ہوئی رقم کا حساب کتاب کر رہا تھا۔

پولیس کو کمرے میں سے آلۂ قتل نہیں ملا۔ حقیقتاً قتل اتنا پراسرار تھا کہ سراغ رساں اس کی گتھی سلجھا نہ سکے۔ پہلا سوال تو یہی تھا کہ رونالڈ نے اپنے کمرے کا دروازہ کیوں بند کیا؟ پہلے پولیس یہی سمجھی کہ مجرم نے دروازہ بند کیا پھر کمرے کی کھڑکی سے فرار ہو گیا۔

لیکن کھڑکی پورے 25 فٹ بلند تھی۔ پھر اس کے عین نیچے ایک بڑی کیاری میں سیکڑوں پھول کھلے تھے۔ پولیس کو کیاری اور اس قطعہ گھاس سے بھی قدموں کے نشان یا ابتری کے آثار نہ ملے جو گھر اور سڑک کے مابین موجود تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مقتول نے خود دروازہ بند کیا۔

لیکن پھر اس کا موت سے سامنا کیسے ہوا؟ ظاہر ہے کوئی کھڑکی سے چڑھتا اور اترتا، تو وہ کچھ نشانی تو چھوڑ کر جاتا۔ شاید سڑک سے کسی نے اس پر فائر کیا۔ تب وہ یقیناً ماہر نشانے باز تھا جس نے ننھے ریوالور سے گولی مار کر رونالڈ کو ہلاک کر دیا۔

مگر یہ مسئلہ بھی تھا کہ پارک لین میں ہر وقت خاصی گہما گہمی رہتی تھی۔ گھر سے سو گز دور ہی تانگوں کا اڈہ تھا۔ لیکن کسی نے گولی کی آواز نہیں سنی اور نہ ہی کسی کو فائر کرتے دیکھا گیا۔ اس کے باوجود ریوالور سے گولی چلی جس نے ایک نوجوان کا دماغ چھید ڈالا۔ اس اسرار کو یہ بات مزید گمبھیر بنا ڈالتی ہے کہ رونالڈ کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ قاتل چور بھی نہیں تھا، ورنہ میز پر رقم نہ دھری ہوتی۔

یہ حادثہ اتنا پُراسرار تھا کہ میں بھی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پارک لین پہنچ گیا۔ گھر کے باہر خاصا ہجوم تھا۔ لوگ اپنے اپنے نقطہ نظر سے کیس کی تشریح کر رہے تھے۔ ہجوم کے باعث میں ایک بوڑھے اور خمیدہ کمر والے بوڑھے سے ٹکرا گیا۔ اس نے کچھ کتابیں تھام رکھی تھیں جو زمین پر جا گریں۔ بوڑھے نے مجھے غصے سے دیکھا، کتابیں اٹھائیں اور ہجوم میں گم ہو گیا۔

427 پارک لین کا جائزہ لینے سے میرے ذہن میں نئے تانے بانے مزید الجھ گئے۔ گھر اور سڑک کے درمیان چار فٹ اونچی دیوار حائل تھی۔ جہاں پر کوئی بھی بالغ اسے پھلانگ کر اندر آ سکتا تھا۔ لیکن کھڑکی کے قریب کوئی پائپ یا ایسی شے نہیں تھی جس کی مدد سے کوئی چست و چالاک شخص اوپر چڑھ جاتا۔

چنانچہ میں مزید الجھن میں مبتلا ہو کر گھر واپس آیا۔ اب میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک انوکھا مہمان آ موجود ہوا... وہی بوڑھا جس سے میں پارک لین میں ٹکرایا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گھوم پھر کر پرانی کتابیں فروخت کرتا ہے۔ اور پھر دریافت کیا ''کیا آپ کو برطانوی پرندوں، جنگوں یا ہمالیہ کے متعلق کتب درکار ہیں؟''

میں نے کتابوں کی اپنی الماری پر کچھ دیر نگاہ جمائے رکھی اور پھر مہمان کو دیکھا، تو یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ وہاں شرلاک ہومز بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اُسے زندہ دیکھ کر قدرتاً میں غش کھا گیا اور چند لمحے کے لیے اپنے حواس کھو بیٹھا۔

دس پندرہ منٹ بعد میں میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے اپنے دوست کی داستان سنی۔ اس نے بتایا ''پروفیسر موریارٹی مجھے گھاٹی میں گرانا چاہتا تھا۔ لیکن آخری لمحے میں اس کی گرفت سے آزاد ہونے میں کامیاب رہا۔ یوں زندہ بچ گیا۔ یہ قدرت کی طرف سے بہترین انعام تھا۔

''واٹسن! وجہ یہ ہے کہ مجھے علم تھا، ابھی میرے تین انتہائی خطرناک دشمن باقی ہیں۔ اب میری موت کی خبر پھیلتی، تو وہ بے پروا ہو جاتے۔ تب اس عالم بے خبری میں انھیں دبوچنا آسان تھا۔ اسی لیے میں گھاٹی کے نیچے سے ہوتا ہوا دوسری طرف جا نکلا۔ یہ راستہ اوپر سے نظر نہیں آتا۔ اسی لیے تم ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ میں مر چکا۔

''میں واپس شہر کی طرف جا رہا تھا کہ مجھ پہ کسی نے فائر کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ پروفیسر موریارٹی تنہا نہیں تھا۔ اس کے کسی ساتھی نے اُسے مرتے دیکھا اور اب وہ میرے پیچھے تھا۔ لیکن خوش قسمتی نے پھر مجھے موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا۔ میں پھر مختلف ملکوں میں گھومتا پھرتا رہا۔ اپنے زندہ ہونے کی خبر صرف اپنے بھائی، مے کرافٹ کو دی تا کہ وہ میرے گھر کی دیکھ بھال کرتا رہے اور اُسے اجڑنے نہ دے۔ اور واٹسن! اگر میں تمھیں اپنے زندہ ہونے کی خبر دیتا، تو تم اپنی کہانیوں میں بڑے دردناک انداز میں میری موت کی خبر نہ دیتے۔

"میں چند روز قبل ہی لندن پہنچا ہوں۔ اس دوران پارک لین میں پُراسرار قتل ہو گیا۔ یہ کیس میرے مزاج کے مطابق تھا لہٰذا اُس کی سن گن لیتے وہاں پہنچا۔ اُدھر تم سے ملاقات ہو گئی اور اب تمھارے سامنے براجمان ہوں۔"

یہ داستان سن کر میرے ذہن میں کئی سوال چکر کھانے لگے۔ ہومز میرا مدعا تاڑ گیا اور مسکرا کر بولا "واٹسن، اگر میں نے تمھیں دکھ دیا، تو اُسے بھول جاؤ۔ اب کام کرنے کا وقت ہے۔ آج رات ساڑھے نو بجے ہم نے خالی مکان میں پہنچنا ہے۔"

ہومز رات کو نو بجے میرے گھر پہنچ گیا۔ میں نے اپنا ریوالور جیب میں رکھا اور اس کے ساتھ باہر ہو لیا۔ ہم پھر ٹرام میں بیٹھے۔ دوران سفر ہومز خاموش رہا۔ اس پر مخصوص گہری سنجیدگی طاری تھی۔ سوچتے ہوئے وہ ہوا میں خیالی دائرے بھی بناتا رہا۔

میرا خیال تھا کہ ہم بیکر اسٹریٹ جا رہے ہیں، مگر اس نے کیونڈش سکوائر پہ ٹرام روک لی۔ اترتے وقت ہومز نے بڑے غور سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر مجھے لیے سامنے گلی میں ہو لیا۔ اس دوران ہومز کی پوری کوشش رہی کہ یہ دیکھ سکے، کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا۔

ہم چھوٹی بڑی گلیوں میں چلتے گئے۔ ہومز لندن کے چپے چپے اور ہر کونے کھدرے سے واقف تھا۔ ہر گلی اور چوک سے وہ تیزی سے گزرتا تاکہ کسی کی نظروں میں نہ آسکے۔ اس رات ہومز نے مجھے ایسی گلیوں کی سیر کرائی جو میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ آخر ایک پتلی گلی سے ہوتے ہوئے ہم ایک وسیع و عریض ویران واجاڑ مکان کے پچھواڑے پہنچ گئے۔ ہم پچھلے صحن میں موجود دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ مکان میں بالکل اندھیرا تھا۔ ہومز اپنی غیر معمولی حسّوں کے سہارے میرا ہاتھ پکڑے آگے بڑھتا رہا۔ لگتا تھا کہ وہ پہلے یہاں آچکا ہے۔ آخر ہم ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے جس کی کھڑکی سے روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی۔ میرا دوست میرے کانوں کے نزدیک اپنے لب لایا اور سرگوشی کی "واٹسن! تم جانتے ہو کہ ہم کہاں ہیں؟"

میں باہر جھانکتے اور گردوپیش پہچانتے ہوئے بولا "ارے ہم تو بیکر اسٹریٹ میں ہیں۔"

"ہاں، یہ کیمڈن ہاؤس ہے جو طویل عرصے سے خالی پڑا ہے۔ اس کمرے کی کھڑکی سے میرے فلیٹ کا اندرونی منظر صاف نظر آتا ہے۔ اب ذرا کھڑکی سے دور رہتے ہوئے ہی میرے فلیٹ کو دیکھو، شاید وہاں ایک منظر تمھیں ششدر کر دے۔"

میں نے حیرت سے ہومز کو دیکھا اور پھر بغور اس کے فلیٹ کو دیکھا، واقعی وہاں کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرے میں ہوبہو ہومز کی شکل کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ کمرے میں خوب روشنی تھی۔ لہٰذا وہ دور سے بھی واضح نظر آ رہا تھا۔ وہ میز پر بیٹھا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کی شکل وجسامت ہومز سے اتنی زیادہ ملتی جلتی تھی کہ میں چکرا کر رہ گیا۔

میں نے مڑ کر مدہم روشنی میں ہومز کو دیکھا، تو وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے کہا "دوست! خدا کے لیے مجھے فوراً سچ بتاؤ، ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

ہومز بولا "ارے یہ میرا موی مجسمہ ہے۔ بنانے والے کو داد دو کہ اس نے بڑی مہارت سے بنایا۔ قریب پہنچ کر بھی معلوم نہیں پڑتا کہ وہ بے جان ہے۔ یہ بتاؤ،

یہی لگتا ہے نہ کہ میں وہاں بیٹھا ہوں۔"

میں نے کہا" میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ وہ تم ہی ہو۔لیکن تم نے یہ مجسمہ کیوں بنوایا؟"

"میرے دوست واٹسن اس لیے کہ میری نگرانی شروع ہوچکی۔"

"نگرانی؟ مگر تمھاری نگرانی کون کر رہا ہے؟"

"جو میری جان کے دشمن ہیں۔ میں نے کل صبح ایک مقامی مجرم کو اپنے فلیٹ کے آس پاس منڈلاتے دیکھا۔ مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں، لیکن مقامی مجرم کا باس بڑا خطرناک آدمی ہے۔ مجھے اسی کی فکر ہے۔ وہی اس وقت لندن کا سب سے شاطر اور خطرناک مجرم ہے۔لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اسے خبر نہیں، ہم اس کے پیچھے ہیں۔ واٹسن، صرف وہ اور اس ساتھی جانتے ہیں کہ میں زندہ ہوں۔اسی نے سوئٹزرلینڈ میں مجھ پر گولی چلائی تھی، لیکن میں بچ گیا۔"

ہومز کی باتیں سن کر مجھے اس کا منصوبہ سمجھ آگیا۔ وہ اس ویران وسنسان مکان میں پوشیدہ رہ کر ان لوگوں کی تاک میں تھا جو اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ گویا ہم شکاری بن گئے تھے اور ہم نے چارہ پھینک ڈالا تھا۔ ہم پھر کھڑکی سے کچھ دور کھڑے ہوکر مجرم یا مجرموں کا انتظار کرنے لگے۔

کھڑکی کے باہر کا منظر واضح نظر آتا تھا۔ مرد وخواتین آجا رہے تھے اور رات ہونے کے باعث سردی بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ سبھی لوگ موٹے کپڑوں میں ملبوس تھے۔کافی وقت گزر گیا مگر کوئی مشکوک فرد یا افراد نظر نہ آئے۔ ہومز فرش پہ جوتے بجا کر اپنی بے چینی کا اظہار کرنے لگا۔ میں بھی بے صبری کا شکار تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ہومز کے موم مجسمے میں حرکت ہوئی اور اس نے پہلو بدل لیا۔ یہ دیکھ کر میرے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

میں نے ہولے سے کہا" ارے وہ مجسمہ تو ہل رہا ہے۔"

ہومز میری گھبراہٹ سے قطعاً پریشان نہ ہوا اور اطمینان سے بولا" ارے بھئی میں ملازمہ کو کہہ آیا تھا کہ وہ ہر دس پندرہ منٹ بعد گھٹنوں کے بل چل کر مجسمے کے پاس جائے اور اسی کا رخ بدل دے، تا کہ کسی کو شک نہ ہو.... "ارے یہ کیا؟"

ہومز اچانک کوئی آواز سن کر ہوشیار ہوگیا۔ اس نے ساری حسیات آنے والی آواز پہ مرکوز کردیں۔ وہ تن کر کھڑا ہوا اور کسی چاق چوبند چیتے کے مانند نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کمرے کے کونے میں لے گیا جہاں گھپ اندھیرا تھا۔

ابتداً مجھے کچھ نہیں آئی کہ ہومز یکایک کیوں پریشان ہوگیا۔ پھر مجھے بھی وہ آواز آنے لگی جو اس کی طاقتور سماعت نے سن لی تھی۔ یہ آواز بیکر سٹریٹ نہیں اسی مکان کے پچھواڑے سے آرہی تھی جس میں ہم چھپے بیٹھے تھے۔

کوئی شخص ہولے ہولے چلتا ہماری طرف آرہا تھا۔ چونکہ مکان خالی تھا لہٰذا احتیاط سے رکھے قدم بھی خاصی آواز پیدا کر رہے تھے۔ ہومز کونے میں مزید دبک گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ البتہ میرا ہاتھ سرک کر جیب میں پہنچا اور ریوالور پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں ایک سایہ کمرے میں داخل ہوتا نظر آیا۔ اس نے ہماری طرح سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ لہٰذا کسی بے خبر آدمی کے لیے اُسے اندھیرے میں پہچاننا بڑا مشکل تھا۔ وہ کچھ دیر رکا اور کھڑکی کی طرف دیکھا۔ تب میں ریوالور نکالنے کے لیے تیار ہوگیا۔ لیکن اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور کھڑکی کی طرف چل پڑا۔

وہ پوری طرح اپنے آپ میں مگن تھا۔ وہ ہماری طرف متوجہ ہوئے بغیر بسرعت اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ اس نے پہلے بڑی آہستگی و صفائی سے کھڑکی کا شیشہ آدھا فٹ اٹھایا۔ تب سڑک کی جانب سے آنے والی روشنی براہِ راست اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ ایک بوڑھا چہرہ تھا، طوطے جیسی لمبی ناک اور چوڑا ماتھا۔ اس کی آنکھیں ستاروں کے مانند چمک رہی تھیں۔

وہ ایک چھڑی تھامے ہوئے تھا۔ لیکن جب اس نے اسے زمین پر رکھا، تو کسی دھات کے مانند ٹن کی آواز آئی۔ اس نے پھر جیب سے کوئی بھاری شے نکالی اور اسے بظاہر چھڑی میں نصب کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ٹھک کی آواز آئی جیسے کوئی پیچ اپنی جگہ جم گیا۔ وہ پھر جھک کر کچھ کرنے لگا اور جب اٹھا تو اس کے ہاتھ میں بندوق نما کوئی شے نظر آئی۔ اس کا دستہ بڑا غیر معمولی طور پر بنا تھا۔

اس کارروائی کے بعد وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا اور بندوق کی نال کھڑکی کی جگہ پر رکھ دی۔ اس کی نگاہیں ہومز کے فلیٹ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ آدمی نے پھر دستہ کندھا پر ٹکایا اور شست باندھی۔ تب وہ انتہائی ہوشیار نظر آرہا تھا۔ اچانک زبان کی ٹخ سی بلند ہوئی جیسے کوئی آواز آئی اور پھر شیشہ ٹوٹنے کی!

اسی لمحے ہومز چیتے کی طرح اُچھلا اور بندوقچی پر جاپڑا۔ دونوں گتھم گتھا ہوکر فرش پر لیٹ گئے۔ آدمی نے ہومز کو لات ماری اور چاہا کہ فرار ہوجائے، لیکن میں نے پوری قوت سے اپنے بھاری ریوالور کا دستہ اس کے سر پر دے مارا۔ وہ کراہتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

اسی وقت ہومز کے حلق سے سیٹی کی آواز بلند ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ جلد ہی تین آدمی وہاں آپہنچے۔ ان میں سے ایک کو میں فوراً پہچان گیا، وہ مقامی پولیس کا سراغ رساں، جیمز لیسٹرڈ تھا۔ اس کے ساتھ دو باوردی سپاہی تھے۔

ہومز اُسے دیکھتے ہی بولا "اخاہ لیسٹرڈ! تم بروقت پہنچ گئے۔"

لیسٹرڈ نے کہا "مسٹر ہومز! آپ نے لندن پہنچتے ہی پہلا شکار قابو کرلیا۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔"

"ہاں میں نے سوچا کہ پولیس کو غیر سرکاری مدد مل جائے۔ اس سال تین قتل کے کیس وہ حل نہیں کرپائی۔"

اس دوران ہم سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں سپاہی قیدی کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔ تبھی سپاہیوں نے ہاتھوں میں تھامی ٹارچیں بھی روشن کردیں۔ یوں قیدی مجھے اچھی طرح نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے سے درشتی اور خباثت ٹپک رہی تھی۔ وہ شعلہ بار نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر ہومز کو کھا جانے والی نگاہوں سے گھورنے لگا۔ تبھی وہ بولا "تم بہت چالاک نکلے شیطان کہیں کے!"

مگر ہومز پر اس جملے کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ اپنا لباس درست کرتے ہوئے گویا ہوا "یار کرنل! خدا کے

عاشقوں کے ملاپ پر اختتام پذیر ہوتے ہیں، جیسا کہ شیکسپیئر نے ایک ڈرامے میں لکھا ہے۔ میرا خیال ہے، آبشار والے واقعے کے بعد آج تم سے ملاقات ہوئی ہے۔"

کرنل بدستور غصیلی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا اور بس یہی کہہ سکا "تو بہت عیار و مکار ہے۔"

ہومز پھر مجھ سے مخاطب ہوا "واٹسن! میں نے تم سے اس کا تعارف نہیں کرایا۔ اس جینٹلمین کا نام کرنل سباسٹین موران ہے۔ کسی وقت ہندوستان میں شاہی فوج کا افسر تھا۔ وہیں ماہر شکاری بن کر واپس آیا۔ کیوں کرنل! میں نے سنا ہے کہ تم نے ہی سب سے زیادہ ہندوستانی شیر مارے ہیں؟"

طیش میں آیا بوڑھا کچھ نہ بولا، بس پہلے کے مانند اُسے گھورتا رہا۔ وہ اپنی وحشیانہ نظروں اور لمبی مونچھوں کی وجہ سے خود شیر لگتا تھا۔

ہومز دوبارہ بولا "مجھے حیرت ہے کہ تم تجربے کار شکاری ہوتے ہوئے بھی میرے بچھائے دام میں پھنس گئے۔ البتہ تم نے بھی مجھے چھوٹی سی حیرت میں مبتلا کیا۔ میرے وہم و گمان میں نہ تھا کہ تم بھی اس خالی مکان میں پہنچ کر اسی خالی کھڑکی سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ میرا خیال تھا کہ تم سڑک سے وار کرو گے۔ اسی لیے پولیس بھی تمہاری راہ میں انتظار کر رہی تھی۔"

کرنل موران نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ سرکاری سراغ رساں کی جانب مڑتے ہوئے بولا "قانون کے پاس مجھے گرفتار کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی؟"

جیمو لیسٹر بولا "تم نے مسٹر ہومز پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ یہ کوئی معمولی جرم نہیں۔ اگر ان کے کھڑکی کی جگہ وہ خود ہوتے، تو یقیناً عالم بالا پہنچ چکے ہوتے۔"

اس دوران ہومز نے فرش پر گری طاقتور ایئرگن اٹھائی اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے آج تک ایسی انوکھی ایئرگن نہیں دیکھی تھی جو ریوالور کی گولی چلانے پر قادر تھی۔

ہومز اس کے میکنزم کی پڑتال کر کے بولا "یہ قابل تعریف اور یکتا ہتھیار ہے۔ زیادہ شور کیے بغیر ریوالور کی گولی دور تک پھینکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ ایئرگن ایک جرمن مکینک، وان ہرڈر نے پروفیسر موریارٹی کے لیے بنائی تھی۔ میں عرصہ دراز سے اس کی موجودگی سے باخبر تھا، لیکن آج ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ لیسٹر! اسے سنبھال کر رکھنا، یہ بہت نادر و نایاب شے ہے۔"

لیسٹر ایئرگن لیتے ہوئے گویا ہوا "مسٹر ہومز! آپ اطمینان رکھیے، ہم اس کی خوب حفاظت کریں گے۔ اچھا ہم چلتے ہیں۔ آپ کچھ اور کہنا چاہیں گے؟"

"یہ بتاؤ کہ کرنل پر چارج کیا لگاؤ گے؟"

"یہی چارج کہ اس نے مسٹر شرلاک ہومز پر قاتلانہ حملہ کیا۔"

"نہیں نہیں لیسٹر، میں مقدمے بازی میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اور نہ ہی یہ خواہش ہے کہ میرا اس معاملے میں نام آئے۔ کرنل کو گرفتار کرنے پر ساری نیک نامی اور شہرت کا سہرا تمہارے ہی سر بندھنا چاہیے۔ لیسٹر تمہیں مبارک ہو کہ تم نے بے مثال ذہانت اور پیشہ ورانہ مہارت کا استعمال کرتے ہوئے اسے پکڑ ہی لیا۔"

سراغ رساں نے حیرت سے پوچھا "پھر

لیا؟ مسٹر ہومز کے پکڑ لیا؟"

"ارے بھئی جس کے پیچھے لندن کی ساری پولیس لگی ہوئی ہے۔ یہ کرنل سباستین موران ہی تو ہے جس نے رونالڈ اڈیر کو گولی ماری۔ آلۂ قتل بھی ایئر گن ہے۔ 427، پارک لین کے سامنے والے فلیٹ کی دوسری منزل سے گولی چلائی گئی جس نے نوجوان کا کام تمام کر ڈالا۔ لیسٹر، اس پہ بھی چارج ڈالو۔ کیس کی تفصیل تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

تھوڑی دیر بعد ہم ہومز کے گھر دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ اس کی ملازمہ مسز ایڈزسن نے دروازہ کھولا۔ ہم تینوں اس کمرے میں پہنچے جہاں میرے دوست کا موی مجسمہ رکھا تھا۔ مسز ایڈزسن اسے دیکھ کر بولی" مسٹر ہومز! مجھے افسوس ہے کہ آپ کا یہ موی مجسمہ خراب ہو گیا۔ گولی اس کا سر چھیدتی سامنے والی دیوار پہ جا لگی۔ میں نے اسے قالین سے اٹھایا۔ وہ یہ رہی!"

ہومز نے گولی ہاتھ میں تھامی اور مجھے دیکھ کر بولا" واٹسن! دیکھو، یہ ریوالور کی گولی ہے۔ یہی تو ان کم بختوں کی چالاکی ہے کہ کسی کو یقین نہیں آسکتا، یہ گولی ایئر گن سے فائر ہوئی۔ آؤ ذرا بیٹھ کر اس سارے کیس پہ گفتگو کرتے ہیں۔ کیا تم نے کرنل موران کا نام سنا ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا، تو ہومز آپ بیتیوں کی تازہ کتاب اپنی الماری سے نکال لایا اور مجھے تھما دی۔ میں پڑھنے لگا۔ موران، سباستین، کرنل۔ پیدائش لندن۔ 1840ء میں پیدا ہوا۔ آج کل بے روزگار ہے۔ شاہی فوج میں ملازم رہا۔ ہندوستان اور افغانستان میں خدمات انجام دیں۔ ماہر شکاری ہے۔"

اس پیراگراف کے نیچے ہومز نے پنسل سے لکھ رکھا تھا "لندن کا خطرناک ترین آدمی۔"

میں نے ہومز کو کتاب دیتے ہوئے کہا" بڑی عجیب بات ہے۔ اس کا کیرئیر معزز فوجیوں والا ہے۔"

میرا دوست بولا" تم نے درست کہا۔ کرنل نے فوج میں کئی مواقع پر دلیری دکھائی۔ لیکن واٹسن، بعض درخت مخصوص بلندی پر پہنچ کر ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ کچھ انسانوں کے ساتھ بھی پیش آتا ہے۔

"جب کرنل موران فوج سے سبکدوش ہو کر لندن پہنچا، تو کچھ ہی عرصے میں اس کی جمع پونجی ختم ہو گئی۔ وہ نوکری کی تلاش میں تھا کہ پروفیسر موریارٹی کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سابق فوجی ماہر نشانے باز ہے۔ چنانچہ پروفیسر نے اسے منہ مانگی رقم دی اور کرنل سے بحیثیت ٹارگٹ کلر کام لینے لگا۔

"جب عام مجرم کسی مطلوب شخص کو ٹھکانے نہ لگا پاتے، تو پروفیسر اس سے کام لیتا۔ مثلاً 1887ء میں لاؤڈر کی بیگم سٹیورٹ اسی کی گولی کا نشانہ بنی تھی۔ پولیس اب تک قاتل دریافت نہیں کر سکی۔ مجھے امید ہے کہ یہ قتل کرنل ہی نے کیا تھا۔"

"کرنل سات پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ اسی لیے موریارٹی گینگ ٹوٹ گیا، تب بھی وہ پکڑا نہ جا سکا۔ پولیس یا میرے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت ہی نہ تھا۔ تاہم مجھے خدشہ تھا کہ کرنل مجھ پہ حملہ کرے گا۔ اسی لیے تم نے دیکھا ہو گا کہ میں رات ہوتے ہی اس کمرے کی کھڑکیاں بند کر دیتا تھا۔ مجھے اس ایئر گن کا علم تھا اور یہ بھی کہ وہ اب بہترین نشانے باز کے

قبضے میں ہے۔

"لندن سے باہر رہ کر میں بغور اخبارات کا مطالعہ کرتا رہا۔ مدعا یہی جاننا تھا کہ کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ جنم لے جو مجھے کرنل تک پہنچا دے۔ جب تک وہ زندہ تھا، میری زندگی کا چراغ ہر دم لندن میں گل ہونے کا خدشہ رہتا۔ ظاہر ہے، میں اسے گولی نہیں مار سکتا تھا، ورنہ خود جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاتا۔ قانون سے مدد لینے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا، کیونکہ اسے ٹھوس ثبوت درکار ہوتے۔ اسی لیے میں موقع کی تلاش میں چھپا بیٹھا رہا۔

"آخر رونالڈ ایڈیر کے قتل کی خبر آ گئی۔ یوں عمل کرنے کا سنہرا موقع آ پہنچا۔ قتل کی تفصیلات پڑھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کرنل کی کارستانی ہے۔ اس نے نوجوان کے ساتھ کلب میں کارڈ کھیلے، پھر اس کا پیچھا کیا اور کھلی کھڑکی کے راستے اسے گولی کا نشانہ بنا ڈالا۔

"میں فوراً لندن آ پہنچا۔ پھر جیسے ہی مقامی مجرم کو اپنے فلیٹ کے قریب منڈلاتے دیکھا، تو چھٹی حس بیدار ہوئی۔ گویا کرنل موران کو اب معلوم تھا کہ میں لندن واپس آ چکا۔ وہ یہی فوراً جان گیا کہ میں اس کی خونی واردات کی بو سونگھ کر لندن آیا ہوں۔ چنانچہ اس نے فی الفور مجھے اپنی راہ سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔

"کرنل کو اپنے نشانے، ہتھیار اور مہارت پر بہت اعتماد تھا۔ مگر میں نے بھی شاطرانہ چال چلی اور کھڑکی کے سامنے اپنی ڈمی سجا دی۔ ادھر پولیس میں اپنے دوستوں کو بھی مطلع کر دیا کہ وہ ہوشیار رہیں۔ تاہم میرے وہم و گمان میں نہ تھا کہ کرنل وار کرنے کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کرے گا جو میں نے مشاہدے کے لیے چنی تھی۔ واٹسن! اب بتاؤ، تمھارے ذہن میں کوئی سوال ہے؟"

میں بولا "ہاں، تم نے یہ نہیں بتایا کہ کرنل موران نے رونالڈ ایڈیر کو قتل کیوں کیا؟"

"ارے واٹسن، دماغ پر تھوڑا زور دینے سے یہ وجہ بھی سامنے آ جاتی ہے۔ ایک ہفتہ قبل رونالڈ اس کے مخالف کھیلتے ہوئے 400 پاؤنڈ ہار چکا تھا۔ اتنی بڑی رقم ہارنے کے بعد وہ چپ نہیں بیٹھا اور اسے کسی طرح علم ہو گیا کہ کرنل کھیلتے ہوئے چال بازی کرتا ہے۔"

چنانچہ اس دن رونالڈ نے کرنل کو دھمکی دی کہ وہ اس کی رقم واپس کر دے، ورنہ وہ شکایت کر کے اسے بالڈون کلب سے نکلوا دے گا۔ اپنے مربی پروفیسر کی موت کے بعد کرنل کلب میں ایسی ہی چال بازیوں سے جوا کھیل کر کما رہا تھا۔ اگر اس کی جعل سازی افشا ہوتی، تو روزگار کا یہ ذریعہ بھی چھن جاتا۔ لہٰذا جب رونالڈ اپنی بازیوں کا حساب کتاب کرنے میں محو تھا، کرنل نے اسے قتل کر ڈالا۔ تب رونالڈ نے کمرے کا دروازہ خود بند کیا تھا، تاکہ گھر کی خواتین کام میں مخل نہ ہوں۔"

یہ معقول بات تھی، بڑا وزن تھا۔ لہٰذا میں نے کہا "تم نے درست کہا، ایسا ہی ہوا ہوگا۔"

"سچائی مقدمے میں خود بخود سامنے آ جائے گی۔"

بہرحال مجھے خوشی ہے کہ کرنل موران کا کانٹا دور ہوا اور وہاں بیکر کی مشہور اسٹریٹ کا مکان پھر شرلاک کی زینت بنے گا۔ اب شرلاک ہومز پھر آزاد ہے۔ وہ جرائم کی مختلف اور دلچسپ مسائل حل کرتے جو لندن کی روزمرہ زندگی میں خوب جنم لیتے ہیں۔ ◆◆◆

معرکہ شیشہ لدّی

جب پاک فوج کے مٹھی بھر جوانوں نے طاقتور دشمن کو چھٹی کا دودھ یاد دلایا

چھ دسمبر 1971ء کی یخ بستہ رات تھی۔ جنگ چھڑتے ہی بھارتی توپوں کی گھن گرج سے وادیٔ لیپہ (آزاد کشمیر) کے در و دیوار لرز رہے تھے۔ 5 دسمبر کی صبح سے بھارتی توپ خانے نے شدید گولہ باری شروع کر دی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انھوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ تمام گولہ بارود اسی روز ختم کر دے۔ شام کے فوراً بعد تاریکی چھاتے ہی دشمن نے گولہ باری میں اچانک زبردست اضافہ کر دیا۔ گولوں کی دھمک اور پہاڑوں میں ان کی گونج سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر طرف قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔

تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے روشنی پیدا کرنے والے گولے بھی فضا میں چھٹ رہے تھے۔ ان کی روشنی نے چاند کی کمی کا حق پورا کر دی۔ اندھیرے اور دھوئیں کی دبیز تہ اور بھرپور شیلنگ کی آڑ میں بھارتی فوج وادیٔ لیپہ کی آزادی کے راستے میں سدِ راہ آخری پاکستانی چوکی "شیشہ لدی" کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہاں پاک فوج کی یونٹ 2-FFR پچاس فوجیوں کے لگ بھگ کی نفری کے ساتھ میجر عزیز کی قیادت میں ثابت قدمی سے ڈٹی ہوئی تھی۔

نصف شب قریباً ایک بجے فائرنگ یکلخت بند ہوگئی اور فضا میں گمبھیر اور خوفناک سناٹا چھا گیا۔ پاک فوج کے نڈر اور باہمت جانباز بھارتی فوج کی نقل و حرکت سے بخوبی باخبر تھے لیکن انھوں نے اعلیٰ دفاعی و حربی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے اس وقت تک ایک گولی بھی نہ چلائی جب تک کہ دشمن ان کی مار میں نہ آ گیا۔ عجیب سکوت تھا پھیلتا ہی رہا

اور پھر اچانک دونوں اطراف سے آتشیں اسلحے کے دہانے ایک مرتبہ پھر کھل گئے۔

بارودی سرنگوں کے نزدیک پہنچ کر فتح کے نشے میں چور ایک بھارتی افسر نے لاؤڈ اسپیکر پر نعرہ لگا کر پاک فوج کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بلند آواز میں کہا تمھاری چوکی چاروں طرف سے ہمارے جوانوں کے محاصرے میں آ چکی۔ میں تمھارے لیے تین راستے تجویز کرتا ہوں۔ اوّل یہ کہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو (یعنی ہینڈز اپ ہو جاؤ) اس صورت میں ہم تمھیں بحفاظت نکل جانے کا محفوظ راستہ دیں گے لیکن تم صرف جسم پر موجود کپڑوں میں جاؤ گے۔ دوم یہ کہ ہتھیار ڈال کر قیدی بن جاؤ۔ اس صورت میں تمھارے ساتھ جنیوا کنونشن کے تحت سلوک کیا جائے گا۔ تیسری اور آخری صورت یہ ہے کہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

جواب میں پاک فوج کے جانباز میجر عزیز نے نعرہ تکبیر لگایا اور ساتھ ہی پاکستانی گنوں نے دشمنوں کو بھوننا شروع کر دیا۔ شاہینوں نے ایسا زوردار حملہ کیا کہ بھارتی فوجیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ شیشہ لدی چوکی کے عین سامنے چیڑ کے درخت پر نصب لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے کوئی بھارتی افسر چیخ چیخ کر اپنے سپاہیوں کو گالیاں دے رہا تھا جو ہتھیار پھینک کر بھاگ رہے تھے۔ تقریباً تین گھنٹے گھمسان کی جنگ کے بعد دشمن سیکڑوں لاشیں چھوڑ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

بھارتی حملہ اتنا بھرپور تھا کہ جب فائرنگ بند ہوئی اور سکوت چھا گیا تو اہلِ لیپہ یہی سمجھے کہ "شیشہ لدی" چوکی پر خدانخواستہ بھارتی قبضہ ہو چکا۔ جنگ میں مصروف پاک فوج اور وادی کی شہری آبادی کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ چناں چہ پوری وادی میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ عالمِ بدحواسی میں شکست خوردہ چھ بھارتی فوجیوں کی ایک ٹکڑی شیشہ لدی کے دامن میں واقع گاؤں "نائی پورہ" کے ایک چھوٹے سے غار میں چھپ گئی۔ چونکہ وہ سب مسلح تھے اور دیہاتیوں کے خیال میں پاکستانی چوکی شیشہ لدی بھارتی قبضے میں جا چکی تھی لہٰذا ان کی آمد سے نہتے لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ تمام گھروں کے دروازے مضبوطی سے بند کر دیے گئے۔

گاؤں کا سب سے مضبوط اور بڑا مکان ترک عثمانی خاندان کے چشم و چراغ لعل خان کی ملکیت تھا۔ وہ 1965ء کی جنگ کے زمانے میں مجاہد فورس میں کمپنی کمانڈر اور کوارٹر ماسٹر رہ چکے تھے۔ اُن کے پاس ایک بارہ بور کی بندوق اور چند کارتوس تھے۔ اس باعث تقریباً پندرہ مرد اور تیس خواتین اور بچوں نے ان کے گھر پناہ لے رکھی تھی۔

جیسے ہی بھارتی فوجی فرار ہو کر اس طرف آئے تو محمد یعقوب نامی شخص کی نظر ان پر پڑ گئی۔ اس نے فوری طور پر لعل خان کو اطلاع دی کہ دشمن گاؤں میں آ چکا لہٰذا اپنی حفاظت کا بندوبست کریں۔ مشورے سے فیصلہ ہوا کہ دس مرد اور چار بیک وقت کہیں جانے کے بجائے اسی مکان میں رہا جائے۔ اگر بھارتی فوج نے حملہ کیا تو خواتین والے کمروں کو فوری طور پر آگ لگا دی جائے تاکہ عفت مآب مسلم خواتین کی عصمت و عزت محفوظ رہے۔ اس غرض کے لیے گھر میں پہلے سے موجود خشک گھاس اور لکڑیوں کو مستورات والے کمروں کے پاس خاموشی سے اکٹھا کر دیا گیا تاکہ خواتین میں گھبراہٹ نہ پھیلے۔

گھر میں موجود اکلوتی بارہ بور کی بندوق اور دس کارتوس لعل خان کے حوالے کر دیے گئے تاکہ وہ چوبی دروازے میں موجود قریباً ایک انچ چوڑے سوراخ کے ذریعے بھارتی فوج کی متوقع آمد روکنے کی کوشش کریں۔ لعل خان نے بندوق ہاتھ میں لے کر مکان کے گرد چکر لگایا تاکہ وہ باہر کے حالات سے باخبر رہیں۔

جیسے ہی وہ باہر نکلے ان کی نظر دور سے آتے دو فوجیوں پر پڑی۔ انھوں نے فوراً اندر آ کر دروازہ بند کیا اور چوبی دروازے کے سوراخ سے بندوق کی نال نکال چوکس ہو گئے۔ اسی اثنا میں دو فوجی قریب آئے تو منکشف ہوا کہ دونوں پاک فوج کی وردی میں ملبوس ہیں۔ انھوں نے مذکورہ مکان کے قریب واقع مکانات کے بند دروازوں پر دستک دینا شروع کی مگر وہاں کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔

آخر انھوں نے لعل خان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو سب سامنے ان کی انگشت شہادت کو دباتی بارہ بور کی بندوق کے ٹریگر پر جم گیا۔ مکان میں پناہ گزین بقیہ افراد بھی مرنے مارنے پر تل گئے۔ چونکہ شیشہ لدی چوکی ہاتھ سے نکل جانے کا خوف اور خدشہ دلوں میں جاگزیں ہو چکا تھا اور بھارتی فوجیوں کو گاؤں میں داخل ہوتے دیکھ لیا گیا تھا، لہٰذا سب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ بھارتی فوجی ہیں جو شہریوں کو دھوکا دینے کی غرض سے پاک فوج کے شہید ہونے والے جوانوں کی وردیاں پہنے چلے آئے۔

شک رفع کرنے کی غرض سے ان سے باآواز بلند اپنی شناخت کروانے کو کہا گیا۔ اس پر اسی گاؤں سے مجاہد فورس میں بھرتی ہونے والے ایک جوان، سید محبوب شاہ نے لعل خان کا نام پکارا لیکن پھر بھی مکان میں موجود لوگوں کو تسلی نہ ہوئی۔ وہ یہی سمجھے کہ بھارتی فوجیوں نے بذریعہ جبر و تشدد گاؤں کے کسی شخص سے اس مکان کی بابت معلومات حاصل کر لی ہیں۔ دوبارہ مطالبے پر انھوں نے اپنا نام، ولدیت، دادا کا نام اور معروف لقب وغیرہ بتائے بلکہ انھوں نے لعل خان کا پورا شجرہ نسب بھی بتا دیا۔ لیکن پھر بھی یہ شک رہا کہ اس کے ساتھ حوالدار کی وردی پہنے کوئی بھارتی فوجی موجود ہے جس نے گن پوائنٹ پر ہمارے گاؤں کے جوان محبوب شاہ کو یرغمال بنایا ہوا ہے اور ہمیں نقصان پہنچانے کے در پے ہے۔

اسی دوران محبوب شاہ سمجھ گئے کہ گاؤں والے انھیں دشمن سمجھ رہے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنے ساتھ آئے غازی پورہ کے حوالدار کا پورا تعارف کرایا۔ حوالدار نے خود بلند آواز میں کلمہ طیبہ پڑھا جس پر مکان کا

غزل

رنگ برسات نے بھرے کچھ تو
زخم دل کے ہوئے ہرے کچھ تو
فرصت بے خودی غنیمت ہے
گردشیں ہو گئیں پرے کچھ تو
کتنے شوریدہ سر تھے پروانے
شام ہوتے ہی جل مرے کچھ تو
ایسا مشکل نہیں ترا ملنا
دل مگر جستجو کرے کچھ تو
آؤ ناصر کوئی غزل چھیڑیں
جی بہل جائے گا ارے کچھ اور

(ناصر کاظمی)

دروازہ کھول دیا گیا اور باہر نکل کر سب سے پہلے شیشہ لدی چوکی کی کیفیت دریافت کی گئی۔ جب انھیں بھارتی فوج کی پسپائی اور بھاری جانی نقصان کا علم ہوا تو لوگ خوشی سے نعرے لگانے لگے۔

دروازہ کھلتے ہی پاک فوج کے جوانوں نے چائے طلب کی لیکن یہاں سب کو اپنی جانوں کی پڑی تھی، چائے کہاں سے آتی؟ لیکن ان سے کہا گیا کہ اگر وہ کچھ دیر ٹھہر جائیں تو چائے کا بندوبست ہو جائے گا۔ لیکن آفرین ہے ان شاہبازوں پر کہ شدید سردی اور تمام رات کی گھمسان کی جنگ کی وجہ سے تھکے ہونے کے باوجود انھوں نے مادرِ وطن کے دفاع سے ایک لمحہ بھی غافل ہونا گوارا نہ کیا۔

شیشہ لدی چوکی پر دشمن کی شکست کا سن کر عوام میں بھی نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ سب لوگ مجیب شاہ اور حوالدار کے ساتھ ان بھارتی فوجیوں کی تلاش میں جانے کی ضد کرنے لگے۔ اسی اثنا میں پاک فوج کے ایک افسر کا پیغام آیا کہ شہری آبادی بھارتی فوجیوں سے مڈبھیڑ سے احتراز کرے کیونکہ وہ مسلح ہیں اور غاروں، جھاڑیوں اور جنگل میں کسی بھی جگہ موجود ہو سکتے ہیں۔ پاک فوج ان کی سرکوبی اور تلاش کی کارروائی شروع کر چکی۔ لہٰذا جب تک یہ کارروائی مکمل نہیں ہو جاتی شہری آبادی غاروں، پہاڑوں اور جنگل میں جانے سے گریز کرے۔

اس کے باوجود لوگوں کا جوش و جذبہ سرد نہ ہوا۔ مجبوراً پوسٹ کمانڈ افسر نے چند مقامی شہریوں کو بھی تلاش کے کام میں شامل کر لیا۔ کچھ ہی دیر میں شیشہ لدی کی چوٹی ڈھلوان سے تین بھارتی سپاہی ایک سکھ افسر سمیت گرفتار کر لیے گئے۔ ان کی گرفتاری کا سن کر لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ اپنی جان کی پروا کیے بغیر جوق در جوق اپنے جوانوں کی خیریت دریافت کرنے اور ان کے لیے ضروریاتِ زندگی کی اشیا لیے دیوانہ وار شیشہ لدی چوکی پر پہنچنا شروع ہو گئے۔ خواتین نے پانی کی گاگریں سروں پر اٹھائی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہ رہے تھے۔

اچانک ایک بھارتی فوجی نے جو شیشہ لدی چوکی کے عین سامنے بلندی پر چیڑ کے گھنے درختوں میں چھپا ہوا تھا موقع پا کر فائرنگ کر دی۔ اس کے نتیجے میں FFR-2 کے کمپنی کمانڈر میجر عزیز موقع پر شہید ہو گئے جو مورچوں کی دیکھ بھال اور جوانوں کی حوصلہ افزائی میں مصروف تھے۔ یوں وہ مادرِ وطن کے دفاع میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے سرخرو ہوئے۔

اس طرح پاک فوج کی یونٹ FFR/2 نے اسلاف کی شاندار روایات زندہ رکھتے ہوئے مختصر تعداد میں ہونے کے باوجود نہ صرف بھارتی فوج کی بھاری تعداد کا جواں مردی سے مقابلہ کیا بلکہ تقریباً دو سو سے زائد بھارتی حملہ آوروں کو ہلاک بھی کیا۔ جس مورچے میں میجر عزیز نے شہادت پائی وہ آج بھی "عزیز رج" کے نام سے معروف ہے۔

اس معرکے کے بعد آج تک وادی لیپہ پر دشمن کو کبھی حملہ کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔ یہ خوبصورت وادی جس کے بارے میں مقامی لوگ آج بھی کہتے ہیں کہ اس کے ناقابلِ رسائی علاقوں میں "چشمۂ حیات" موجود ہے، ہمیشہ کے لیے دشمن کی دست برد سے محفوظ ہو گئی۔

صوفیانہ داستان

رنجیت سنگھ کا دور حکومت مسلمانوں

مہاراجا کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔

اس نے پنجاب بھر میں ہر طرف ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا تھا۔ مورخین نے اس عہد جفا کو "سکھا شاہی" سے موسوم کیا ہے۔ اس دور میں کوئی تاریخی مسجد یا مزار سکھا شاہی کے کارندوں سے محفوظ نہ رہا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے تاریخی مقامات سے قیمتی اور نادر پتھر اور سنگ مرمر کی سلیں بے دریغ اتار کر لے جاتے اور اپنے مذہبی مقامات پر جہاں چاہتے لگا لیتے۔ مسلم اکثریت کے کتنے ہی شہروں کو ان ظالموں نے لوٹ کر ویران کر دیا۔ آخر جب فقیر سید عزیز الدین پنجاب کے وزیر مقرر ہوئے تو مسلمانوں کو ایک گونہ سکون میسر آیا۔ فقیر سید عزیز الدین بڑے دانا اور اللہ والے بزرگ تھے۔ اعلیٰ پائے کے حکیم بھی تھے۔ ہر روز شاہی دربار سے فارغ ہوتے تو لاہور میں بھاٹی دروازے کے اندر اپنی حویلی "فقیر خانہ" میں کھلی کچہری لگاتے۔ عصر سے مغرب تک یہ "فقیر خانہ" ہر کسی کے لیے کھلا ہوتا۔ مظلوم وہاں سے انصاف پاتے، بیماروں کو مفت دوائی اور سلوک و تصوف کا ذوق و شوق رکھنے والے راہ ہدایت حاصل کرتے۔

ایک روز حسب معمول فقیر صاحب مغرب کی نماز

عشق الٰہی میں سرشار ایک نوجوان کی فرحت بخش کتھا جسے خیرہ کن جلوے بھی اُسے راہ سے نہ بھٹکا سکے

حبیب اشرف صبوحی

پڑھنے اُٹھے تو دیکھا کہ ایک کونے میں ایک نوجوان بیٹھا ہے۔ وہ کئی روز سے ان کی کچہری میں آرہا تھا لیکن اس نے کبھی اپنے آنے کا مقصد بیان نہیں کیا تھا۔ آج جب فقیر صاحب کی نوجوان پر نظر پڑی تو خود اس کے پاس گئے اور پوچھا:

"بیٹا! کیا بات ہے؟ میں کئی روز سے تمھیں دیکھ رہا ہوں، لیکن تم نے مجھ سے اپنا مقصد بیان نہیں کیا۔"

نوجوان نے کہا: "یا حضرت! میں کشمیر سے ایک ضروری کام کے سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں لیکن کئی روز ہوگئے مجھے موقع نہیں ملا کہ آپ سے اپنا مقصد بیان کر سکوں۔ اب آپ نے کمال مہربانی سے پوچھا ہے تو عرض کرتا ہوں۔"

"ہاں، ہاں! بیان کرو۔" فقیر صاحب نے کہا: "میں تمھاری مدد کے لیے حاضر ہوں۔"

نوجوان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بولا: "حضرت! آپ اللہ والے ہیں اور میں اسی غرض سے آپ کے پاس آیا ہوں کہ مجھے بھی اللہ سے ملا دیں۔"

نوجوان کی یہ بات سن کر فقیر صاحب پر بھی رقت طاری ہوگئی۔ آخر بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر بولے: "بیٹا! یہ راستہ کٹھن ہے۔ تم نوجوان اور خوبصورت ہو۔ تمھارے حلیے سے معلوم ہوتا ہے کہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہو، تم اس راستے پر کیونکر چلو گے؟ یہ راستہ تو اولیا و اصفیا کا راستہ ہے۔"

"آپ کی توجہ میرے شاملِ حال رہی تو میں یقیناً اس راہ میں کامیاب ہو جاؤں گا۔" نوجوان نے روتے ہوئے کہا: "حضرت! اللہ کے لیے میری راہنمائی فرمائیے۔"

فقیر صاحب نے کہا: "کیا تم بارہ سال تک بہتے ہوئے دریا کے اندر اس طرح کھڑے رہ سکتے ہو کہ تمھارا دامن بھی تر نہ ہو؟"

نوجوان نے یہ بات سنی تو اٹھ کر باہر جانے لگا۔

"کہاں چلے؟" فقیر صاحب نے پوچھا۔

"بارہ سال دریا کے اندر کھڑا ہونے کے لیے۔"

"نہیں! میرا یہ مطلب نہیں۔" فقیر صاحب نے کہا "میں جو کام تمھارے سپرد کرنے لگا ہوں وہ بارہ سال دریا میں کھڑا رہنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔"

"حضرت! آپ ارشاد تو فرمائیں، میں ہر صورت اپنے اللہ کو پانا چاہتا ہوں۔"

فقیر صاحب نے کشمیری نوجوان کا یہ جذبہ صادق دیکھا تو فرمایا: "اس شہر میں رجنی نامی ایک مطربہ رہتی ہے۔ شہر کے تمام امرا اور روسا اس پر دل و جان سے مرتے ہیں۔ تم اس کے پاس جاؤ اور بارہ سال اس کی ملازمت میں رہو۔ یہ عرصہ اگر تم نے پاک بازی میں گزار لیا تو میں تمھیں اللہ سے ملا دوں گا۔"

نوجوان بولا: "میں اپنے اللہ کو پانے کے لیے یہ کام ضرور کروں گا۔ آپ میرے لیے دعائے خیر کیجیے اور مجھے اپنی توجہ میں رکھیے۔ اچھا اجازت دیجیے، میں اب روانہ ہوتا ہوں، اللہ حافظ!"

نوجوان کمرے سے باہر نکلا، تو فقیر صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے۔ "یا اللہ! یہ نوجوان تیرے راستے کا سچا مسافر معلوم ہوتا ہے، اس کی مدد فرمانا۔ میں اسے تیرے سپرد کرتا ہوں۔"

حویلی سے باہر آکر نوجوان نے ایک دکاندار سے رجنی کا پتا دریافت کیا۔ دکاندار نے پہلے تو نوجوان کو سر

سے پاؤں تک دیکھا پھر کہا: "اسی بازار میں سیدھے چلے جاؤ۔ پھر دائیں ہاتھ مڑ جانا۔"

وہ اس بازار میں سب سے بڑی حویلی کے سامنے رک گیا۔ رات کا سایہ گہرا ہوا تو اس نے دیکھا کہ حویلی کے باہر بڑی خوبصورت اور سجی سجائی بگھیاں آ رہی ہیں۔ زرق برق لباس پہنے امیر لوگ بگھیوں سے اتر کر حویلی میں جا رہے ہیں۔ کشمیری نوجوان کچھ دیر تو یہ سب دیکھتا رہا پھر خود بھی اللہ کا نام لے کر اندر چلا گیا۔

اس نے حویلی میں یہ نظارہ دیکھا کہ امیر لوگ قیمتی لباس پہنے ہوئے ہیں اور ان کی خدمت میں پان کی گلوریاں پیش کی جا رہی ہیں۔ درمیان میں ایک خوش جمال مطربہ ستار ہاتھ میں تھامے گا رہی ہے۔ نوجوان سمجھ گیا کہ یہی رجنی ہے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

جب رات دو تہائی بیت گئی تو مہمان رخصت ہونے لگے۔ آخر رجنی بھی اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رجنی کے ملازموں نے جب اس نوجوان کو دیکھا تو پوچھا: "تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

نوجوان بولا: "مجھے رجنی سے ملنا ہے۔"

ملازم اسے رجنی کے پاس لے گیا۔ مطربہ پہلی ہی نظر میں کشمیری نوجوان کے حسن و جمال سے ازحد متاثر ہوئی۔ بلاشبہ یہ نوجوان لاکھوں میں ایک تھا۔ رجنی نے پوچھا: "تمھیں مجھ سے کیا کام ہے؟"

نوجوان نے کہا: "میں کشمیر کا رہنے والا ہوں۔ تمھارے پاس ملازمت کرنے آیا ہوں۔"

رجنی بولی: "میرے پاس تو پہلے ہی ایک درجن سے زیادہ نوکر ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟ ایک مجھے بھی ان میں شامل کر لو۔ میں تم سے کوئی تنخواہ نہیں لوں گا۔ بس تمھاری خدمت کروں گا۔" نوجوان نے کہا۔

رجنی ایک گھاگ عورت تھی، سوچا یہ خوبصورت نوجوان کوئی حسن پرست معلوم ہوتا ہے۔ آخر وہ اسے ملازمت دینے پر رضامند ہو گئی۔ بولی "ٹھیک ہے تم منشی سے مل کر اپنا کام سمجھ لو، وہ تمھیں رہائش کے لیے

شاہ شیراز
کو ایک روشن ضمیر بزرگ کی نصیحت

کسی زمانے میں شیراز پر سلجوقی خاندان کی حکومت رہی ہے۔ اس خاندان کے دوسرے بادشاہ زنگی نے وفات پائی تو اس کا بیٹا تکلہ تخت نشین ہوا وہ بڑا انصاف پسند اور رعیت پرور بادشاہ تھا۔ لوگ اس سے اس قدر خوش تھے کہ رات دن اس کو دعائیں دیتے۔ ان کی زبانیں نہ تھکتی تھیں ایک دن اس نیک دل بادشاہ نے ایک روشن ضمیر بزرگ سے کہا کہ میری عمر ضائع جا رہی ہے میں چاہتا ہوں کہ تاج و تخت پر لات مار کر کسی گوشے میں جا بیٹھوں اور باقی عمر اللہ کی یاد میں گزار دوں۔ روشن ضمیر بزرگ نے کہا۔

طریقت مخلوق کی خدمت کے سوا کوئی شے نہیں ہے۔ تسبیح مصلّے اور گدڑی کا نام طریقت نہیں ہے تو اپنی بادشاہت کے تخت پر رہ اور پاکیزہ اخلاق کے ساتھ درویش بنا رہ۔ وہ لوگ جو دولت باطن رکھتے ہیں اسی طرح قبا (اعلیٰ لباس) کے نیچے گدڑی چھپائے رکھتے ہیں۔ (تحفۂ عارف۔ طاہر شادانی)

ایک کمرا دے دے گا۔"

رتی کی دلی خواہش تھی کہ یہ نوجوان زیادہ سے زیادہ اس کے قریب رہے۔ کشمیری کے ذمہ یہ کام لگا کہ وہ ہر روز صحن کی صفائی کے بعد مہمانوں کے لیے قالین بچھائے۔ کشمیری نوجوان نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ کام سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا، وہیں نماز پڑھتا۔ جب بھوک لگتی تو خود کھانا پکاتا اور کھا لیتا۔

رتی کے ہاتھ سے وہ تنخواہ نہیں لیتا تھا۔ اپنے گزارے کے لیے دن میں کسی وقت تھوڑی سی مزدوری کر لیتا۔ ایک روز رتی نے اسے کھانا پکاتے دیکھا، تو وہ غش کھا کر گر پڑی۔ دشتی نے بتایا کہ وہ ہمارے ہاں کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتا۔ رتی نے فوراً اس نوجوان کو بلایا اور وجہ پوچھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ہمیشہ پرہیزی کھانا کھاتا ہے۔ دوسرے کے ہاتھ کا پکا کھانے سے اسے تے ہو جاتی ہے۔

رتی اس کے حسن و جمال سے پہلی ہی ملاقات میں گھائل ہو گئی تھی، بولی: "آج رات تمھارے سپرد یہ ڈیوٹی ہے کہ سونے سے پہلے میرا بدن دبایا کرو گے۔ صحن کی صفائی اور قالین بچھانے کا کام کوئی دوسرا ملازم کرے گا۔"

نوجوان نے حضرت کے حکم پر سر تسلیم خم کر لیا۔ اب رات کو دیر تک وہ اس سے اپنا بدن دبواتی۔ رتی کا خیال تھا کہ نوجوان جلد ہی اس کی طرف مائل ہو جائے گا۔ وہ لاکھ عشوے بہانے کرتی لیکن اس کی یہ آرزو کسی طرح پوری نہ ہوتی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر تھک گئی کہ یہ نوجوان آخر کس مٹی کا بنا ہوا ہے؟ یہ انسان ہے یا فرشتہ!

رفتہ رفتہ پورے بارہ سال گزر گئے۔ نوجوان نے اللہ سے ملنے کے شوق میں یہ سارا عرصہ ایک ایک دن گن گن کر گزارا۔ ایک روز شام سے قبل وہ اپنی مالکن کے پاس گیا اور کہا کہ وہ آج ملازمت چھوڑ کر جا رہا ہے۔ رتی حیران اور ششدر رہ گئی۔ وہ تو اس خیال میں تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور اسے پھسلانے میں کامیاب ہو جائے گی، خواہ اس کام میں اس کی ساری عمر گزر جائے لیکن آج تو شکار اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔

رتی نے نوجوان کی بہت منت سماجت کی۔ واسطے دیے لیکن نوجوان نے کہا: "میں نے اپنے مرشد کے کہنے پر بارہ سال تمھاری ملازمت کی تھی۔ اب یہ مدت مکمل ہو چکی۔ مجھے اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مالکن کو سلام کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اب اس کے قدم تیزی سے فقیر خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

جونہی وہ فقیر صاحب کی حویلی میں داخل ہوا انھیں کشف کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ راہِ خدا کا مسافر سخت ترین امتحان میں کامیاب ہو کر آ چکا ہے۔ فقیر صاحب اس کا استقبال کرنے کھڑے ہو گئے۔ نوجوان کو دیکھتے ہی انھوں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے سینے سے لگا لیا۔ نوجوان کا مرشد کے سینے سے لگنا تھا کہ اس کی قسمت سنور گئی۔ وہ امتحان میں کامیاب ہوا تھا، اس کا سینہ بھی جمالِ الٰہی کے جلوے سے منور ہو گیا تھا۔

حضرت فقیر سید عزیز الدین کے اس مرید صادق کا نام نامی حضرت رستم علی شاہ تھا جن کا مزار کشمیر میں آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔ ان پر اللہ کی ہزار رحمتیں ہوں۔

ایک غربت زدہ بچی کی پرتاثیر داستان' اس نے اپنے
لہو سے فرض شناسی اور دلیری کی نئی مثال رقم کر دی

نیلم احمد بشیر

حسب معمول ہم گھر سے نکلے۔ تب صبح کے ساڑھے سات بجے کو تھے، اسکول لگنے کا وقت ہو چلا تھا۔

موسم ابھی بھی کچھ گرم ہی تھا حالانکہ ستمبر کے آخری دن تھے۔ میں نے گاڑی چلاتے ہوئے شیشے میں سے پچھلی نشست پہ بیٹھی اپنی دونوں بچیوں پہ نظر ڈالی۔ صاف ستھری، سفید وردی پہنے وہ دونوں بڑے آرام سے اسکول آنے کے انتظار میں تھیں۔ بیٹھتے ہی انھوں نے میڈونا کی کیسٹ ڈیک میں لگا لی تھی اس لیے وہ گانوں سے محظوظ ہوتی نظر آئیں۔

حسب معمول ہم گلبرگ کی مین بلیوارڈ سے گزرنے لگے جہاں کئی مہنگے اور مشہور انگلش میڈیم اسکول واقع ہیں۔ ان اسکولوں کے سامنے صبح صبح گاڑیوں اور بچوں کا بہت ہجوم ہوتا ہے۔ صاف ستھرے، صحت مند، شاداب و فرحاں چہروں والے بچے جن کی روشن پیشانیاں ان کے خوش حال ہونے کا پتا دیتی ہیں۔

کچھ بچوں کو میری طرح ان کے والدین چھوڑنے آتے ہیں۔ کچھ کو ڈرائیور احتیاط سے گاڑی سے

اُتارتے اور ان کے بستوں سمیت گیٹ تک چھوڑتے ہیں۔ یہ پیارے پیارے بچے جب گاڑیوں سے اُتر اُتر کر اسکول جا رہے ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے پھولوں کے شگوفوں سے بھری ٹہنیوں کو جھاڑ دیا ہو، موتی سڑک پر بکھر گئے ہوں۔ سڑک سجی سجی لگنے لگتی ہے۔

بچیوں کو اسکول پہنچانے کے لیے میں نے ایک مختصر راستہ (شارٹ کٹ) دیکھا ہوا ہے۔ ویسے اسے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ سب مجھے منع کرتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ راستہ ذرا مختصر ہے اور ایک کچی بستی سے ہو کر گزرتا ہے۔ سڑک خستہ حال اور جگہ جگہ سے ٹوٹی پھوٹی اور بڑی بدنما لگتی ہے۔ ویسے اس کے چوراہے پر ایل ڈی اے نے ابھی ابھی ایک نیا خوب صورت فوارہ نصب کیا ہے جس کا خوب صورت رنگین پانی روشنیوں کے ہمراہ رقص کرتا آنکھوں کو بہت بھلا لگتا ہے۔

میری بیٹیاں کہتی ہیں "امی! اس ٹوٹی ہوئی سڑک سے نہ گزرا کریں ہمیں جھٹکے لگتے ہیں۔"

میرا بڑا بیٹا کہتا ہے "امی! گاڑی کے شاکس خراب اور ٹائر پنکچر ہو جاتے ہیں۔" میری بھابی کہتی ہے "اپنی گاڑی کا نقصان کروانا ہو تو کوئی اس سڑک پر سے گزرے۔"

میرے میاں کبھی دیکھ لیں یا انھیں پتا لگ جائے تو بس شامت ہی تو آ جاتی ہے۔ گھنٹوں لیکچر ملتا ہے، پیسے کی قدر نہ کرنے پر۔ مگر مجھے بھی جانے کیا سوجھتی ہے کہ وہ مختصر راستہ استعمال کرنے کو دل مچلتا رہتا ہے۔ دراصل وہ سڑک نہ لوں تو راستہ ڈیڑھ گنا بڑھ جاتا ہے اور مجھے بھی وقت بچانے اور گھر پہنچنے کی ہمیشہ جلدی رہتی ہے۔

صبح سویرے جب میں بچیوں کو چھوڑنے کے لیے کچی بستی کی اس ٹوٹی پھوٹی سڑک سے ہولے ہولے گاڑی چلاتے ہوئے گزر رہی ہوں تو بستی کے غریب مکینوں کے میلے کچیلے، ادھ ننگے بچے سڑک ہی پر کھیل رہے ہوتے ہیں۔ ان کے بال مٹی سے اٹے ہوتے ہیں اور پاؤں بغیر جوتوں کے۔

میں ان تک پہنچنے سے پہلے گاڑی کا ہارن بجاتی ہوں تو ان کا ٹولا یوں بکھر جاتا ہے جیسے کسی نے چھڑی مار کر کھجوروں سے کالی کالی بھنبھناتی مکھیاں اُڑا دی ہوں۔ پھر وہ ننھے بچے اپنے ٹوٹے پھوٹے غلیظ گھروں کے کونوں کھدروں میں جا کر غائب ہو جاتے ہیں۔

کبھی کبھی اس بستی میں سے کچھ ایسے بچے بھی دکھائی دیتے ہیں جو نیلی سوتی وردی پہنے، تختی ہاتھ میں تھامے، پیدل سرکاری اسکولوں کو جا رہے ہوتے ہیں۔ میں اپنے بچوں کو ہمیشہ یہ بچے دکھاتے ہوئے کہتی ہوں "بچو! آپ کے ابو بھی ان بچوں کی طرح اسکول جایا کرتے تھے۔ کچھ راستہ پیدل اور کچھ بس میں طے ہوتا۔" لیکن میرے بچے پیچھے بیٹھے آرچی کامک بکس (Archie Comics books) پڑھ رہے ہوتے یا انگریزی موسیقی سننے میں مگن ہوتے ہیں۔ وہ اس بور تذکرے میں دلچسپی نہیں لیتے۔

انھی پیدل چلنے والے بچوں میں مجھے کبھی کبھی "میں" بھی نظر آنے لگتی ہوں۔ تب میں کبھی بس پر چڑھتی، کبھی پیدل چلتی۔ میری بڑی بیٹی جس کو میری عادت کا پتا ہے میرے چہرے کو پڑھ لیتی ہے اور کہتی ہے "کم آن ماما۔ کم بیک ٹو لائف، کم بیک ٹو دا ریئل ورلڈ" (ارے امی! واپس آجائیں

زندگی کی طرف لوٹ آئیے۔) میں ہنس کر اپنا دھیان بٹا لیتی ہوں۔

☆

ہجوم کی وجہ سے میں نے گاڑی کی رفتار دھیمی رکھی ہوئی تھی۔ کینال پارک سے گزرتے ہوئے جب میں ڈزنی لینڈ جونیئر اسکول کے قریب پہنچی تو گھنٹا بجنے میں دس منٹ رہتے تھے۔ مجھے پوری امید تھی کہ میں بچوں کو وقت پہ پہنچا دوں گی۔ سڑک کے ایک طرف ایک لڑکا ڈزنی لینڈ اسکول کی وردی پہنے جا رہا تھا شاید اس لڑکے کا گھر بہت ہی پاس ہو گا اسی لیے والدین نے اسے پیدل ہی بھیج دیا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اتنا قریب اسکول ہو تو بچے پیدل ہی جا سکتے ہیں۔

زمانہ خراب ہے، سو انھوں نے ان کے ساتھ ایک ملازمہ بھی بھیج دی تھی۔ کم از کم شکل صورت اور حلیے سے تو وہ ملازمہ ہی لگتی تھی۔ ویسے بھی اس نے لڑکے کا بھاری بھرکم بستہ اٹھا رکھا تھا۔

لڑکا مزے سے خالی ہاتھ جیبوں میں ڈالے اُچھلتا کودتا جا رہا تھا۔ عمر آٹھ نو سال ہو گی۔ صحت مند اور لمبا چوڑا بچہ تھا۔ ملازمہ سات آٹھ برس کی اور کمزور سی نظر آ رہی تھی۔ وہ لڑکے سے چھوٹی ہونے کے باوجود بڑی بوڑھیوں جیسے انداز میں سر پہ دوپٹا اوڑھے ننھا سا لال پراندہ بالوں میں لٹکائے، بستہ اُٹھائے، گرتی پڑتی اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔

اسے دیکھ کر مجھے پنجابی زبان کی مشہور پہیلی یاد آ گئی: نکی جنی کڑی۔ لے پراندہ ٹری، (چھوٹی سی لڑکی پراندہ لے چلی) بوجھو کون؟ اس وقت ان کا رشتہ محض ملازم اور آقا کا تھا اور ملازمہ اپنا فرض بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتی نظر آ رہی تھی۔

وہ دونوں سڑک پار کرنے کے انتظار میں ایک جگہ رک گئے اور آتی جاتی کاروں کا نظارہ کرنے لگے۔ سڑک خالی دیکھ کر وہ دونوں آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک تیز رفتار ویگن جھومتی جھامتی سواریوں کے نشے میں چور یکدم کہیں سے آ گئی۔

میرا خون خشک ہو گیا۔ دونوں بچے سڑک کے درمیان پہنچ گئے تھے۔ لڑکا خالی الذہن سا ہو کر وہیں جم گیا۔ اس سے پہلے کہ ویگن کے پہیے اس تک پہنچتے "نکی جنی کڑی" نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ لڑکے کو زور سے دھکا دے کر پرے گرا دیا۔ اس لمحے لڑکی کے چہرے پہ ایک ماں جیسا تحفظ دینے والا جذبہ تھا یا آقا کی خاطر جان پہ کھیل جانے والے نمک خوار کا... میں نہیں جان سکی۔ میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ سات آٹھ سالہ بچی نے ایک عمر رسیدہ، سمجھدار عورت کا روپ اختیار کر لیا۔ وہ شیرنی بن کر مرد کی حفاظت کر رہی تھی اور اب یکدم طاقتور بن گئی۔

مالکوں نے اسے اپنے بچے کی حفاظت کے لیے ساتھ بھیجا تھا۔ یقیناً اسے اس بات کا اچھی طرح احساس تھا۔ لیکن ننھی سی بچی کی کمر پہ لدا ہوا بستہ اتنا بوجھل تھا کہ وہ خود زمین سے اٹھ نہ سکی تھی۔

اگر میں وہیں رکتی تو مجھے دیر ہو جاتی۔ بچوں کو وقت پہ اسکول نہ پہنچا پاتی۔ گاڑی پیچھے کرتے ہوئے میں نے دیکھا "نکی جنی کڑی" کا سرخ پراندہ مزید سُرخ ہو چکا تھا۔ اس سے سُرخ لالہ کے بے شمار ننھے ننھے پھول قطرے بن کر ٹپک رہے تھے۔ سڑک نے شرمندہ ہو کر لال اوڑھنی میں منہ چھپا لیا۔

◆◆◆

موتیوں کا ہار

نیکی کا میٹھا پھل پانے والے ایک دیانت دار عالم کی ایمان افروز سچی داستان

کاشف ضیائی

آج سے سات سو سال پہلے بغداد میں ایک بڑے پائے کے عالم رہا کرتے تھے۔ ان کا نام تھا قاضی ابوبکر بغدادی۔ وہ قاضی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ محدث اور مقرر بھی تھے۔ دن کے وقت وہ عدالت میں مقدمات سنتے جبکہ رات کو قرآن و حدیث کے طلبہ کو تعلیم دیتے۔ یہ طلبہ نہایت کثیر تعداد میں تھے جن کے قیام و طعام کی ذمہ داری قاضی ابوبکر کے کندھوں پر تھی۔ وہ نہ صرف ان طلبہ کو دو وقت کا کھانا مہیا فرماتے بلکہ ان کی رہائش کا بندوبست بھی ان کے ذمے تھا۔

ایک دن ان کے شاگردوں نے ان سے پوچھا "حضرت! آپ کی آمدنی تو معمولی ہے تو پھر یہ اتنے ڈھیر سارے اخراجات کہاں سے پورے کرتے ہیں؟"

طلبہ کا سوال سن کر قاضی صاحب مسکرائے پھر کہا "یہ ایک راز ہے۔ اس راز پر سے پردہ تب تک نہیں اٹھ سکتا جب تک کہ میں تمہیں اپنے ماضی کے چند عجیب و غریب واقعات نہ سنا دوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ فی الحال تم اس راز کو راز ہی رہنے دو۔"

شاگرد سمجھ گئے کہ شاید اس وقت ان کا کچھ بتانے کا ارادہ نہیں لہٰذا وہ چپ ہو رہے۔ لیکن تھوڑے عرصے بعد شاگردوں نے ایک مرتبہ پھر عرض کی "استاد محترم! آپ نیک کاموں میں اس قدر خرچ کرتے ہیں۔ بظاہر آپ کی آمدنی کا بھی کوئی خاص ذریعہ نہیں، پھر یہ درہم و دینار آپ کے پاس کہاں سے آتے ہیں؟"

استاد نے انھیں ایک مرتبہ پھر طرح دی اور مال کی نسبت اللہ تعالیٰ کے غیبی خزانوں کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن اس بار شاگرد اس راز کو جاننے پر مصر تھے۔ شاگردوں کا اصرار دیکھتے ہوئے استاد نے بالآخر ان سے کہا "اس مال کے ساتھ میری جوانی کا ایک نہایت اہم واقعہ وابستہ ہے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے انسان کو ایسے ایسے عجائبات دکھاتا ہے کہ اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔

تو سنو! یہ آج سے تیس پینتیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں ان دنوں جوان تھا اور علم دین کے حصول

میں ہمہ وقت مشغول رہتا۔ میرے ساتھ میرے چند دوست بھی تھے۔ ہماری دن رات کی مصروفیت یہی تھی کہ قرآن و حدیث پڑھتے اور باقی وقت تکرار یا مطالعے میں صرف کرتے۔ میں ان دنوں بغداد میں مقیم تھا۔ شہر کے علمی حلقوں میں ان دنوں مکہ معظمہ کے ایک عرب عالم کا بہت شہرہ تھا جن کا نام شیخ عبداللہ عزام تھا۔ وہ علم حدیث میں یکتائے روزگار تھے اور دور دور سے طالبانِ علم آ کر ان کے درس میں شریک ہوتے۔

میں محدثین کی محفلوں میں بیٹھنے کا بڑا حریص تھا۔ چناں چہ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مکہ جا کر شیخ عبداللہ عزام کی صحبت سے فیض یاب ہونا چاہتا ہوں۔ آپ لوگوں کو اگر منظور ہو تو میرے ساتھ چلیں ورنہ آپ لوگوں کی مرضی۔ میرے تینوں ساتھی شاید کم ہمت تھے، انھوں نے میرے ساتھ اتنی دور جانے سے صاف انکار کر دیا۔

چناں چہ رختِ سفر باندھا اور تنہا ہی منزلوں پہ منزلیں مارتا ہوا مکہ معظمہ جا پہنچا۔ وہاں معلوم ہوا کہ شیخ عبداللہ عزام صاحبِ فراش ہیں اور فی الحال درسِ حدیث کا سلسلہ موقوف ہے۔

یہ سن کر اگرچہ مجھے بہت مایوسی ہوئی، تاہم یہ جان کر کچھ سکون محسوس ہوا کہ مکہ میں ان دنوں بہت سے جلیل القدر علما موجود ہیں جو مسجدِ حرم میں درس دیتے تھے۔ اگر شیخ عزام سے استفادہ نہیں ہو سکتا تو کم از کم ان بزرگوں سے علم حاصل کرنا ممکن تھا۔ چناں چہ میں واپس بغداد جانے کے بجائے وہیں ٹھہر گیا اور حرم کی علمی مجالس سے اپنی پیاس بجھانے لگا۔

ان دنوں میرے ساتھ ایک بدقسمتی یہ ہوئی کہ میرا زادِ راہ ختم ہو گیا لیکن میں نے اس کی چنداں پروا نہ کی۔ میرے پاس کچھ کھجوریں اور ستو موجود تھے، تھوڑا سا زیتون کا تیل بھی مل گیا۔ میں نے انھی چیزوں کو غنیمت جانا اور روکھی سوکھی کھا کر تحصیلِ علم میں مشغول رہنے لگا۔ چند ہی دنوں بعد میرا ذخیرۂ خوراک ختم ہو گیا اور ایک دن ایسا آیا کہ میرے پاس کھانے کو کچھ بھی نہ رہا اور فاقوں تک نوبت آن پہنچی۔

اس حالت میں یہ سوچ کر گھر سے نکلا کہ شاید باہر سے کوئی چیز کھانے کی مل جائے اور اگر کچھ بھی نہ ملا تو حرم جا کر اپنے رب سے مانگوں گا۔ میں گھر سے نکل کر گلی میں آ گیا۔ اتفاق سے مجھے سامنے ہی ایک ریشم کی تھیلی پڑی ملی۔ دوپہر کا وقت اور ہو کا عالم تھا۔ گلی بالکل سنسان تھی اور کوئی شخص بھی آس پاس نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے وہ تھیلی اٹھائی اور گھر لے آیا۔

گھر آ کر تھیلی کھولی تو اس میں سفید رنگ کے خوبصورت موتیوں والا ایک ہار نکلا۔ میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ہار کے موتی ہر زاویے سے اس طرح چمکتے تھے کہ انھیں دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوئی کہ یہ ایک بہت قیمتی ہار ہے۔ میں نے اسے تھیلی میں ڈال کر بستر کے نیچے چھپا دیا۔

ظہر سے عصر تک کا وقت اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ میں یہ سوچتا رہا کہ یہ تھیلی گلی میں کیوں پڑی تھی اور اتنا قیمتی ہار کس کا ہو سکتا ہے؟ اسی دوران عصر کی اذان بلند ہوئی اور میں نماز کی ادائی کے لیے حرم شریف چلا گیا۔ عصر کی نماز پڑھ کر آیا اور دوبارہ یہ

سوچنے لگا کہ یااللہ! خبر نہیں اس ہار کا مالک کون ہے اور میں اب اسے اس تک کیسے پہنچاؤں؟"

اسی دوران گلی میں کچھ شور بلند ہوا۔ میں نے دروازے سے باہر جھانکا تو دیکھا کہ ایک اونٹ پر کوئی بوڑھا آدمی سوار ہے۔ اونٹ کے آگے چند آدمی دف بجاتے چل رہے ہیں۔ وہ بوڑھا تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ اعلان کرتا کہ مکہ والو! میری ایک تھیلی گم ہوگئی ہے۔ اس میں ایک ہار تھا۔ وہ ہماری خاندانی میراث ہے۔ تم سب اللہ کے ہمسائے اور قابل تعریف لوگ ہو جس کو وہ تھیلی ملے براہ مہربانی مجھے واپس کردے۔ میں تھیلی واپس کرنے والے کو پانچ سو دینار انعام دوں گا۔ خدا تم پر رحم کرے مکہ والو!"

یہ کہہ کر وہ اپنے دائیں ہاتھ کو ہوا میں لہراتا جس میں ایک چھوٹے پرانے کپڑے میں دینار واضح نظر آرہے تھے۔ میں یہ اعلان سن کر حیران رہ گیا۔ دل میں سوچا کہ شاید یہی بوڑھا اس تھیلی کا حقیقی مالک ہے۔ مجھے ضرور یہ اس تک پہنچانی چاہیے۔

میں ابھی اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ اعلان کرنے والا اور اس کے ساتھی میرے گھر کے سامنے سے گزرنے لگے۔ میں لپک کر باہر نکلا اور اونٹ کی لگام تھام کر کہا "بڑے میاں! ذرا میری بات سنیے۔"

"کہو نوجوان" بوڑھے آدمی نے جھک کر کہا "کیا بات ہے؟"

"آپ ذرا نیچے اتر کر میرے گھر آئیے۔" میں نے کہا "آپ کی تھیلی میرے پاس ہے۔"

بوڑھا جلدی سے نیچے اتر آیا۔ میں نے اسے بٹھایا بستر کے نیچے سے ریشمی تھیلی نکال کر اسے دی اور پوچھا "کیا یہی وہ تھیلی ہے جس کی آپ کو تلاش ہے؟"

بوڑھے نے میرے ہاتھ سے تھیلی جھپٹی اور تیزی سے اسے کھولا۔ اس میں وہ ہار جوں کا توں موجود تھا۔ بوڑھے نے ہار نکال کر اسے چوما اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "نوجوان! یہ ہار سفر کے دوران مجھ سے کہیں کھو گیا تھا۔ میں اس کی وجہ سے سخت پریشان تھا۔ خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ تم بہت دیانت دار ہو۔ لو اپنا انعام سنبھالو۔"

یہ کہہ کر اس نے دینار میرے آگے کر دیے۔ میں نے کہا "بڑے میاں! یہ ہار مجھے گلی میں پڑا ملا تھا۔ میں اسے اندر اٹھا لایا۔ یہ میرے پاس آپ کی امانت تھا۔ میرا تو یہ فرض تھا کہ میں اسے آپ کو واپس کردوں۔ مجھے انعام کی ضرورت نہیں، میں اپنی نیکی فروخت نہیں کرتا۔" میری بات کا بوڑھے پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اس پر مصر رہا کہ میں دینار قبول کرلوں۔ اس نے بہت اصرار کیا لیکن ادھر میں بھی اپنی بات پر جما رہا۔ آخر وہ بوڑھا سلام اور دینار میرے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔

میرے پاس کچھ نہ تھا اور میں بہت بھوکا تھا لہٰذا میں نے چار و ناچار ان دیناروں سے اپنی غذا کا بندوبست کیا اور مکان کے مالک کو کرایہ بھی ادا کیا۔ اسی دوران شیخ عبداللہ عزام نے حرم شریف میں دوبارہ درس حدیث کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور روزانہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ میں کافی عرصے تک تحصیل علم میں مشغول رہا اور اس دوران مالی ضرورتوں کے لیے وہی دینار کفالت کرتے رہے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب میں نے جو کچھ سیکھنا تھا سیکھ لیا اور واپس بغداد جانے کے لیے "جدہ" کی بندرگاہ پر پہنچا۔ وہاں سے میں نے بحری سفر شروع کیا۔ کشتی کا ملاح اناڑی تھا۔ وہ ہمیں کسی غلط سمت لے گیا۔ ہم سب اتنے ڈرے سہمے بیٹھے تھے کہ کوئی کسی سے بات نہ کرتا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اندھیرا چھا گیا اور بارش ہونے لگی۔ ملاح موسم کی شدت پر لعنت کرنے لگا۔ اسی دوران کشتی ہچکولے لینے لگی اور آخرکار ٹوٹ گئی۔

اس وقت ہم جس مصیبت سے دوچار تھے اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ آسمان پر بجلی کڑک رہی تھی اور نیچے سمندر کی طوفانی لہروں کا شور اور ایسے میں خوفزدہ مسافروں کی چیخ پکار جاری تھی۔ میں اس سارے وقت میں آنکھیں بند کیے کشتی کے ایک تختے سے چمٹا رہا۔ سارا دن وہ تختہ سمندر میں تیرتا رہا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں اور باقی مسافروں کا کیا بنا؟

آخرکار خدا خدا کرکے وہ تختہ ایک جزیرے کے ساحل سے جا لگا۔ میں ساحل کی ریت پر جا لیٹا۔ جب ذرا حالت سنبھلی تو اٹھ کر آگے بڑھا اور جنگلی پھلوں سے اپنی بھوک مٹائی۔ جب حواس بحال ہوئے تو دیکھا کہ جزیرے کے وسط میں ایک مسجد ہے اور کچھ دور آبادی بھی ہے۔ میں مسجد میں چلا گیا۔ وہاں قرآن پاک کے کچھ اوراق رکھے تھے۔ میں انھیں پڑھنے لگا۔ مجھے قرآن پڑھتے دیکھ کر آبادی میں سے کچھ مرد اور عورتیں میرے پاس آئے اور کہنے لگے: "اے شیخ! کیا آپ عالم ہیں؟"

"میں ایک طالب علم ہوں۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

وہ کہنے لگے "اے شیخ ہم مسلمان ہیں لیکن قرآن پڑھنا نہیں جانتے۔ آپ مہربانی فرما کر ہمیں تلاوت سکھا دیں اور اگر ہو سکے تو کچھ لکھنے پڑھنے کی بھی مشق کروا دیں۔"

گناہ کیا ہے؟

تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی، جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔ (القرآن)

اگر کہیں گناہ ہو رہا ہو اور لوگ اسے معیوب نہ سمجھیں تو سب کو شریک گناہ سمجھا جائے گا۔ (الحدیث)

گناہ سے بچو کیونکہ گناہ اللہ کے غیظ و غضب کو بھڑکا دیتا ہے۔ (الحدیث)

ان گناہوں سے بھی بچو جنھیں ہلکا اور معمولی سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ چھوٹے گناہ آدمی کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ یہ اسے تباہ کر ڈالتے ہیں۔ (الحدیث)

اگر کوئی بات تیرے دل میں کھٹکے تو سمجھ لے کہ وہ گناہ ہے۔ (الحدیث)

گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے مگر گناہ سے بچنا واجب تر ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

بدبخت ہے وہ شخص جو خود تو مر جائے لیکن اس کا گناہ نہ مرے (یعنی وہ کوئی بری بات جاری کر جائے)۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

گناہ کا ترک کر دینا توبہ کی تکلیف سے زیادہ آسان ہے۔ (حضرت عمرؓ)

اگر تو گناہ پر آمادہ ہے تو کوئی ایسا مقام تلاش کر جہاں خدا تعالیٰ موجود نہ ہو۔ (حضرت عمرؓ)

خواہ کچھ بھی ہو گناہ انسان کو ضرور پریشانی میں ڈال دیتا ہے۔ (حضرت عثمانؓ)

(انتخاب: مشال قطب، گلومنڈی)

چناں چہ میں نے یہ پیش کش قبول کر لی اور ان کے بچوں کو قرآن و کتابت سکھانے لگا۔ اس کے بدلے مجھے صبح و شام کھانا مل جاتا۔ رفتہ رفتہ وہ لوگ مجھ سے بہت مانوس ہو گئے۔ وہ میری قدر کرتے تھے اور بڑے ادب سے "حضرت الاستاذ" کہہ کر مجھے پکارتے۔ میری زندگی کے دن یونہی گزر رہے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور کن لوگوں کے درمیان ہوں؟

ایک دن ان کے ایک بزرگ میرے پاس آئے اور بولے "یا شیخ! یہاں ایک یتیم بچی ہے، خاصی مالدار ہے اور سلیقہ شعار بھی ہے۔ آپ شریف النفس ہیں اور تنہا بھی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس بچی سے نکاح کر لیں اس طرح آپ کی گزر بسر آسانی سے ہو سکے گی۔"

میں نے انکار کر دیا۔ لیکن وہ لوگ مسلسل اصرار کرتے رہے اور مجھے اتنا مجبور کیا کہ آخر کار میں نے ان کی بات مان لی۔ چناں چہ میرے نکاح کے انتظامات ہونے۔ نکاح کی رات جب میں نے اپنی دلھن کو دیکھا تو اس کے گلے میں وہی ہار تھا جو میں نے مکہ میں اس بوڑھے کو واپس کیا تھا۔

میں ہار دیکھ کر بہت حیران ہوا اور گھر سے باہر آ کر لوگوں کو سارا ماجرا سنایا۔ میری بات سن کر لوگوں نے اس زور سے نعرہ لگایا کہ ان کی آواز پورے جزیرے میں گونج گئی۔ میری حیرانی ہنوز باقی تھی بلکہ اس بات سے مجھے مزید حیرت ہوئی۔

مجھے پریشان دیکھ کر جزیرے والوں نے بتایا "وہ بڑے میاں جنھیں آپ نے مکہ میں ہار واپس کیا تھا اس بچی کے والد تھے۔ آپ سے پہلے وہی اس مسجد کے امام بھی تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے زندگی میں سچے وایمان دار لوگ کم ہی ملے۔ ان میں وہ مسلمان نوجوان بھی شامل ہے جس نے مجھے میرا خاندانی ہار واپس کیا تھا۔ یا اللہ! میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس سے دوبارہ ملا دے تاکہ اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کر دوں۔ اور اب ایسا ہو بھی گیا۔ ہم سب قدرت کے اس اتفاق پر حیران ہیں اور اسی خوشی میں ہم نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا ہے۔"

ان کی بات سن کر مجھے بھی بہت خوشی ہوئی اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ میں پھر اپنی بیوی کے ساتھ مدت تک اس جزیرے میں رہا اور بہت خوش گوار زندگی گزاری۔ بعد ازاں جب میری رفیقۂ حیات کا انتقال ہوا تو میں پھر تنہا ہو گیا۔

کچھ عرصہ تو میں اس جزیرے میں رہا پھر ان لوگوں سے اجازت لے کر بغداد واپس آ گیا۔ وہ ہار ابھی تک میرے پاس تھا۔ جزیرے والوں نے بخوشی اسے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی۔ بغداد میں وہ ہار ایک تاجر کو پسند آ گیا۔ اس نے کئی لاکھ دینار میں وہ مجھ سے خرید لیا۔ میں نے دینار اپنے پاس سنبھال رکھے ہیں۔ انہی سے میں تم لوگوں کے اخراجات پورے کرتا ہوں۔ چونکہ میں اسے نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہوں اس وجہ سے برکت ہی برکت ہے۔

یہ داستان بیان کرنے کے بعد شیخ ابوبکر بغدادی خاموش ہو گئے اور پھر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے لگے۔ شاگرد بھی یہ جان کر مطمئن ہو گئے کہ ان کے استاذ کو رب کائنات کی طرف سے دولت عطا ہوئی ہے۔

بندوق جو جانور نے چلائی

شکاری جب آدم خور گل داروں کا شکار کرنے جنگل پہنچے تو قدم قدم پر اُنھیں عجب آفتوں سے پالا پڑ گیا

عزیز احمد خلیل احمد مشہود

میں اس الگ تھلگ واقع جنگل میں سیٹھ گوپی چند کے ساتھ گل داروں کے ایک جوان جوڑے کا خاتمہ کرنے گیا تھا۔ گوپی چند ایک قصبے کے بہت بڑے تاجر سیٹھ ارمان چند کا بڑا بیٹا تھا۔ پنجاب کے اس جنگل میں گل داروں کا جوڑا آدم خور ہو گیا تھا۔ میری اطلاع کے مطابق یہ جوڑا دور سے آیا تھا اور کچھ عرصہ پُرامن رہنے کے بعد انسانوں کا شکار کرنے لگا۔

اسے ایک انگریز لڑکی نے آدم خوری پر اُکسایا۔ جولی کو پر نامی اناڑی لڑکی نے جنگل میں گھومتے گل داروں پر گولیاں چلائیں تو وہ زخمی ہو کر غائب ہو گئے۔ بعد ازاں دوران تلاش جولی کا ماتحت "اٹھے" مارا گیا۔ اٹھے یوپی کا ایک شاعر تھا۔ وہ جولی کے دفتر میں اس کا ماتحت تھا اور جولی سے پیسے لے کر شکار میں ساتھ دیتا۔ اٹھے کو چیر پھاڑ کھانے کے بعد وہ جوڑا آدم خور ہو گیا۔ پھر دو ماہ میں اس جوڑے نے مزید تین افراد مار ڈالے۔

گل دار چھوٹا شیر ہے۔ یہ نسل دنیا کے مختلف علاقوں میں موجود ہے۔ تاہم امریکا میں گل دار کو جیگوار کہتے ہیں۔ اسی درندے سے متاثر ہو کر ایک قیمتی کار کا نام بھی "جیگوار" رکھا گیا جو دنیا بھر میں مشہور ہے۔ برصغیر چونکہ بہت بڑا ہے، اسی لیے اس کے مختلف علاقوں میں گل دار کے مقامی نام ملتے ہیں۔ تاہم لفظ جیگوار کا اردو ترجمہ گل دار ہی ہے۔

سیٹھ ارمان چند قصبے کا تاجر تھا۔ اس نے قریبی گاؤں میں ایک بڑے زمیندار کے ہاں اپنا بیٹا گوپی چند بیاہ دیا۔ شادی کے بعد سیٹھ کو تجارت کی غرض سے کسی اور شہر جانا پڑا۔ وہ چند دن بعد واپس آیا تو اس کے گھر میں تین شکاری

گئے، ایک بو گیر کتا اور ایک گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ سیٹھ حیران رہ گیا۔ "پڑوسی کا کوئی مہمان آیا ہوگا۔" اس نے سوچا۔ "انھوں نے یہ ادھر باندھ دیے ہوں گے۔"

سیٹھ کو فوری طور پر پتا چلا کہ یہ گوپی صاحب خرید لائے ہیں تو وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ سیٹھ نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا "ہم کاروباری لوگ ہیں۔ ہم فائدے کے بغیر کوئی روگ بھی نہیں پالتے۔ تم یہ کیا خرید لائے......؟ آج ہی سب کچھ واپس کر آؤ۔"

گوپی چند نے کہا "لالہ جی! آپ مجھے معاف کر دیں...... میں یہ واپس نہیں کر سکتا۔"

"تو ان جانوروں کا تم کیا کرو گے؟"

"میں شکار کھیلا کروں گا۔"

"ہم پیسے سے پیسا کمانے والے لوگ ہیں۔" سیٹھ چیخ اٹھا۔ "شکار کھیلو گے تو دکان کون سنبھالے گا؟"

گوپی نے بتایا "میری بیوی تلسی مجھے نکما اور بزدل سمجھتی ہے کیونکہ اس کے بھائی، باپ اور بیٹا سب مردوں کی طرح کبڈی، کشتی اور شکار کھیلتے ہیں۔ شکار کے لیے کتے اور گھوڑے پالتے ہیں۔ میں کبڈی اور کشتی نہیں کھیل سکتا۔ میری ہڈیاں کمزور ہیں۔ اب میں تلسی کی فرمائش پر یہ جانور لایا ہوں تاکہ شکار کھیل سکوں۔"

"یہ بات ہے۔" سیٹھ نے ایک لمبا اور پُرفکر ہنکارا بھرا۔ "تم اپنے جانوروں سمیت دفع ہو جاؤ۔ شکار کھیلو اور مرد بنو۔" سیٹھ ارمان چند نے گوپی چند کو اسی وقت گھر سے نکال باہر کیا۔ بیٹا اپنے جانوروں اور تلسی سمیت کرائے کے گھر چلا گیا۔ اب وہ ظاہری طور پر تو ایک تاجر کا پتی تھا مگر اس کی اماں اسے خفیہ طور پر رقم بھیجتی رہتی۔ یوں گوپی کی زندگی مزے میں گزر رہی تھی۔

......☆......

جو محکمہ حسابات میں ملازم تھی۔ وہ اپنی روسی سہیلی نروشوا کے ساتھ شکار کھیلنے جنگل میں آئی۔ تب وہ گوپی چند کے ہاں ٹھہری جو محکمہ حسابات میں ملازم تھا۔

اگلے دن صبح صبح ہم شکار کرنے نکلے۔ یہ ایک گھنا نشیبی جنگل تھا۔ نشیب ہونے کی وجہ یہ تھی کہ کبھی دریا نے کروٹ لے لی تھی۔ پھر دریا کے خالی پیندے میں ایک طویل جنگل اُگ آیا۔ یہ جنگل اب اصل حالت میں موجود نہیں، انسانوں نے اسے کاٹا، چیرا اور بیچ ڈالا۔ یہ سب کچھ وسیع پیمانے پر ہوا لیکن اس جنگل کا کچھ حصہ ابھی باقی ہے جس کے ساتھ دریا بہتا ہے۔ شکار کا پہلا دن عبث گزرا۔ ہم دریا اور کھیتوں کے درمیان موجود اس جنگل میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ دوسرے دن بھی کچھ ہاتھ نہ آیا۔ البتہ ہمارا سامنا جنگلی سؤروں سے ہوا۔ تب ہم پانچوں خچروں اور گھوڑوں پر سوار تھے۔

سؤر بڑا سخت جان حیوان ہے۔ یہ ٹکر بڑی زبردست مارتا ہے کہ اس کے تھوتھن میں ہڈی بہت مضبوط ہوتی ہے۔ قد بھیڑ سے لے کر گدھے جتنا ہو سکتا ہے اور چِروں کے کھر بالکل بھیڑ جیسے ہوتے ہیں۔

سؤر دو طرح کے ہوتے ہیں: پالتو اور جنگلی۔ پالتو کئی ممالک میں پالے جاتے ہیں۔ جنگلی جنگل، ویرانے اور کھیتوں میں رہتے ہیں۔ فصلیں کھاتے اور سبزہ چرتے ہیں۔ یہ جب کسی جاندار پر حملہ کرتے ہیں تو اپنی ٹکر اور تھوتھنی کے دائیں بائیں نکلے نوکیلے دانتوں سے کام لیتے اور مخالف کا جسم اُدھیڑ ڈالتے ہیں۔

یہ سؤروں کا بہت بڑا گروہ تھا جس سے ہماری مڈبھیڑ ہوئی۔ ہمارے گائیڈ ہمیں خبردار کر چکے تھے کہ آگے خطرہ ہے۔ اچانک سؤروں کا گروہ ہم پر ٹوٹ پڑا تو سب سے پہلے نروشوا کے گھوڑے نے حد درجہ خوف کھایا۔ وہ زور زور

سے جھنجھوڑنے لگا...... اور زروشووا کو زمین پر گرا دیا۔ اب روسی لڑکی درندوں سے لڑنے لگی۔

اس نے ایک سؤر کے کھلے منہ میں بندوق کی نال کا دہانہ ڈال دیا۔ اسی وقت ایک اور سؤر نے زروشووا کو ٹکر مارنے کا ارادہ باندھا تو اس نے مضبوط بوٹ کا ٹھڈا اٹھاتے ہوئے اس کے منہ پر زوردار ٹھوکر مار کر پرے ہٹایا۔ پھر لڑکی نے اپنی بندوق کا گھوڑا دبا دیا۔ گولی نے سؤر کا بھیجا سر سے باہر نکال دیا۔ یہ انسان اور حیوان کی بڑی خوفناک جنگ تھی۔

میں چونکہ سؤروں کو گولیاں مارنے میں مصروف تھا، اس لیے زروشووا کی جدوجہد دیکھنے کے باوجود اس تک نہ پہنچ پایا۔ سؤر پاگلوں کی طرح بھاگتے پھر رہے تھے۔ تاہم میں اس دلیر لڑکی سے بہت متاثر ہوا کہ وہ درندوں سے خوب نمٹ رہی تھی۔ اسی دوران ہمارے ساتھیوں انور اور بھگت نے اسے گھوڑے پر بیٹھنے میں مدد دی۔

میں اس وقت ایک لنگڑے خچر پر سوار تھا جو سؤروں سے بہت ڈر رہا تھا۔ یہ ایک الگ مصیبت تھی۔ بہرحال ہم سؤر مارتے رہے...... آخر وہ پسپا ہونے لگے۔ ہم نے ان کا پیچھا کیا مگر اس تعاقب میں جولی کوپر اور زروشووا شامل نہیں تھیں۔ جولی کا خچر سؤر کی ٹکر سے اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا تھا۔ ادھر زروشووا کا گھوڑا اب بھی بدک رہا تھا۔ اس معرکے میں جولی کوپر نے کافی درندے مارے۔ جولی تین ممالک میں شکار کھیل چکی تھی۔ البتہ اسے بڑے درندوں یعنی شیر، چیتے اور آدم خور درندوں...... کے شکار کا تجربہ نہیں تھا۔

ہم نے سؤروں کا تعاقب جلد ختم کر دیا۔ ہمارے کچھ کتے بھی زخمی ہو چکے تھے۔ جولی نے مشورہ کر کے اس خچر کو ابدی نیند سلا دیا جس کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ وہ خچر ناکارہ ہو چکا تھا۔ گھوڑا، گدھا اور خچر ایسے جانور ہیں جن کی ٹانگ ٹوٹ جائے تو موت ہی ان کا مقدر بنتی ہے۔ ہم نے کتوں کی مرہم پٹی کی اور واپس آ گئے۔ جولی نے آبادی میں آتے ہی خچر کے مالک کو اس کی قیمت سے بڑھ کر رقم ادا کر دی۔

اس شام جولی پارکر کے بٹلر کا ایک ملازم اسے ایک سُرخ بندوق دے گیا۔ یہ بندوق بڑی قیمتی تھی اور جولی نے یورپ سے منگوائی تھی۔ شام کو میرے علاوہ جولی، زروشووا، گوپی چند، بھگت سنگھ اور محمد انور نے اس بندوق سے اپنا اپنا نشانہ آزمایا۔ یہ "ہرٹ" کمپنی کی بندوق تھی اور بہت نایاب......

آدم خور گل دار اگلے دن بھی ہمیں نہ مل سکے۔ اگلے روز بارش سے جھڑی ہونے کا شدید امکان پیدا ہو گیا مگر ہم شکار پر نکل کھڑے ہوئے۔ سارا دن سیاہ گھٹا چھائی رہی اور شدید گڑگڑاہٹ کے ساتھ بجلی چمکتی رہی۔ جب بھی بجلی چمکتی...... بھگت اپنا کوئی مذہبی نعرہ چیخ کر بلند کرتا اور اپنی کرپان پر ہاتھ مارتا۔ زروشووا چونکہ لامذہب تھی، وہ بھگت کی اس عقیدت کو غور سے دیکھتی۔ اس دن ہمیں کچھ خارپشت ملے۔ اس جانور کو انگریزی میں پورکیوپائن (Porcupine)، فارسی میں خارپشت اور ہندی اردو میں "سیہ" کہتے ہیں۔

سیہ کے تمام بدن پر لمبے کانٹے ہوتے ہیں۔ اس لیے اسے ڈانگ، گولی یا کلہاڑی اور برچھی سے مارا جاتا ہے۔ سیہ سبزہ خور اور فصل کی تباہی کا باعث ہے۔ اس کی جسامت چھوٹی بڑی ہو سکتی ہے۔ عموماً یہ خرگوش کی جسامت کا ہوتا ہے اور تھوتھنی بھی خرگوش جیسی ہوتی ہے۔ البتہ بعض ممالک میں یہ گیدڑ جتنے بڑے ملتے ہیں۔ جانور یا انسان اس کے پیچھے بھاگے تو یہ اچانک رُک کر اپنے کانٹے پھیلا دیتا ہے۔ یہ کتوں کو زخمی کر ڈالتا ہے۔ شیر اور چیتا بھی اس پر حملہ نہیں کر پاتے۔

زروشووا نے یہ جانور دیکھتے ہی دیوانوں کی طرح نعرہ

بلند کیا اور انھیں ہر قیمت پر حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے انور اور بھگت کو کتے اچھی طرح روکے رکھنے کا کہا اور خود گوپی اور دونوں لڑکیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ وہاں گھاس بلند تھی۔ سیہہ اس کے اندر گھس کر چھپ سکتا تھا۔

ایک سیہہ نظر آیا تو میں نے گولی چلائی جو چوک گئی۔ مگر جولی پارکر نے اسے گولی مار دی۔ باقی سیہہ گھاس میں اوجھل ہو گئے۔ اب میں نے اپنے کتے منگوا لیے ...... وہ سونگھ سونگھ کر انھیں ڈھونڈنے لگے۔ بلند گھاس کا یہ قطعہ چار فٹ زمین میں پھیلا ہوا تھا۔ ہم نے کتے قابو میں رکھے تاکہ انھیں کوئی نقصان نہ ہو۔ ہم نے ہمت کر کے پانچ سیہہ مار ڈالے۔

تب ٹروشوا نے بتایا "ہم تین بہنیں ہیں اور ہم اپنے چہرے کی جلد کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ ہمارے گاؤں میں ایک حکیم سیہہ کی چربی بوٹیوں میں ڈال کر چہرے کی شادابی کے لیے ایک دوا تیار کرتا ہے۔ میری بہنیں اس تحفے پر بہت خوش ہوں گی۔"

میں اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ شاید ٹروشوا کو کسی ضرورت کے تحت خارپشت چاہئیں..... مگر وہاں تو جلد کی زیبائش کا مسئلہ تھا۔ عورتوں کی زیبائش نہ تو کبھی ختم ہوئی ہے اور نہ قیامت تک ختم ہو گی۔

بہرحال ہم آگے چلے۔ مردہ سیہہ بھی ساتھ لے لیے۔ دونوں لڑکیوں نے ان کی چربی نکال کر محفوظ کر لی۔

اب ہم نے شکار کو واقعہ کار بدلنے کا فیصلہ کیا۔ اس جنگل کے ساتھ ایک طرف کھیت تھے تو دوسری طرف دریا۔ گل دار جنگل چھوڑ کر کسی وقت بھی دریا عبور کر سکتے تھے کہ ابھی ساون کا آغاز تھا، دریا پرجوش نہیں ہوا تھا۔ گل دار کھیتوں میں بھی چھپ سکتے تھے، وہاں کی قد آور فصلیں موجود تھیں۔ مگر ہمیں درندوں کا تازہ کھرا کہیں بھی نہیں ملا۔

اس سے اگلے دن ساون کی پہلی تیز بارش ہوئی۔ ہر سو جل تھل ہو گیا۔ سارا دن ٹھنڈی ہوا چلتی رہی۔ ہم نے وہ دن آرام اور باتیں کرتے گزارا۔ اگلے روز شکار کے لیے نکلے۔ ہمارے ساتھ ایک مقامی شکاری "آتھی" اس علاقے میں کئی سال شکار کھیل چکا تھا۔ وہ علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا اور خوب جانتا تھا کہ کس کس جگہ فصل ہے، باغ ہیں یا ویرانہ۔ گل دار وہاں چھپ سکتے ہیں یا نہیں۔ گوپی چند بھی اسی علاقے کا تھا مگر ایسی معلومات سے محروم۔ البتہ اب وہ شکاری بننے چلا تھا۔ اور وہ بھی اپنی نئی نویلی دلہن کی تمنا پر۔

اس دن ہم نے گل داروں کا تازہ کھرا پا لیا۔ تب کھرے پر کتے چھوڑے تو وہ سونگھ کر ایک طرف کو چل پڑے۔ جنگل میں ایک حصہ چھوٹے اگر کے پودوں سے اٹا اٹ تھا۔ گل دار وہیں چھپے بیٹھے تھے۔ ہماری بو پاتے ہی پوری قوت سے بھاگ اٹھے۔ ان کے پیچھے کتے لپکے اور کتوں کے پیچھے ہم نے گھوڑے دوڑا ڈالے۔ وہاں پودے اتنی کثرت سے تھے کہ ہمیں درندوں پر گولی چلانے کا موقع نہیں مل پایا۔

جولی پارکر نے اپنا گھوڑا سرپٹ بھگا دیا۔ وہ ہم سے پہلے گل دار مارنا چاہتی تھی۔ مگر افسوس کہ وہ ایک اچھی گھڑسوار نہیں تھی۔ وہ تیز رفتار گھوڑے پر قابو نہ رکھ سکی۔ ایک درخت کے جھکے ہوئے تنے سے اس کا کندھا ٹکرا گیا۔ وہ چیخی اور اس نے گھوڑے کی لگام زیادہ ہی موڑ دی۔ گھوڑا رکتے رکتے اس نے ایک بندریا مار ڈالی جو شاخ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی سرپٹ بندوق درخت سے ٹکراتے ہی گر چکی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ چند لمحوں میں دیکھا۔ میں وہاں رکا اور آتھی اور گوپی چند کو جولی کی مدد کرنے کا

کہا اور خود آگے بڑھ گیا جدھر تروشووا، بھگت اور الور کتوں کے پیچھے جا رہے تھے جو درندوں کا تعاقب کر رہے تھے۔ یہ تعاقب بہت ضروری تھا۔ درندے ایک سرنگ میں جا چھپے تھے جس کی اونچائی اور چوڑائی زیادہ نہیں تھی۔

ہمارا یہ تعاقب ثمر آور ثابت نہ ہوا۔ شکار اور زندگی میں اسی طرح ہوتا ہے۔ ہم محنت کرتے ہیں مگر حالات کبھی کبھی اچانک ہمارے مخالف بھی جاتے ہیں۔ پھر بھی محنت کرتے رہنا ہی انسان کا شیوہ ہونا چاہیے۔

ہمارے کتے اب اس سرنگ پر غراتے پھر رہے تھے۔ ہم نے انھیں اجازت نہیں دی ورنہ وہ اس کے اندر گھس جاتے جو ان کے لیے خطرناک تھا۔ ہم کتے مروا نہیں سکتے تھے۔ اندر کیا تھا.....؟ ہمیں یہ علم نہیں تھا۔ سرنگ کے کئی منہ تھے۔ ہم اس لمبی سرنگ کے دہانے پر کھڑے آپس میں مشورہ کر رہے تھے کہ اچانک عقب سے پے در پے فائر ہوئے۔

تروشووا نے گھبرا کر کہا ’’جولی! میری دوست۔‘‘

’’ہاں تم واپس جا کر اس کی مدد کرو..... تم ایک بہادر لڑکی ہو۔‘‘ میں نے روسی لڑکی سے کہا تو اس نے اپنا ٹچو پیچھے بھگا دیا۔ اسی دوران میں ایک اور فائر کی آواز آئی۔ ادھر کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔

اچانک ہمارے کتے خاص اشارے دینے لگے۔ چھان بین سے پتا چلا کہ گل دار اچانک سرنگ کی ایک دیوار ڈھا کر جھاڑیوں میں روپوش ہو چکے۔ ان جھاڑیوں میں درندے کو تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنے والی بات تھی مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔ جلد ہی ہمارے کتے دریا کی طرف لپکنے لگے۔ ہم بھی بھاگم بھاگ وہاں پہنچے تو بازی الٹ چکی تھی۔

گل دار دریا کے کنارے سے خاصے آگے پہنچ چکے تھے۔ دریا اور اس کے اگلے علاقے میں چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ جبکہ جنگل میں ایک قطرہ بھی نہیں گرا۔ پنجاب کے ساون بھادوں میں اسی طرح ہوتا ہے۔ دریا میں تب زبردست طغیانی تھی۔ میں ریڈیو پر خبر سن چکا تھا کہ پورے ملک میں بارش یلغار کر رہی تھی۔

ہمارے کتے دریا میں داخل ہونے کو بے تاب تھے مگر ہم نے انھیں روکے رکھا۔ بپھرے دریا میں ہم اگر کودتے تو کوئی بھی ناقابل تلافی نقصان ہو سکتا تھا۔ گل دار بارش اور موجوں کے تھپیڑے کھاتے چلے جا رہے تھے۔ بارش نے ہماری نظر محدود کر دی۔ موجیں بھی گل داروں کو اتھل پتھل کر رہی تھیں۔ وہ کہیں ٹھہر پاتے تو ہمارا نشانہ کارگر ثابت ہوتا۔ پھر بھی ہم نے ان پر گولیاں چلا کر اپنا فرض نبھایا۔

دو شیوان زور سے گرے اور پھر..... موجوں کو سرخی مائل بناتے انھی کا لقمہ بن گئے۔ آدم خور درندوں کا خاتمہ ہو گیا۔ گل دار مرتے ہی بہ نکلے۔ اس لیے انھیں مارنے کی خوشی ادھوری رہی۔ کھالیں مل جاتیں تو کیا کہنے۔

ہم واپس ہو لیے۔ جا کر دیکھا تو دو افراد زخمی پڑے تھے اور دو بندر بھی مردہ حالت میں ملے۔ بقیہ افراد زخمیوں کو سنبھال رہے تھے۔ تفصیل کچھ یوں ہے:

ہماری تیز رفتار آمد پر بندروں کو وقت نہ ملا ورنہ بندر ہمیشہ درخت پر چڑھنا اور گھنے پتوں میں چھپنا پسند کرتے ہیں۔ اسی باعث گھوڑا ٹہنی پر بیٹھی بندریا سے ٹکرایا اور اسے مار ڈالا۔ گھوڑا پھر وہیں کھڑا ہنہنانے لگا۔

میری ہدایت پر آئیچی اور گوپی چند نے جولی کی مدد کی تھی۔ انھوں نے اسے گھوڑے سے اتارا اور گھوڑا درخت سے باندھ دیا۔ جولی کے کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اسی دوران یہ حیرت انگیز ماجرا پیش آیا کہ ایک بندر نے جنگل میں گری جولی کی سرخ بندوق تھام لی۔ یہ ایک بڑا بندر تھا جو بندوق چلانا جانتا تھا۔ اسے بندوق چلانے کا طریقہ کیسے آیا؟ اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ شاید وہ بندوق

چلانے والے انسانوں کے ساتھ رہا ہوگا یا وہ جنگل میں شکاریوں کو بندوق چلاتے دیکھتا رہا ہوگا۔

بہرحال بندر نے اپنی بندریا کی موت کا انتقام لینے کے لیے شکاریوں پر فائرنگ کردی۔ جوابی فائرنگ پر وہ بندوق سمیت روپوش ہوگیا۔ صرف بندوق خودکار تھی۔ اس کی گولیاں خود بخود چڑھتی چلی جاتی تھیں۔ اس لیے بندر کو بندوق چلانے میں رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ گوپی چند اور آنجہی اپنی سواریوں پر اس خطرناک بندر کو کھوجنے لگے۔ اچانک ایک گولی گوپی چند کی گھوڑی کا نصف کان اڑاتی نکل گئی۔ گھوڑی نے بلبلا کر اسے نیچے گرایا تو گرتے ہوئے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ گھوڑی بھاگ نکلی۔

اس دوران میں بندر اپنی کمین گاہ بدل چکا تھا۔ آنجہی ایک وقت میں دو زخمیوں کو بندر سے نہیں بچا سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر اوٹ میں گھات لگائی۔ پھر ہم دونوں بھی پہنچ گئے۔ دونوں نے مل کر بندر کو ہلاک کردیا تو بہت تیزی سے اپنے ٹھکانے بدل رہا تھا۔ بعد ازاں گوپی چند کی گھوڑی بھی پکڑ لی گئی۔

بے تو عجب تماشا مگر جنگل میں ایسے تماشے ہوجاتے ہیں۔ ہم زخمیوں کو قصبے میں لے آئے۔ گوپی چند کی بیوی تلسی نے شوہر کو زخمی دیکھا تو شور مچا دیا۔ "آج مجھے شک تھا کہ کچھ نہ کچھ ہوکر رہے گا۔ تلسی کا پودا ہمارے صحن میں بارش کے باوجود سوکھ رہا ہے۔"

ایک ماہر معالج نے گوپی چند کی ٹانگ جوڑ دی اور مکمل شفا کے لیے چھ ماہ کا وقت دیا۔ ہم رات کو گھر کے باہر چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے کہ اندر شور مچ گیا۔ ہمارے کتے بھی بے تاب ہونے لگے۔ ہم سمجھے کہ شاید کوئی چور گھس آیا ہے۔

اندر جاکر دیکھا تو ایک بوڑھا ڈنڈا ہاتھ میں لیے گوپی چند کی پٹائی کررہا ہے۔ گوپی ہو یا مچا رہا تھا۔ پتا چلا کہ یہ سیٹھ ارمان چند تھا۔ وہ بہت غصے میں لگ رہا تھا۔

میں نے گوپی کو اس کے غضب ناک باپ سے بچایا۔ ارمان چند بار بار چیخ رہا "جب شکار کے قابل نہیں تو کیوں شکار کھیلتا ہے۔؟"

میں نے اسے سمجھایا کہ اس کا بیٹا بستر پر پڑا ہے، وہ صبر سے کام لے۔

"یہ کب ٹھیک ہوگا؟"

"چھ ماہ بعد۔"

"ٹھیک ہے مہاراج!" سیٹھ نے مجھ سے کہا "چھ ماہ بعد میں پھر اس کی ٹانگ توڑ دوں گا۔"

تلسی اپنے سسر کو زہر پاش نظروں سے گھور رہی تھی۔ میں سیٹھ ارمان کو باہر لے آیا اور اسے چارپائی پر بٹھایا۔ اس کے ساتھ اس کے دو ملازم بھی تھے۔ اس نے اپنے ملازموں کو کچھ روپے نکال کر دیے اور کہا:

"جاؤ... کسی کے گھر سے اس بے وقوف کے لیے پھل وغیرہ لے کر آؤ۔ تلسی کے لیے بھی کچھ لے آنا۔"

سیٹھ کے ملازم چلے گئے۔

اس نے پھر ڈنڈا پھینک کر کہا "مہاراج! میں پہلے ہی جانتا تھا کہ میری بیوی چھپ چھپا کر گوپی کو رقم بھیجتی ہے... مگر میں آج تک خاموش رہا۔ یہ شکار کے بالکل قابل نہیں۔ اس نے شکار میں ٹانگ تڑوائی تو مجھے غصہ آگیا۔ پھر بھی مہاراج... میں نے اس بے وقوف کی ٹانگ پر ڈنڈا نہیں مارا۔"

سیٹھ ارمان چند نے یہ کہہ کر ٹھنڈا سانس لیا اور کہا:

"والدین ہمیشہ اپنی اولاد کا بھلا چاہتے ہیں اور اس لیے ان پر سختی بھی کرتے ہیں۔ اولاد کو بھی اپنے والدین کا فرمانبردار ہونا چاہیے۔"

تب میں نے دیکھا... سیٹھ کی بوڑھی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

◆◆◆

ممتاز ادیب علامہ عبدالستار عاصم کی
جناب حمید اختر پر دو بے مثال کتب

"حمید اختر (شخصیت اور فن)" نامی کتاب معروف محقق، دانشور علامہ عبدالستار عاصم کی مرتب کردہ ایک خوب صورت اور عظیم کاوش ہے جو انھوں نے موجودہ صدی کے نامور ترقی پسند کالم نویس، افسانہ نگار اور سیاسی کارکن جناب حمید اختر کی وفات کے بعد شائع کی ہے۔ تاریخ اور ادب پر نظر رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ ترقی پسند دانشوروں اور لکھنے والوں میں حمید اختر ایک روشن ستارے کی حیثیت رکھتے تھے جنھوں نے تاحیات اپنے نظریات کی آبیاری اپنے خون جگر سے کی۔ اپنے مشن کی پاداش میں متعدد بار کئی کئی سال جیل بھی کاٹی اور ساری زندگی غربت سے چومکھی لڑائی بھی لڑی۔ زیر نظر کتاب حمید اختر (شخصیت اور فن) کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ حمید اختر برصغیر پاک و ہند کی سیاست، معاشرت، ادب اور سماج کو کن نظروں سے دیکھتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان کو کیسا دیکھنا چاہتے تھے۔ آزادی سے پہلے ہندوستان اور مسلمانوں کی سیاسی عظمت کے لیے انھوں نے کیا سیاسی جدوجہد کی اور قیام پاکستان کے بعد اپنے کالموں، تحریروں اور افسانوں کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کو انھوں نے عقل و دانش کی کون سی باتیں سمجھنے کی دعوت دی۔ ملکی مسائل پر ان کی رائے کیا تھی اور پاکستان کے حکمران طبقوں سے وہ کس قدر متنفر تھے اور پاکستان کی قیادت کے اہل لوگ ان کی نظر میں کون سے تھے اور پھر چونکہ حمید اختر ترقی پسند لکھاریوں میں سے شاید واحد شخص تھے جنھوں نے اپنے سب ساتھیوں کے بعد وفات پائی اس حوالے سے بھی ان کی آخری تحریریں بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔ علامہ عبدالستار عاصم نے نہ صرف ان کی زندگی کے آخری سال کے تمام کالم زیر نظر کتاب میں شامل کیے بلکہ ان کے چند افسانے، ان کی زندگی کے مختصر حالات اور ان پر ملک کے نامور اہل قلم جناب عطاء الحق قاسمی، کشور ناہید، [illegible]، پروفیسر جلیل حسین نقوی، حکیم [illegible]، [illegible]، لطیف چوہدری، ایاز خان اور [illegible] کی تحریریں اور تاثرات بھی شامل کیے ہیں۔ ہر ترقی پسند، تاریخ کا ہر طالب علم اور سیاسی شعور رکھنے والا شہری اس کتاب سے استفادہ کرتا ہے اس حوالے سے یہ کتاب ہر لائبریری کی ضرورت ہے۔ روشن خیال حمید اختر جو ساری زندگی تحریر و تقریر سے انسانی حقوق کی ترجمانی کرتے رہے ان سے متعلق یہ کتاب مقبول اکیڈمی چوک اردو بازار لاہور 0333-4393422 سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

حمید اختر پر محقق، دانشور علامہ عبدالستار عاصم کی دوسری کتاب "قصہ ایک صدی کا" بھی برصغیر پاک و ہند کے ایک ترقی پسند راہنما حمید اختر کو خراج تحسین ہے جس میں حمید اختر مرحوم کے روزنامہ ایکسپریس میں شائع ہونے والے ان کی زندگی کے آخری دو سالوں 2010ء اور 2011ء کے تمام کالم شامل کیے گئے ہیں۔

پاکستان میں آج بھی 97 فیصد لوگ مسائل کا شکار ہیں اور تین فیصد اقلیت حکمرانی کر رہی ہے اور سال 2010-11ء میں بھی صورت حال یہی تھی۔ مسائل بھی تقریباً وہی ہیں جو ان دنوں تھے۔ اس لیے حمید اختر جیسے دور اندیش، جہاندیدہ اور زیرک اہل قلم کے زیر نظر کتاب میں شامل 300 سے زائد کالم دراصل ہماری آج کی کہانی، ہمارے موجودہ مسائل کا رونا اور ہمارے آج کے حالات کی درستگی کے لیے تجاویز کا مجموعہ ہیں۔ حمید اختر مرحوم نے قیام پاکستان سے لے کر آصف زرداری کی حکومت کے درمیانی عرصے تک کی تمام تبدیلیوں کو اپنی آنکھوں سے آتے ہوئے اور لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کرتے دیکھا۔ وہ قیام پاکستان کے مقاصد سے بھی بخوبی آشنا تھے اور تکمیل پاکستان کے لیے دور و نایاب پروگرام بھی رکھتے تھے۔

پاکستان کی ترقی، خوشحالی، وقار اور پاکستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے کالموں میں وہ اکثر تجاویز اور لائحہ عمل بھی دیتے رہتے تھے۔ چونکہ ایک محب وطن قلم کار کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ نہایت قیمتی اور نایاب ہوتے ہیں اور آنے والے ہر زمانے کو یہ الفاظ یوں روشن کرتے ہیں جیسے تاریک حویلیوں کو جگمگ جگمگ کرتے فانوس روشن کر دیتے ہیں۔ یقیناً علامہ عبدالستار عاصم نے حمید اختر جیسے محب وطن اہل قلم کے الفاظ کو بھی زیر نظر کتاب "قصہ ایک صدی کا" میں اسی دور اندیشی کے تحت محفوظ کر کے تاریخ کے حوالے کر دیا ہے تاکہ آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کریں۔ یہ خوب صورت کتاب مقبول اکیڈمی چوک اردو بازار لاہور۔ فون: 0333-4393422 سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

کھوٹا سونا!

والدین اور بچوں کے درمیان بڑھتے فاصلوں سے جنم لیتی قباحتوں کا الم ناک نوحہ

سجاد قادر

جب سے جماعت کی لڑکیاں اسے چھیڑنے لگیں تب سے اس کا بیشتر وقت آئینے کے سامنے کھڑے گزرنے لگا۔ سب لڑکیوں کی ایک ہی رائے تھی کہ سونا بڑی پیاری ہے۔ وہ نہ صرف نام کی سونا تھی بلکہ شکل وصورت سے بھی کچھ کم نہ تھی۔ کلاس میں جب لڑکیاں اسے چھیڑتیں کہ تم پہ تو لڑکے جان دیتے ہیں تو وہ دل ہی دل میں آسمان کو

چھونے دوڑتی۔ ایک تو تھی وہ بلا کی خوب صورت، اوپر سے لڑکیوں کی تعریف سنے اس کا قد غرور کی ملاوٹ سے بڑھانا شروع کر دیا۔ روز گھر آ کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپے پہ نظر دوڑاتی اور نیم مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ہی آپ بڑبڑاتی کمرے میں چلی جاتی۔

کچھ دنوں سے سونا کی اماں متفکر رہنے لگی تھی۔ جب بیٹیوں کے قد حد سے نکلنے اور قدم دہلیز کی طرف لپکنا شروع ہوتے ہیں تو کسی اور کو خبر ہو نا ہو ماں کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع کر دیتا ہے۔ سونا کی ماں غور کر رہی تھی کہ سونا بیٹھے بیٹھے ہنسنا شروع کر دیتی ہے کبھی اداس ہو جاتی اور کبھی چھت پر گھنٹوں خلاؤں میں گھورتی رہتی ہے۔ اپنے ہی آپ پریشان ہو جاتی اور خود بخود خوش ہو جاتی ہے۔ کبھی اسکول سے آتے ہی کتابیں میز پر پھینکیں اور دھڑام سے بستر پر گر جاتی اور گھنٹوں کمرے سے باہر نہیں آتی تھی اور کبھی آتے ہی ہمسایوں کی بچیوں کے ساتھ کھیل کود میں ایسے مشغول ہوتی کہ شام کی اذانیں ہو جانے پر بھی ان کا کھیل ختم نہ ہوتا۔

ماں روز روز اس کی حرکتوں اور بے جا سوچ بچار کے بھنور میں مبتلا اس کی صورت کو دیکھتی ایک انجانے خوف میں مبتلا ہونے لگی۔ جانے اس کی ماں کو کس چیز کا ڈر کھائے جا رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر گھلتی چلی جا رہی تھی، کبھی کھل کے اس نے اپنی بیٹی سے کوئی بات کی ہی نہیں تھی۔ شروع سے اس کا وتیرہ تھا کہ بیٹا ہو یا بیٹی اس سے مطلب کی بات کی جائے یا پھر غصے سے ڈانٹ دیا جائے۔ کبھی اپنی بیٹی کو ٹٹولنے یا اس کو اپنے دل کے قریب کرنے کا اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ بیٹی کے دل و دماغ میں کون سا طوفان پل رہا ہے، اس نے جاننے کی کوشش ہی نہ کی۔

ایک دن سونا اسکول سے آئی، سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ یہ دیکھ کر ماں پریشان ہو گئی۔ بھاگ کر کمرے کی طرف گئی اور دروازہ بجانا شروع کیا مگر سونا نے دروازہ کھولنے کا نام ہی نہیں لیا۔ بڑی منت سماجت اور دھمکیاں ملنے کے بعد کہیں جا کر اس نے دروازہ کھولا۔ ماں نے اندر قدم رکھا اور بیٹی کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بدلتے رنگوں کو پڑھنا چاہا۔ مگر سونا نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

ماں کے دل میں چھپے سانپ نے اس کے دل پہ زور سے ڈس لیا۔ اس کا چہرہ اترنا شروع ہو گیا۔ وہ اپنی پریشان بیٹی سے کیا پوچھتی، خود اس کے اپنے دل کو سہارے کی ضرورت پڑ گئی۔ آخر ماں تھی، بیٹی کے ماتھے پہ بہتے پسینے کی مہک نے ماں کو بتا دیا تھا کہ کس موسم کی خوشبو ان کے آنگن میں بے وقت آ پہنچی ہے۔ ماں کا کلیجہ دہلنے سے رہ گیا۔ ذرا بھی سمجھ نہ آئی کہ کیا کرے۔ بیٹی کا گلا دبا دوں یا خود اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں۔ نازو نعم سے پلی، چار بھائیوں کی ایک بہن نے پورے گھر کا جنازہ نکال دیا تھا۔ ماں رونا چاہے مگر اس سے رویا نہ جائے۔ بالآخر اس نے ہمت کر کے سونا کو اپنے قریب کیا۔ جو باتیں اسے شروع میں ہی اپنی بیٹی کے کان میں بولنے ہوتے اور تھوڑی تھوڑی کر کے ڈالنی چاہیے تھیں، وہ ساری کہانی آج ایک ساتھ بتانے یا سمجھانے کے وقت وہ اپنی ہمت مجتمع نہیں کر پا رہی تھی۔

جب تک سونا کی ماں جھجکتی اور بیٹی سے ماجرا پوچھتی، تب تک بیٹی اپنے آپ کو اس صورت حال سے

بچانے کے لیے تیار کر چکی تھی اور بڑی کمال مہارت سے زمانہ شناس ماں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوگئی۔ ماں کے پوچھنے پہ سونا نے بتایا کہ کلاس کی لڑکیاں اسے ایسے ہی خواہ مخواہ چھیڑتی ہیں اور اس کے بد لتے خدوخال پر طنز کرتی ہیں جس کی وجہ سے وہ اکثر پریشان رہتی ہے۔ اس کی ہم جماعت غزالہ نے کچھ زیادہ ہی شرارت کر دی جس کی وجہ سے اسے رونا آ رہا تھا۔ سادہ طبیعت ماں نے سونا کی جھوٹی بات اس لیے سچ مان لی کہ اس میں خود اپنی بیٹی سے اس موضوع پر بات کرنے کی ہمت تھی اور نہ ہی مناسب الفاظ۔ جانے کیسی ماں تھی، اپنی مٹی کی خوشبو میں بدبو محسوس کرنے کے باوجود بھی پانی دے کر پاک کرنا اسے کٹھن لگ رہا تھا۔

سونا کا سینہ آج معمول سے بڑھ کر دھڑک رہا تھا اور آج وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی آنکھ سے آنکھ نہیں ملا پا رہی تھی۔ ایک مرتبہ تو اس نے سوچا کہ میں نے ایسا کچھ کیا ہی کیوں کہ خود اپنی تصویر کو دیکھنے کے قابل نہیں رہی۔ مگر اگلی ہی دفعہ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ میری باقی سہیلیاں بھی تو ایسی ہی ہیں۔ وہ کون سا دودھ کی دھلی ہیں۔ آخر ایک نہ ایک دن تو یہ سب ہونا ہی تھا اور اگر ابھی ہو گیا تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اور پھر بجلی کی سکان کے ساتھ وہ کمرے سے باہر آ گئی۔

جانے یہ کیسی بزدل ماں تھی کہ اپنی بچی کو سینے سے لگا کر اس کی حفاظت نہ کر سکی۔ مرغی بھی ایک عرصہ تک اپنے چوزوں کو پروں کے نیچے چھپائے رکھتی ہے۔ بلی کی آہٹ، بلی کی میاؤں اور کتے کے بھونکنے پہ بھی بھاگ کے چوزوں کو آغوش میں لے لیتی ہے۔ جب کبھی کوئی بلا اس کے چوزوں پہ حملہ آور ہو تو اپنی ساری

حافظے کا ضعف

میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی، صبح یہ بھی یاد نہیں رہتا۔ کئی مہینے کی بات ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے کے لیے نکلا تھا، واپسی پر اپنے گھر کا راستہ بھول گیا۔ وہ تو کہیے ایک میرے ہم عمر ٹہلتے مل گئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہیں کہیں برساتی نالے کے کنارے جو ایک گنبد والا مکان ہے۔ کیا آپ اس کا راستہ بتا سکتے ہیں؟ انھوں نے کہا کیا آپ جوش صاحب کے مکان جانا چاہتے ہیں۔ میں نے جی ہاں کہا اور اس نیک مرد نے مجھے میرے گھر تک پہنچا دیا اور رخصت ہوتے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا آج سے چالیس بیالیس برس پیشتر میں نے جوش صاحب کو آگرے میں دیکھا تھا۔ میرا نام نصیر احمد ہے۔ جوش صاحب سے میرا سلام کہہ دیجیے گا اور میں نے فرطِ شرم سے یہ نہیں بتایا کہ میں ہی جوش ہوں۔ اور تو اور آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز خط لکھنے کے بعد جب دستخط کی نوبت آئی تو اپنا تخلص بھول گیا۔ چند سیکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا اور اگر دو چار سیکنڈ کے اندر اپنا تخلص یاد نہ آ جاتا تو یقین فرمایئے میرا دم نکل جاتا۔ میں نے یہ بات اس واسطے لکھ دی ہے کہ اگر میری زندگی کے کسی واقعے میں کمی بیشی یا تقدیم و تاخیر نظر آئے تو آپ اسے میرا ارادی فعل نہ سمجھیں اور میری حالت پر ترس کھا کر اسے معاف کر دیں۔

(جوش ملیح آبادی کی خودنوشت "یادوں کی برات" سے اقتباس)

قوت کے ساتھ انھیں بچانے کے لیے سینہ سپر ہو جاتی ہے۔ مگر ہم انسان ہی اتنے بے پروا کیوں ہیں کہ بچوں کے جوان ہو جانے پر ان پہ غور نہیں کرتے۔ جب بچے جوان ہوں، تو تب ان کے والدین کو اپنی اولاد کے قریب ہونے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں والدین اپنے چھوٹے بچوں کو تو سینے سے لگائے پھرتے ہیں، ان کی ایک ایک خواہش اور تکلیف کا برابر خیال رکھتے ہیں۔ مگر جب یہ بچے سن بلوغت کو پہنچ جائیں تو والدین تب ان کی طرف اتنی توجہ کیوں نہیں دیتے، تب اتنا خیال کیوں نہیں رکھتے کہ وہ بری صحبت اور کانٹوں سے بھرے راستوں پہ چلنے سے بچ جائیں۔ جو باتیں سب سے پہلے اپنے والدین سے سیکھنی چاہییں وہی باتیں بچے دوسروں سے سیکھتے ہیں۔ دوسرے لوگ ان باتوں کے ساتھ اپنی سوچ یا یوں کہہ لیں کہ اپنی خواہش انڈیل کر انھیں سمجھاتے ہیں جس وجہ سے بچوں میں عجیب و غریب قسم کی خواہشات وقت سے پہلے ہی پنپنا شروع ہو جاتی ہیں۔

لڑکپن کے بعد جوانی میں قدم رکھتے ہوئے جس موڑ سے بچوں نے مڑنا ہوتا ہے بس وہی جگہ ہوتی ہے جہاں والدین کو چاہیے کہ اپنے بچوں کی گاڑی کا اسٹیئرنگ خود سنبھال لیں۔ ورنہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کسی اور کے ہاتھ آگئی، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ گاڑی کو حادثہ پیش آنے کا احتمال بڑھ جائے گا۔ حادثہ بھی ایسا کہ انسان نہ زندوں میں شمار ہو نہ مُردوں میں۔

عورت کو سب سے زیادہ جس امانت کو پردوں میں چھپا کر رکھنا پڑتا ہے۔ آج کے دور میں وہی کچھ سب سے پہلے عیاں ہوتی ہے۔ فیشن کے نام پہ بے ڈھنگی سوچ اور بے راہروی کے ناگ ہماری بہو بیٹیوں کو نگلتے جا رہے ہیں۔ کہیں ماں باپ جدیدیت کے عشق میں اپنے بچے بچیوں کو سنبھال نہیں پاتے تو کہیں والدین اپنے بچوں کے ساتھ اس قدر گھلے ملے نہیں ہوتے کہ بچوں کے ساتھ پیش آنے والے اچھے یا برے حادثات کا بروقت پتا لگا کے ان کا تدارک کر سکیں۔

ایسا ہی کچھ سونا کے گھر والوں کے ساتھ ہوا۔ کلی جب پھول بنے تو اس کی خوشبو باغ میں پھیل جاتی ہے۔ مالی ہر پھول کی خوشبو سے شناسا ہوتا ہے۔ اگرچہ پھول سے خوشبو آتی ہے مگر اس میں جڑ کی مٹی کی بساند بھی ضرور ہوتی ہے جو مالی کو اس کی مٹی اور اصلیت کا پتا دیتی ہے۔ اپنی مٹی کی خوشبو میں ملی بو سونا کی ماں کو بھی آئی تھی۔

سونا کی ماں اپنی ساری ہمت اکٹھی کر کے بھی اپنی بیٹی کو سمجھا نہ سکی کہ بیٹا جس راستے پہ تم چل رہی ہو اس پر کانٹوں اور دکھوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ چند دن کی رونق اور دلکشی ایک ایسا ناگ ہے جو تمھارے مستقبل کو نگل جائے گا۔ ایسی خواہشات جو وقت سے پہلے ہی لڑکیوں میں پنپتی ہیں اور وہ اپنے خون کی گرماہٹ سے بہک جاتی ہیں، وہ نہ صرف اپنی زندگی کا خاتمہ کر بیٹھتی بلکہ اپنے سے جڑے ہر رشتے کو ایسا دھبا لگا جاتی ہیں کہ دنیا کا کوئی کیمیکل بھی اس داغ کو دھو نہیں پاتا۔ چند لمحوں کے جذبات زندگی بھر کا روگ بن کر ہمیشہ کے لیے گلے کا طوق بن جاتے ہیں۔ سونا کی ماں اپنے شوہر کو بیٹی کی اکھڑتی چال اور بہکتے قدموں کے متعلق کچھ نہ بتا سکی کہ مبادا غیرت کی آڑ میں اکلوتی بیٹی

کو گزند پہنچا دے۔

مگر جن چھوٹی چھوٹی باتوں کے خوف نے سونا کی ماں کو کوئی قدم اٹھانے سے باز رکھا وہیں اس کی چپ رہنے کی سوچ نے آخرات وہ داغ دے دیا جس سے بچنے کا وہ خیالی منصوبہ بناتی رہی تھی۔ کبھی عملی طور پر تو اس نے اپنی بیٹی کو سدھارنے، اس کی بات سننے اور اس کے ارمانوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہی نہیں تھی۔ شاید بزدل تھی یا اپنی بیٹی سے شرم کھاتی تھی۔ مگر سونا نے ماں باپ کو جس دلدل میں پھنسا دیا تھا اس سے زندگی بھر وہ نہیں نکل سکتے تھے۔ صبح کے وقت سونا نے بڑا خوب صورت لباس پہنا اور گھر والوں سے کہا کہ آج ہمارے اسکول میں ایک خاص پروگرام ہے جس پر سب لڑکیوں نے رنگ برنگے کپڑے پہن کر جانا ہے۔ سونا نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے رنگ برنگے کپڑے پہن کر ماں باپ اور بھائیوں کو زمانے والوں کی بھی رنگ برنگی باتوں کو سننے کے لیے اکیلا چھوڑا تھا ان باتوں نے ماں کو موت کے بستر پہ جا سلایا۔

ازل کی بزدل ماں جس نے پہلے جرأت کی تھی اور نہ بعد میں زمانے کی باتوں سے تنگ آ کر موت کو گلے لگا لیا۔ بھائی اور باپ زمانے سے اپنے منہ چھپاتے پھرے کہ جیسے ان کے جسموں سے گندی بو آتی ہے کہ لوگ دور ہی سے ان کی طرف انگلی اٹھانا شروع کر دیتے کہ ان کی سونا کھوٹی نکلی! والدین لوگوں کو کیا جواب دیتے کہ ہماری پرورش اور لاڈ پیار میں ایسی کون سی کمی رہ گئی تھی کہ یہ دن دیکھنے کو ملا۔ اگر سونا اپنے گھر والوں سے اپنی پسند کا ذکر کر لیتی تو شاید وہ مان بھی جاتے۔ مگر تنہا فیصلہ کر کے جس طرح سے وہ اپنے والدین کو تنہا کر گئی تھی اس کا ازالہ ناممکن تھا۔

کچھ فیشن کی آڑ میں، کچھ میڈیا کی یلغار اور کچھ اپنے جذبات پہ کنٹرول نہ ہونے کی وجہ سے بچے ایسے گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں جن کا کوئی کفارہ نہیں ہوتا۔ چند منٹ کا جذباتی فیصلہ نہ صرف بچوں بلکہ ماں باپ کو بھی ایسے مقام پہ لے آتا ہے کہ سوائے منہ چھپانے کے کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ حد سے بڑھی خواہشات جن کے منہ کھوتخنیوں کی طرح آگے نکلے ہوتے ہیں، اگر ان سے شروع میں ہی کنارہ کشی کر لی جائے تو مستقبل کی تباہی سے کسی قدر بچا جا سکتا ہے۔ نجانے بے حسی کے اس دور میں کتنے والدین کا سونا کھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ والدین لاکھ حیف میں اپنا اپنا سونا محفوظ کرنے کا جتن کرتے ہیں مگر شاید چور زیادہ طاقتور ہیں یا پھر سونا بذات خود چور کو دعوت دے ڈالتا ہے۔

والدین کو اپنے اپنے سونے کی حفاظت کے لیے ایسے اقدامات ضرور کرنے چاہئیں کہ ان کا سونا ان سے دور نہ ہو۔ جہاں ماں بیٹی کی بہتر محافظ ہوتی ہے وہاں باپ کو بھی چاہیے کہ اس بات کا خیال رکھے کہ بیٹی کے بدلتے رنگ کن طوفان کا پیش خیمہ ہیں۔

اکثر والدین اپنے بچوں سے شرماتے ہیں۔ جب کبھی بچے ان سے عجیب و غریب مگر فطرت سے متعلق کچھ سوال جواب کریں تو بجائے اس کے کہ والدین بچوں کے ساتھ آ کر بیٹھیں اور ان کی بات سننے کے بعد کوئی اچھا اور معقول جواب دے کر ان کی تسلی کریں وہ یا تو دوسرے کمرے میں چل دیتے ہیں یا پھر موضوع ہی بدل دیتے ہیں۔ اس وجہ سے بچوں کی تسلی نہیں ہوتی اور ان باتوں سے متعلق تجسس بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ جب یہ تجسس جنون کی صورت اختیار کر لے تو ان بچوں کا مستقبل بھی سونا سے کچھ مختلف نہیں ہوتا۔ ♦♦♦

علاقے میں ہوں۔ یہاں چند قلعے قبل از تاریخ عہد سے بھی منسوب ہیں۔ ان کا تذکرہ صرف کرم خوردہ کتابوں میں ملتا ہے وہ اب معدوم ہو چکے۔ پھر بھی ایک محتاط اندازے کے مطابق بلوچستان میں پچاس سے زائد قدیم قلعوں کی موجودگی ثابت ہے جو اپنے رقبے و طرزِ تعمیر کے لحاظ سے منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ بلوچ قوم کی تاریخ، ماضی اور تہذیب کے جیتے جاگتے آثار ہیں۔

بلوچستان میں "میری" شال کوٹ (قلعہ کوئٹہ) وغیرہ سب سے نمایاں ہیں۔ یاد رہے بعض قلعوں کو 'میری' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ بلوچی اور سندھی زبانوں میں 'میری' اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں حاکم وقت کی رہائش ہو اور جہاں وہ اپنا دربار لگائے۔

میر چاکر رند (1468ء-1565ء) بلوچوں میں ایک ہیرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ میں "چاکر اعظم" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ سبی شہر کے مغرب میں سبی۔ ہرنائی ریلوے لائن کے قریب واقع

بلوچستان کا گمنام ورثہ

قلعہ میر چاکر

بلوچوں کی عظمت رفتہ کا ایک زندہ جاوید اور شاندار تعمیراتی شاہکار

اثیر عبدالقادر شاہوانی

ایک قلعہ میر چاکر کے نام سے منسوب ہے۔ واضح رہے کہ میر چاکر کے اس علاقے میں تین قلعے تھے۔ پہلا سوران، دوسرا بھاگ کے قریب گنداز کے مقام پر اور تیسرا سبی قلعہ۔

اول الذکر دونوں قلعے زلزلوں میں منہدم ہو کر کھنڈر کی شکل اختیار کر چکے۔ جب کہ سبی قلعہ اب بھی موجود ہے، البتہ قلعہ آثار قدیمہ کی بے حسی کے سبب منہدم ہونے کو ہے۔ قلعہ چاکر کیتھ کو بلوچستان کے تاج میں نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے مگر انسانوں کی طرح بستیوں اور عمارتوں کی بھی تقدیر ہوتی ہے۔ قلعہ چاکر کی تقدیر میں تباہی و تنہائی لکھی تھی۔ سو یہ عظیم قلعہ سبی کے پُر رونق شہر کے سنگ کسمپرسی کی تصویر بنا موجود ہے۔ اس کی دیواریں اپنی عظمت رفتہ کی یاد دلاتی ہیں مگر اس شاہکار کو دیکھنے کم ہی لوگ آتے ہیں۔

آپ اس ویران اور اجڑے قلعے کی حدود میں داخل ہوں اور شعور کی آنکھیں کھلی رکھیں تو کمروں، راہداریوں اور در و دیوار پر ماضی کے نقوش دیکھ سکتے ہیں۔ جنوب کی طرف مرکزی دروازے کے آثار موجود ہیں جو بارہ فٹ چوڑا ہے۔ اس کے اوپر دو بڑے برجوں کے نشان ہیں جن میں تیر انداز فروکش ہوتے تھے۔

پہلے برج پر چڑھنے کے لیے قریب ہی سیڑھیاں ہیں۔ وہ ایک دریچے پر ختم ہوتی ہیں۔ اس دریچے سے ملحق ایک گودام میں اناج ڈالا جاتا تھا۔ اس قلعے کی ہر چیز شاندار ہے لیکن اناج کے دو گودام لائق توصیف ہیں۔ پہلے گودام کی لمبائی 80 فٹ اور دوسرے کی 70 فٹ ہے، جبکہ ان کی کشادگی 30 فٹ تھی۔ یہ پختہ اینٹوں سے بنائے گئے۔ نچلے حصے میں ایک دروازہ ہوتا تھا جہاں سے بوقت ضرورت اناج نکالا جاتا تھا۔

آگے ایک اور ویسا ہی برج ہے جس کے دائیں طرف چند سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں۔ اس حصے میں نہایت موٹی فصیل واقع ہے۔ یہاں کچھ بوسیدہ کمرے مورچوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ دراصل فوجیوں کی رہائش گاہیں تھیں۔ وہیں سے قلعے کی حفاظت ہوتی' حملہ آور لشکر کی نگرانی اور بوقت ضرورت دشمن کے لشکر پر تیراندازی کی جاتی تھی۔ نیچے نظر دوڑائیں تو سبی کے خوبصورت شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ قلعے کے وسیع آنگن میں ایک خوبصورت باغ تھا' اب وہ بھی اجڑ چکا۔ وہاں خود رو جھاڑیاں، ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر' چاروں طرف پھیلی بلند و بالا فصیل اور اس کے ہیبت ناک برج عالم گریہ میں ہیں۔

قلعے کے دوسرے کونے پر بھی ویسا ہی برج واقع ہے۔ اس کے ساتھ کمروں کے آثار ہیں۔ ان کمروں کی دیواریں خوب چوڑی اور دروازے نہایت ہی مضبوط ہیں۔ کمروں کی چھتیں ڈھل چکیں۔ کمروں کی یہ قطار قلعے کے تیسرے کونے تک چلی گئی ہے۔

چاکر کی نجی رہائش گاہ

قلعے کی مغربی فصیل کے اندرونی جانب چاکر کی نجی رہائش گاہ واقع تھی۔ اس کی حفاظت کے لیے دو چھوٹی چوکیاں بنائی گئی تھیں۔ نزدیک ایک تہ خانے کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ تہ خانے سے زیر زمین ایک راستہ شمالی چوکی کو جاتا تھا۔ ایک پرانی مسجد کے آثار

بھی ہیں جو شہید ہو چکی۔ مسجد کے ساتھ کئی حجروں کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔

فصیل کے آخری کونے میں منہدم دیواریں ایک وسیع اصطبل کی ہیں، جہاں اعلیٰ نسل کے اسپ تازی رکھے جاتے تھے۔ فصیل کے ساتھ ساتھ آگے جائیں تو آخری برج پر پہنچ جائیں گے۔ یہ برج دوسرے برجوں کے مقابلے میں قدرے چھوٹا ہے۔ ساتھ ہی سیڑھیاں ہیں۔ ان پر چڑھیں تو فصیل پہ پہنچ جائیں گے۔

فصیل کے ساتھ کئی کمرے نظر آئیں گے۔ بارش اور طوفانوں کی وجہ سے اب یہ اپنی اصل شکل و صورت کھو چکے۔ آپ قلعہ کی فصیل پر چڑھتے جائیں تو دروازے پر پہنچ جائیں گے۔ قلعے کے درمیان چند سیدھی دیواریں منہدم حالت میں ملتی ہیں۔ ہو سکتا ہے اُس زمانے میں ان پر نشانہ بازی کی مشق کی جاتی ہو۔

قلعے کے تینوں جانب فصیل کے نشانات موجود ہیں۔ قدیم زمانے میں فصیل یا دیواریں دفاع کے مقبول ترین انداز تھے۔ قلعہ کی بیرونی فصیل قریباً کئی ایکڑوں پر محیط ہے۔ یہ پرانی چوکی تک چلی گئی ہے۔ یہ چوکی میر چاکر کی بیرونی آمدورفت اور ٹاکہ (وصولی) کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس فصیل کے آثار چاکر روڈ کے ساتھ ساتھ تقریباً آدھے کلومیٹر تک اب بھی موجود ہیں۔ یہ فصیل 8 سے 10 فٹ چوڑی ہے۔

قلعے کی دیواری مٹی مقامی آبادی گھروں کی تعمیر میں استعمال کر چکی۔ قلعہ کی بیرونی چار دیواری کے نشانات بھی ختم ہو چکے۔ لیکن ابھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ قلعے کے بیرونی جانب چاروں طرف مورچہ نما کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ان کمروں میں چھوٹے چھوٹے

نمکین غزل

بجلی جو واپڈا کی نہ آئی تمام رات
ننگی گلی میں ہم نے بچھائی تمام رات
شاور چلا کے ہم بھی نہائیں گے شوق تھا
پانی کی ایک بوند نہ پائی تمام رات
اُس نے کہا تھا ملنے کو آؤں گا دن ڈھلے
وہ کی نہ ہم نے کنڈی لگائی تمام رات
خود بھی نہ سویا اور نہ سونے دیا ہمیں
منے کو ہم نے بوتل پلائی تمام رات
تھوڑا سا مسکرا تو دیا ہے وہ وقت صبح
روتے ہوئے بتائی تھی اس نے تمام رات
سادی بھی چاہیے مجھے لاکٹ بھی چاہیے
دیتی رہی لگائی دوہائی تمام رات
شوہر بچارہ دیر سے لوٹا جو اپنے گھر
بیگم نے کی ہے اُس کی دھنائی تمام رات
ناکے لگے تھے شہر میں پولیس کے جہاں
ہوتی رہی وہاں پہ کمائی تمام رات
آخر میں وہ بچارا تو بھوکا ہی چل دیا
دیگیں پکا رہا تھا جو نائی تمام رات
(ملک محمد اکرام اللہ)

دریچے (تیر کش) نمایاں نظر آتے ہیں۔

قلعے کے سامنے چھوٹے سے شہر کے بھی آثار نمایاں ہیں۔ وہاں دوران موسم گرما دور دراز علاقوں سے کثیر تعداد میں قبائل کی آمد کی وجہ سے قلعہ کے باہر میدان میں خیموں کا شہر آباد ہو جاتا تھا۔ لوگوں کی مختلف ضروریات پوری کرنے کے واسطے منڈی میں خوجوں کی بڑی بڑی دکانیں کھل جاتی جن میں ہرات کا مخمل اور عطر، تبریز کے قالین، دمشق و قاہرہ کے اسلحے موجود ہوتے۔ ان دکانداروں نے بی کے قریہ قریہ میں اپنے

کارندے متعین کر رکھے تھے۔ دوسرے سرداروں اور معززین کی مانگ پر بھی آکر انھیں چیزیں فراہم کرتے۔

اسی میدان کے ایک حصے میں اعلیٰ نسل کے مواشی کی وسیع منڈی لگتی۔ دوسرے حصے میں اہم ترین میلے کا انعقاد ہوتا۔ واضح رہے کہ رندو لاشار قبائل کی تیس سالہ جنگ کا موجب بھی یہی میلا بنا تھا جس میں جا کر کے بچے ریحان اور گہرام کے بیٹے رامین نے گھڑ دوڑ میں حصہ لیا۔ اس میں جیت و ہار پر تنازع پیدا ہوا جو بعد میں بلوچ حاکمیت کا شیرازہ بکھیرنے کا سبب بن گیا۔

جب بلوچستان انگریزوں کی عمل داری میں آیا تو انھیں یہ میلا بہت بھایا۔ چناں چہ انھوں نے اس کے انعقاد کی خاطر بڑے میدان اور خصوصی عمارات مثلاً جرگہ ہال، گورنر ہاؤس، سرکٹ ہاؤس وغیرہ تعمیر کرائیں۔ یہ میلا آج بھی روایتی شان سے منایا جاتا ہے۔ چند سال قبل تک ہر سال میلے کا افتتاح صدرِ مملکت فرمایا کرتے تھے۔

اس موقع پر سبی کی ترقی کے لیے خاطر خواہ رقوم کا اعلان ہوتا۔ لیکن بانیٔ میلا کے قلعے کی بحالی کے لیے نہ کسی نے اعلان کیا اور نہ ہی کہیں سے مطالبہ ہوا۔ ہاں سردار اختر مینگل نے اپنے دورِ وزارتِ اعلیٰ میں اس کی مرمت کا اعلان کیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے مشیر ملک طوقی نے کچھ کوششیں بھی کیں، لیکن ان کا منصوبہ عملی جامہ نہیں پہن سکا۔

قلعے کے آثار کا نظارہ آدمی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ حرم خانے، دیوان خانے، قید خانے، اسلحہ خانے وغیرہ یہ سب عہدِ ماضی کی یادگاریں ہیں۔ انھیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہر شے زبانِ خموشی سے کہہ رہی ہے: "دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ صرف ذاتِ باری تعالیٰ فنا سے ماورا ہے۔"

آج کل یہ قلعہ مختلف جانوروں کی آماج گاہ بنا ہوا ہے۔ قلعے کے اندر خودرو پودے بڑی تعداد میں اگ آئے ہیں۔ اس وجہ سے سانپ، زہریلے کیڑے مکوڑے اور دوسرے بے شمار حشرات ان میں پائے جاتے ہیں۔ خوفناک کتے ہر وقت قلعے کے آس پاس اور اندر منہ کھولے دندناتے پھرتے ہیں۔

قلعے کے قریب ہی چھاؤنی واقع ہے جہاں تعمیر و ترقی کے نئے باب دکھائی دیتے اور حقانی کا نادر نمونہ بھی نظر آتا ہے۔ ہر طرف خوبصورت عمارتیں، سڑکیں اور تفریحی مقامات بنائے گئے ہیں۔ لیکن اس تاریخی قلعے کی حالت اب بھی افسوس ناک ہے۔ مختلف علاقوں کے لوگ یہاں خزانے کی تلاش میں دیواریں گرا کر اور زمین وغیرہ کھود کر قلعے کی حالت مزید خراب کر کے چلے جاتے ہیں اور انھیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔

یہ قلعہ اپنے قیام سے مختلف طوفانوں کا سامنا کرتا چلا آ رہا ہے۔ کبھی یہ قبائلی جھگڑوں اور کبھی بیرونی حملہ آوروں کا شکار رہا۔ پھر صدیوں تک اسے نظر انداز کر دیا گیا اور اس کی دیکھ بھال اور مرمت پہ کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلعہ تقریباً منہدم ہو گیا۔ جو قومیں اپنے ماضی کے ورثے کی حفاظت نہیں کر سکیں، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔

یہ اشد ضروری ہے کہ حکومت قلعے کے خستہ حال حصوں کی از سرِ نو تعمیر و مرمت کی جانب توجہ دے۔ ایک ماہر آرکیٹیکٹ کے ذریعے اس کی بحالی کا کام کرائے۔ یوں یہ قلعہ سیاحوں کے لیے پُرکشش اور قابلِ دید تفریحی مقام بن سکتا ہے۔

◆◆◆

عظیم شخصیت

اللہ کے جانثار سپاہی
مولوی صاحب

سادگی، متانت اور شفقت سے متصف ایک بے بدل شخصیت کا قصۂ جانفزا

جن کے فیضانِ صحبت نے مصنف کی بکھری زندگی کا رخ بدل ڈالا

میاں محمد اکرم رانجھا

میں سات برس جیل میں قید رہا ہوں۔ وہ عظیم شخصیت جس نے میری زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا اور مجھے مجرم سے شریف انسان بنایا، اس کی زندگی کے چند سحرانگیز گوشے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

1961ء کی ایک سرد شام میں نے ڈسٹرکٹ جیل لاہور کی بی کلاس بیرک میں سنا کہ ایک مولوی صاحب کو گورنر ملک امیر محمد خان نے مونچھوں پہ تاؤ دیتے ہوئے نظربند کر دیا ہے۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا "ملک صاحب نے خوب کیا۔ مولوی صاحب نے ضرور کوئی شرارت کی ہوگی۔ بھائی کو بھائی سے لڑایا ہوگا اور فرقہ پرستی کو ہوا دی ہوگی۔" اس وقت مولوی کا تصور میرے ذہن میں یہی تھا۔ کچھ تو یہ جدید افکار کی "برکت" تھی اور کچھ میرے دیکھنے میں اسی قسم کے مولوی آئے تھے۔

دوسرے دن ظہر کے وقت میں اپنے احاطے میں چھپتا چھپاتا نمبرداروں کی بیرک میں گیا جہاں ساتھ والے سیاسی کمرے میں ڈاکٹر محمد اسلم تجری نظربند تھے۔ ڈاکٹر صاحب پشاور کے رہنے والے سرگرم سرخ پوش بڑے مرنجاں مرنج انسان تھے۔ لمبے تڑنگے گورے چٹے داڑھی مونچھ صاف قریباً ... کے پیٹے میں تھے۔ بہت آہستہ ... تھی

کرتے' لیکن تحریک پاکستان اور بانی پاکستان کے لیے ان کی لغت میں تحقیری الفاظ موجود ہی نہ تھے۔ مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کرتے۔

ڈیٹی بختیٹے کے بعد جب کبھی میں چھوٹا گوشت لے کر آتا' بے حد خوش ہوتے۔ چپلی کباب بنا کر کچھ عنایت کرتے اور باقی خود مزے لے کر کھاتے اور ہمیشہ کی سنائی ہوئی کہانی چھیڑ دیتے کہ کس طرح وہ پشاور میں سیروں کے حساب سے چپلی کباب تیار کیا کرتے اور جو باچا خان اور ڈاکٹر خان صاحب ساتھ ہی ساتھ کھاتے جاتے۔

میں ڈاکٹر تجری کے پاس ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ایک میانہ قامت شخص آ گیا۔ چال ڈھال سے بڑا باوقار' سفید شلوار اور نیلے رنگ کی کارروائی قمیض زیب تن تھی۔ سیاہ داڑھی اور انگریزی طرز کے بال بری طرح بکھرے بلکہ الجھے ہوئے تھے۔ اس نے آتے ہی بڑی متانت سے السلام علیکم کہا اور ہم دونوں سے مصافحہ بھی کیا۔ مجھے اس کے چہرے پر متانت اور طمانیت کے آثار باہم گھلے ملے نظر آئے۔ ساتھ ہی کچھ فکرمندی اور ناگواری کی جھلک محسوس ہوئی۔ یہ تھی ان مولوی صاحب سے میری پہلی ملاقات!

جلد ہی تعارف ہو گیا۔ مولوی صاحب ان دنوں کسی اشاعتی ادارے کے ڈائریکٹر تھے۔ سیاست میں ہونے کی وجہ سے سیاسی جماعتوں پر ایوب خانی مارشل لا کے تحت پابندیوں کی سزا صبر و شکر سے بھگت رہے تھے۔ انھوں نے عائلی قوانین کے نفاذ پر کہا تھا "دوسری بیوی پر تو پابندی لگا دی گئی لیکن داشتہ رکھنے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔" نازک مزاج شاہاں اس تنقید کو برداشت نہ کر سکے اور انھیں تین ماہ کے لیے ڈسٹرکٹ جیل لاہور بھیج دیا۔

ان دنوں ڈسٹرکٹ جیل لاہور کا حدود اربعہ کچھ یوں تھا: ایک طرف گندا نالا اسے بورسٹل جیل (موجودہ کیمپ جیل) سے جدا کرتا تو دوسری طرف پاگل خانے کی دیواریں اسے گھورتی رہتیں۔ عقب میں تھوڑے فاصلے پر اچھرہ کی گنجان آبادی واقع تھی۔ اب وہ تاریخی جیل جسے تحریک مجاہدین کے مولانا یحییٰ علی' مولوی جعفر تھانیسری اور سیکڑوں حریت پسند اور حق گو سیاسی راہنما گزشتہ ایک صدی سے آباد کرتے آئے تھے منہدم ہو چکی۔ اس کی جگہ سروسز اسپتال اور شادمان کالونی واقع ہیں۔ شادمان کالونی میں فاطمہ اسپتال سے ذرا شمال کی جانب اس کے کوٹ موقع (بیرونی دیوار) کے حصے اور صدر دروازہ (ڈیوڑھی) کے آثار نظر آتے ہیں۔

ڈیوڑھی سے داخل ہوتے تو بالکل سامنے اندرونی کوٹ موقع کا صدر دروازہ تھا جس کے آگے تیس چالیس قدم تک گلی چلی جاتی۔ اس گلی میں سے گزر کر ہم "چکر" میں پہنچ جاتے۔ چکر ہی میں اسپتال اور حوالاتیوں کی بارکوں کے دروازے گھومتی شکل میں آ کر کھلتے۔ اندرونی کوٹ موقع کے باہر بائیں جانب بی کلاس کا وارڈ اور سزائے موت کی چکیاں تھیں۔ اس سے آگے وردی گودام اور قیدیوں کی کھلی بارک تھی۔

بارک کے ساتھ گھومتے ہی سیاسی کمرا تھا اور آگے سزائے موت کا تختہ جس کے بالکل متصل لنگر اور سزائے موت کی چکیاں واقع تھیں۔ اس طرح چکر مکمل ہو جاتا اور ہم گھوم پھر کر ڈیوڑھی اور اندرونی کوٹ موقع کے صدر دروازے ہی پر آ جاتے۔ اس اندرونی صدر دروازے کے بائیں جانب بی کلاس بارک کے قریب ایک درخت تھا جس پر "بیدمار" روزانہ بید زنی کی مشق

کرتے۔ اس درخت کی کھال بُری طرح اُدھڑ چکی تھی۔ یہ درخت آج بھی فاطمہ اسپتال سے شمال کی جانب واقع پختہ سڑک کے قریب استادہ ہے۔ اس پر حضرت انسان کے ہاتھوں لگے زخموں کے مدھم مدھم نشان دیکھے جا سکتے ہیں۔

عجیب و غریب مشقت

اسی ڈسٹرکٹ جیل کی ڈیوڑھی میں مجھے پولیس 30 نومبر 1960ء کو لائی اور حوالۂ زنداں کر گئی۔ دربان نے میرا نام پتا لکھا۔ رات کے اندھیرے میں ڈیوڑھی سے آگے اندرونی چکر میں لے گیا اور وہاں چیف ہیڈ وارڈ "کمری شاہ" کے حوالے کر دیا۔ کمری شاہ نے درزی گودام سے دو پھٹے پرانے میلے کچیلے سے کمبل دیے اور اندرونی کوٹ موقع کے اندر واقع بارک نمبر تین میں ٹھونس دیا جس کے قریب ہی بڑ کا ایک درخت تھا۔ اس پر ہر قسم کے پرندے بھانت بھانت کی بولیاں بولتے صاف دکھائی دیتے۔ ہر نوع کے پرندے کا گھونسلہ دوسری نوع سے مختلف تھا۔

یکم دسمبر 1960ء کی صبح مجھے جمعدار (کمری شاہ) کی سرکار میں پیش کیا گیا۔ وہاں حکم صادر ہوا کہ اس حوالاتی کو جھاڑو پوچا پر لگا دیا جائے۔ لیکن میرے آبائی ضلع کے چند تجربہ کار قیدیوں کی سفارش پر یہ سزا ملتوی ہو گئی۔ خدا جانے یہ مشقت مجھ پر کیوں تھوپی گئی؟ اس وقت تک میرا کوئی جرم ثابت ہی نہ ہوا تھا۔ (سیشن جج لاہور نے ایک سال چار ماہ بعد 12 مارچ 1962ء کو مجھے مجرم قرار دیا۔) بہرحال اپنے ہم ضلع دوستوں کی مداخلت پر یہ مصیبت ٹل گئی۔ تاہم سات آٹھ دن تک یوں محسوس ہوتا رہا جیسے میں کسی سیارے

میں سوار زمین کے مدار کے گرد چکر لگا رہا ہوں اور مطمئن و شادمان زندگی کہیں تاریکیوں میں کھو گئی۔

شاکر و شفیق انسان

یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ مولوی صاحب بات بات پر الحمدللہ کہتے اور انھیں جیل آنے پر ذرا ملال نہیں۔ میں نے انھیں روایتی مولوی سمجھ کر مناظرانہ بحثوں میں الجھانے کی کوشش کی اور دلائل کے جو تیر (غلام احمد) پرویز صاحب کے لٹریچر (لٹریچر) سے حاصل کیے تھے، وہ سب استعمال کر ڈالے۔ مگر دوسری طرف سے ایک مشفقانہ مسکراہٹ سدابہار پھول کی طرح کھلی رہتی اور مناظرانہ انداز کسی مرحلے پر دیکھنے میں نہ آتا۔ کم گفتاری، متانت، سادگی اور دوسروں کی ذات میں گہری دلچسپی، یہ اوصاف میں نے پہلے روز ہی دیکھ لیے اور شدت سے متاثر ہوا۔ لیکن پرویز صاحب میرے دماغ پر قابض تھے اور انھیں مولوی صاحبان سے چڑ تھی۔ اس لیے یہ مولوی صاحب لائق محبت نہ ٹھہرے۔

تاہم جب پتا چلا کہ مولوی صاحب نے لاکالج لاہور سے ایل ایل بی کا امتحان درجہ اول میں صرف پاس ہی نہیں کیا تھا بلکہ اپنے علاقے کے اولین مسلمان وکلا میں سے تھے، تو میں احساس کمتری کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ میں ایک بدنام زمانہ مقدمے کا مرکزی ملزم تھا۔ ہر پڑھا لکھا آدمی مجھ پر طنزیہ نظر ڈالتا۔ تہذیب کا تقاضا سمجھا گیا کہ میجر محمد یعقوب جنھیں خود مجھ سے بڑھ کر بدنامی نصیب ہوئی، ان کا بھی یہی

عالم تھا۔ خان عبدالغفار خان، مسٹر بی ایم پٹی آف
کیرالہ، خان محمد آف پنڈوری، شہزادہ عبدالکریم آف
قلات، محمد اکبر بگٹی، عطاء اللہ مینگل بہرحال سیاسی لوگ
تھے اس لیے مجرموں سے نفرت کرتے ان کا حق بھی تھا۔

لیکن مولوی صاحب نے کبھی مجھ میں یہ احساس
پیدا نہ ہونے دیا کہ میں ان کی عظمت کردار کے سامنے
میں بدنما اور داغدار پودا ہوں۔ انھوں نے ہمیشہ مجھ سے
پیار بلکہ میرا احترام کیا۔ مجھے بار بار ان صحابہ کرامؓ کی
کہانیاں سنائیں جو فارس، حبش اور روم سے غلامی کے
قلادے گلے میں ڈالے بازار عرب میں بکے اور جب
اسلام کی عظمتوں سے فیض یاب ہونے کے بعد اپنے
وطنوں کو لوٹے تو کوئی گورنر تھا اور کوئی سپہ سالار۔ گویا
مولوی صاحب نے مجھے لاتقنطوا من رحمۃ اللہ
کے معنی بتائے اور احساس زیاں کے ساتھ ساتھ یہ
باور کرایا کہ انسان اچھا نہیں، ایک ذمہ دار ہستی ہے۔
اسے حساب کتاب کا سامنا کرنا ہے اور اس کا واسطہ
بہرحال ایک رحیم و کریم ہستی سے ہے جو گنہگاروں،
مجرموں حتیٰ کہ مشرکوں اور بدکرداروں کو بھی ہر لحظہ
مغفرت اور کرم کی نوید دیتی رہتی ہے۔ یہ ہستی کہتی ہے
کہ انسان گناہوں میں ڈوب کر بھی اگر نئی صاف ستھری
زندگی شروع کرنا چاہتا ہے تو ہم آگے بڑھ کر اس کا
ہاتھ پکڑنے والے ہیں۔

مولوی صاحب کی طبیعت میں رجائیت کوٹ کوٹ
کر بھری ہوئی تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ میں بھی دوبارہ نئی
زندگی شروع کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اور رفتہ گزشتہ پہ
یقین کرتے ہوئے اپنے خالق کے دروازے پر آ بیٹھا۔

وارڈ کے امام

چند روز تک ڈاکٹر محمد اسلم ہجری اور مولوی صاحب
سیاسی کمرے میں اکٹھے رہے۔ پھر مولوی صاحب کو
ہمارے بی کلاس وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ بی کلاس وارڈ
چار کمروں، دو غسل خانوں اور گوداموں پر مشتمل تھا۔
سامنے برآمدہ تھا جسے لوہے کی سلاخوں سے بند کر کے
حوالات بنا دیا گیا۔ شام پانچ بجے ہمیں منتقل کر دیا جاتا
اور صبح اذان کے وقت ''گنتی کھلتی''۔

مولوی صاحب میرے ساتھ کمرا نمبر دو میں
رکھے گئے۔ کمرا نمبر ایک اور کمرا نمبر تین میں میرے
ساتھی ''مقدمہ دار'' میاں خالد سہگل جبکہ کمرہ نمبر چار
میں غلام محمد ہاشمی (میانوالی) اور ایک اور مقدمہ قتل
کے حوالاتی احسان الحق بٹ اور میاں معراج الدین
(باغبان پورہ) مقیم تھے۔

مولوی صاحب نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ہم
سب سے ذاتی ملاقات کی۔ گنتی بند ہوتے ہی انھوں
نے اجتماعی کھانے کی تجویز پیش کی جسے صرف جزوی
طور پر قبول کیا گیا کیونکہ کچھ سرمایہ داروں کو اس تجویز کی
افادیت سے انکار تھا۔ اجتماعی کھانا سرکاری راشن سے
تیار ہوتا اور یہ ان کی لذت کام و دہن کے لیے کافی نہ
تھا۔ تاہم سرکاری راشن پر گزارا کرنے والے حوالاتیوں
نے اس تجویز کو بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا بلکہ اسی
شام اس پر عمل بھی شروع ہو گیا۔ مولوی صاحب کی
تشریف آوری سے وارڈ دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ مل
کر کھانے والے مل بیٹھے۔ چند لوگ جدا جدا بلکہ چھپ
کر بھی کھانے کھاتے پائے گئے۔ لیکن یہ تقسیم مکمل طور

پر جماعتی شکل اختیار نہ کر سکی۔

مولوی صاحب نے دوسری تجویز نماز باجماعت کی پیش کی تو کچھ سرمایہ دار اصحاب نے بھی اس کا خیر مقدم کیا کیونکہ وہ نمازی تھے۔ لیکن مولوی صاحب کے اجتماعی کھانے کے کچھ ساتھی بدک گئے۔ اس طرح مولوی صاحب قیدیوں کی جماعت تو نہ بنا سکے البتہ وہ پورے وارڈ کے امام بن گئے۔ آدھی آبادی ان کے اجتماعی کھانے میں شریک تھی اور آدھی آبادی اجتماعی نماز میں۔

پہلے روز مولوی صاحب نے نماز مغرب کی جماعت کرائی۔ مجھے بھی وضو کرنا بلکہ نکھرنا پڑا کیونکہ تازہ پانی کا انتظام نہ تھا۔ عشا کے وقت تو مولوی صاحب مجھے تلاش ہی کرتے رہے لیکن چار کمروں، دو غسل خانوں اور دو گوداموں میں ایک آدمی کو تلاش کرنا آسان کام نہ تھا اور وہ بھی اس صورت میں جب ان سب کے دروازے ایک دوسرے میں کھلتے ہوں۔

مولوی صاحب نے نماز مغرب سے فارغ ہو کر سفید کھردرا کمبل خود اپنے کمرے کے فرش پر بچھایا اور سالن ڈال ڈال کر دسترخوان کے اپنے ساتھیوں کو دیا۔ پھر دوران طعام میٹھی میٹھی باتوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جس میں اللہ رسول کا نام تو بار بار لیا لیکن سلسلہ گفتگو کو بہرحال سیکولر رکھا اور مذہبی بحث وتمحیص سے اجتناب کیا۔ باتوں کے دوران پتا چلا کہ مولوی صاحب بڑے شگفتہ مزاج ہیں۔ عالی ظرفی اور تحمل مزاجی ان کا خصوصی جوہر ہے۔ خود کم بولتے اور دوسرے کی زیادہ سننا پسند کرتے۔ ذاتی مسائل اور مصائب کو پیش کرتا تو انھیں آتا ہی نہیں البتہ دوسروں کی مشکلات اور تکالیف سننے اور حل کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

طریق دلنوازی

ایک بڑے مقدمے کا بڑا مجرم ہونے کے باوجود مولوی صاحب نے جس قرب کا مجھے اہل سمجھا اسے میں اپنی ذاتی عزت اور اپنی قابلیت کا نتیجہ خیال کرتا تھا۔ لیکن میں نے جب دیکھا کہ مولوی صاحب احسان الحق بٹ کے ساتھ کہیں زیادہ گرم جوش تعلقات رکھتے ہیں تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ احسان الحق بٹ بائیس برس کے نوجوان تھے غالباً کرشن نگر لاہور کے رہنے والے تھے۔ کسرتی جسم، خوبصورت چہرہ، تن سازی کے شوقین نیلے رنگ کی کھلیوں والی بنیان اور چست پتلون زیب تن کیے اکثر اپنے بازوؤں کے "مسلز" ملاحظہ کرتے رہتے۔

بال سیٹ اور باتیں کرتے وقت وحید مراد اور ندیم کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے۔ بات بات پر جھگڑا کرنا اور باقاعدہ انگریزی فلموں کے ہیرو اور ولن کی طرح گتھم گتھا ہو جانا، چند ہاتھ مارنا اور پھر مسلسل بے بسی کے عالم میں بہت سے ہاتھوں کی مار سہنا ان کا دن بھر کا محبوب مشغلہ تھا۔ "چودھری صاحب" کی کوششوں سے وہ کئی بار میاں معراج الدین (باغبانپورہ) سے نہ صرف الجھ پڑتے بلکہ ان کے ہاتھوں بری طرح پٹ بھی چکے تھے۔ لیکن مولوی صاحب نے ہم میں سب سے زیادہ اہمیت انھی کو دی۔ وہ ان کے مشاغل کے متعلق پراز معلومات گفتگو کرتے ساتھ سیر کرتے اور اکٹھے کھانا کھاتے۔ آہستہ آہستہ انھیں نماز کے قریب بھی لے

آئے۔ حالانکہ مجھے آج بھی یقین ہے کہ احسان الحق بت لونماز نہیں آتی تھی۔

بعدازاں احسان الحق کو سزائے موت ہو گئی۔ میرے سنٹرل جیل ملتان چلے جانے کے بعد غالباً انھیں پھانسی دی گئی۔ میں آج بھی ان کا معصوم چہرہ دیکھ رہا ہوں اور مجھے ان کا بلک بلک کر رونا یاد آ رہا ہے۔ مولوی صاحب جون 1962ء میں رہا ہو گئے۔ ہم سب انھیں الوداع کہنے ڈیوڑھی پر آئے تو وہ ایک ایک سے بغل گیر ہوئے۔ احسان الحق کی باری آئی تو وہ مولوی صاحب کو چھوڑ ہی نہیں رہا تھا۔ پھر جیسے ہی ہم واپس وارڈ پہنچے، اس اللہ کے بندے نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی کوئی عزیز ترین متاع گم ہو گئی۔ بے شک اس کا کیس ایک اتفاقی معاملہ تھا لیکن اس میں بقول اقبال...

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

کا بھی بڑا دخل تھا۔ مولوی صاحب کا طریق دلنوازی ایسا تھا کہ اس منہ زور اور اکھڑ نوجوان کو انھوں نے پالتو شیر کی طرح اپنے سے مانوس کر لیا۔ وہ پہلے جس طرح لوٹ کھسوٹ کرتا تھا اسی طرح اس نے لوٹ کر پیار کرنا سیکھ لیا۔ وہ اب ہمارا سب سے ہردل عزیز ساتھی تھا۔ حالانکہ پہلے ہم سب اس کا بائیکاٹ کیے رکھتے اور وہ ہمارے ہے پٹھان صاحب تھر تھا! پنجابی شاعر میاں محمد بخش نے بالکل سچ کہا ہے:

مرد ملے تے درد نہ چھوڑے اوگن دے گن کردا
کامل شخص محمد بخشا بنائے لعل پتھر دا

درویش کی نصیحت

مجھے سنٹرل جیل ملتان میں آئے دو اڑھائی سال گزر چکے تھے۔ میں بی اے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک روز سنا کہ کسی بغاوت کیس میں گرفتار ہونے کے بعد مولوی صاحب پھر آ پہنچے ہیں۔ اب وہ تنہا نہیں بلکہ دو تین سیاسی راہنما بھی ان کے ساتھ تھے۔ میں نے بڑے اہتمام سے مٹھائی کا ڈبا منگوایا اور چھپتا چھپاتا جیل اسپتال سے اگلی طرف محفوظ ترین بیرک (سیاسی وارڈ) پہنچا۔ مولوی صاحب بڑی گرم جوشی اور محبت سے ملے اور اپنے ساتھیوں سے میرا تعارف کرایا۔ میری تعلیمی ترقی پر اظہار اطمینان کیا اور نصیحت کی کہ اللہ کے سپاہی بن جاؤ دونوں جہان میں کامیاب رہو گے۔

مجھے ایک بوتل شربت بادام کی عنایت کی اور خاص جیل کی اصطلاحات میں خیر خیریت دریافت کرتے اور گپ شپ لگاتے رہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے وجود میں وہ مولوی نظر آیا جو پوری طرح مومن بن جاتا ہے۔ "انی مہاجر الی اللہ" کا عمر وانا مرغوش قرینہ عزت شہرت دشمن اور برادری غرض ایک ایک بت کو ضرب ابراہیمی سے توڑ دیتا ہے اور وہ عالم سے خدا کے لیے تنہا ہو جاتا ہے۔ جیل میں صدیق بن کر رہتا اور دنیا میں حنیفا اور امین بن کر گزران کرتا ہے۔ برائی کی قوتوں سے مصروف پیکار رہتا اور بھلائی کو رواج دینے کی خاطر مصائب کا سامنا کرنا پڑے تو صبر کا پہاڑ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی حنیف اور امین افراد کو حکمرانی عطا کرتا ہے۔ اس کے ہر قدم سے یہ عالم رنگ و بو بہار بداماں بن جاتا ہے اور قحط و خشک سالی کے خطرے ٹل جایا کرتے ہیں۔

اور یہ "مولوی صاحب" تھے میاں طفیل محمد......

آپ نے ان کا نام تو سنا ہوگا!

قصہ کوئز 1

شوکت تھانوی ناول نویس، شاعر، مزاح نگار، ڈراما نگار۔ آبائی وطن تھانہ بھون ضلع مظفر نگر تھا اور اسی نسبت سے تھانوی کہلاتے تھے۔ اصل نام محمد عمر تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم بھوپال میں حاصل کی، جہاں ان کے والد بہ سلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ پھر لکھنؤ آئے اور مشن ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ صحافت اور انشا پردازی کا چسکا ایسا پڑا کہ تعلیم ترک کر کے اخبار "ہمدم" میں ملازمت کر لی اور سید جالب کی تربیت میں ادب اور صحافت کو مشغلہ بنایا۔ پھر لکھنؤ کے متعدد اخبارات میں کام کیا۔ اپنا ذاتی اخبار "طوفان" بھی جاری کیا جو چند ماہ بعد بند ہو گیا۔ مزاح نگاری کو طرز نگارش بنا کر قبولیت عام حاصل کی۔ 1930ء میں ان کا مشہور افسانہ "سودیشی ریل" ماہنامہ "نیرنگ خیال" کے سالنامے میں شائع ہوا تو انھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کا ترجمہ ہندوستان بھر کی زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بھی ہوا اور انگلستان تک میں شائع ہوا۔

(1) شوکت تھانوی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(2) انھوں نے کب وفات پائی اور ان کی کوئی دو تصانیف کے نام بتائیں؟

قصہ کوئز 2

مولانا شوکت علی مجاہد تحریک آزادی، سیاسی رہنما۔ علی برادران میں بڑے بھائی۔ سات برس کے تھے کہ والد جناب عبدالعلی خان کا انتقال ہو گیا اور آپ کے بھائیوں کی تعلیم و تربیت کا بار آپ کی بیوہ والدہ کے کاندھوں پر آپڑا جو تاریخ میں "بی اماں" کے نام سے زندہ ہیں۔ مولانا نے 1895ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ سے گریجویشن کیا۔ پھر سترہ برس تک سرکاری ملازمت کی لیکن پھر ملک و قوم کی محبت کا جذبہ غالب آ گیا۔ ملازمت ترک کر کے 1913ء میں "انجمن خدام کعبہ" کی بنیاد رکھی۔ پہلی جنگ عظیم میں اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ پہلے مہرولی، پھر چھندواڑے، بعد ازاں جیل میں نظر بند رہے۔ 1919ء میں رہا ہوئے تو مولانا محمد علی کی معیت میں "تحریک خلافت" کی بنیاد ڈالی جو بہت جلد سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے دل کی دھڑکن بن گئی۔

(1) مولانا شوکت علی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(2) مولانا کب، کہاں اور کیسے فوت ہوئے؟

قصہ کوئز 3

قدرت اللہ شہاب ادیب، اعلیٰ سول افسر۔ ابتدائی تعلیم سری نگر اور جموں میں حاصل کی۔ خالصہ ہائی اسکول انبالہ سے میٹرک کیا۔ بی ایس سی پرنس آف ویلز کالج جموں سے کیا۔ 1941ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (انگریزی) کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال انڈین سول سروس کے لیے امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ ابتدا میں بہار اور اڑیسہ میں خدمات انجام دیں۔ پھر 1943ء میں بنگال میں تعینات ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد پہلے حکومت آزاد کشمیر کے سیکرٹری جنرل اور پھر وزارت امور کشمیر کے ڈپٹی سیکرٹری رہے۔ اس کے علاوہ وزارت اطلاعات و نشریات میں ڈپٹی سیکرٹری، ضلع جھنگ کے ڈپٹی کمشنر اور پنجاب کے ڈائریکٹر صنعت و حرفت رہے۔ 1954ء میں گورنر جنرل کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس عہدے پر انھوں نے ایوب خان کے دور تک غلام محمد، اسکندر مرزا اور خود ایوب خان تین صدور کے ادوار کو قریب سے دیکھا اور اپنے مشاہدات کو بعد میں اپنی مشہور آپ بیتی "شہاب نامہ" میں تحریر کیا۔ 1962ء میں سیکرٹری وزارت اطلاعات اور پھر ہالینڈ میں سفیر مقرر ہوئے۔ 1967ء میں سیکرٹری وزارت تعلیم مامور ہوئے۔

(1) قدرت اللہ شہاب کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(2) کب وفات پائی اور ان کی مشہور تصنیف کا نام بتائیں؟

قارئین کے تبصروں، مشوروں
اور باتوں سے سجا کالم

دہرا معیار

شمارہ مارچ میں محترم جناب عرفان الحق، شاہدرہ لاہور نے اپنے خط میں "کوئی طالب مجھے بتائے" کے تحت جو لکھا ہے اس کے جواب میں قلم اٹھاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے کہ میرا یہ خط شائع بھی ہو سکے گا یا نہیں۔ بہرحال امید و یاس کی کیفیت میں چند سطور لکھ رہا ہوں کہ شاید آزاد میڈیا کے دعویدار یہ تھوڑی حقیقت ہضم کر لیں۔

محترم کو خدا اور طالبان سے مطالبہ کرنا ہوتا ہے۔ بہرحال پاکستانی قوم جانتی ہے کہ جنگ کی ابتدا کس نے کی اور کس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے امن و امان کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔

جب امریکا نے بشمول تمام باطل طاقتوں کے افغانستان پر حملہ کیا تو کس نے امریکا کا ساتھ دیا؟ کیا صرف اپنے ملک کو بچانے کے لیے ہم ایک آزاد اسلامی اور پڑوسی ملک پر حملہ کرنے میں اس کے دشمنوں کا ساتھ دے سکتے ہیں؟ ہمارے پاس اس کا کیا جواز ہے؟ جب ہم لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کے قتل عام میں شریک ہو گئے تو اس وقت ہمیں اللہ اور رسول کیوں یاد نہیں آئے؟ ہمارے دانشور کہتے ہیں کہ اگر ہم اس قتل عام میں شریک نہ ہوتے تو ہمیں پتھر کے دور میں پہنچا دیا جاتا۔ جھوٹے گھڑے بہانے تراشے جا رہے ہیں۔ یہ دانشور خواہ کتنے ہی بہانے بنائیں مگر اللہ نے یہ حق کسی کو نہیں دیا کہ وہ کسی بے گناہ کے قتل میں شریک ہو جائے۔ خواہ وہ خود ہی قتل

کیوں نہ ہو جائے۔

ہم نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ سامراج کو خوش کرنے اور ڈالر کمانے کے لیے اپنے ہم وطنوں پر حملہ آور ہوئے۔ آج ہماری سرحدوں کے محافظ اپنے ہی لوگوں کو قتل کر رہے ہیں۔ یہ انتہائی افسوسناک صورت حال ہے۔

محترمہ نے لکھا ہے کہ "کلمہ طیبہ پڑھنے والے فوجیوں کی زندگی اپنے ماں باپ بیوی بچوں یا مال کی حفاظت کرتے ہوئے نہیں اپنے اسلامی ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے گئی۔ انھوں نے زندگی بھر کسی طالب کی شکل دیکھی ہوگی نہ اس سے ملے ہوں گے اور نہ دشمنی کی ہوگی۔ مگر ان کی جان کسی کافر یا دشمن فوجی نے نہیں؛ ان کی طرح کلمہ پڑھنے والے میرے جیسی کسی ماں کے بیٹوں نے لی۔" تو کیا قبائلی عوام کی حفاظت ان کی ذمے داری نہیں ہے؟ قبائلی علاقے پاکستان کی سرحدوں سے باہر ہیں یا پاکستان کا حصہ نہیں؟ آخر یہ دہرا معیار کب تک!

میری ان چند سطور سے خدانخواستہ یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ ہم طالبان سے تعلق رکھتے ہیں یا ہم اپنی فوج سے نفرت کرتے ہیں بلکہ یہ ہمارا مقصود ہے کہ ہمیں اب ہوش کے ناخن لینے چاہییں۔

اب مذاکرات شروع ہو چکے ہیں۔ خدا کرے اس سے مذاکرات میں فریقین کے لیے خیر ہو اور امید کی یہ کرن اس تاریکی کو دور کر دے۔

(محمد اقبال، ترکی، ایجنسی)

ڈالر اور مہنگائی

شمارہ مارچ 2014ء میں ملک کے نامور صحافی انصار عباسی کا انٹرویو خاصے کی چیز تھا۔ ڈالر کے حوالے سے سلیم جاوید کی تحقیق و انکشافات دلچسپ اور حیرت انگیز تھے۔ ہمارے ہاں تو ڈالر کے نیچے آنے کے باوجود بھی عوام مہنگائی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ یعنی ڈالر کے مثبت اثرات سے عوام محروم ہیں۔ طیب اعجاز قریشی کے بنگلہ دیش کے سفرنامے سے خاصی معلومات حاصل ہوئیں۔ بنگلہ دیش کا پاکستان کے ساتھ حالیہ رویہ حیران کن اور انتہائی افسوسناک ہے۔ سید عاصم محمود نے سرورق کی کہانی کے طور پر نریندر مودی کے چہرے سے نقاب کشائی کی اور ایسی باتیں سامنے لائے جو شاید پہلے لوگوں کو معلوم نہ تھیں۔ شکاریات کے حوالے سے صبا عتیق اچھا لکھ رہی ہیں۔ دنیا بھر میں منائے جانے والے عالمی دنوں کے حوالے سے محمد خلیل چودھری کی تحریر معلومات سے بھرپور تھی۔ لیکن تحریر پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ کچھ اہم دنوں کو وہ چھوڑ گئے ہیں۔ ایک تجویز ہے کہ ہر بار کسی ایک ایسی معروف شخصیت کی سرگزشت دی جائے جس نے محنت اور لگن کے ساتھ غربت سے امارت کی طرف سفر کیا ہو۔ یہ شخصیات برصغیر سے بھی ہو سکتی ہیں اور یورپ اور امریکا سے بھی۔

(رانا محمد شاہد، بورے والا)

میڈیا اور فحاشی

کافی عرصے تک "چشم خیال" سے غیر حاضری کے بعد دوبارہ اس خیال سے واپسی ہو رہی ہے کہ شاید مجھے نکال کر پچھتا رہے ہوں آپ۔

کیونکہ آپ نے لگاتار کئی خطوط ردی کی ٹوکری میں ڈال دیے۔ گزشتہ شمارہ اپریل میں تو "چشم خیال" کے صفحات ہی غائب تھے حالانکہ فہرست میں عنوان دیا ہوا تھا۔

اس شمارہ میں لاہور سے محترمہ نائلہ منیر کا میڈیا

پروگرامز کے حوالے سے جن خیال میں خط شائع ہوا ہے لیکن اب عالم یہ ہے کہ اس مادر پدر آزاد معاشرے میں اصلاح احوال کی بات کرنا دیواروں سے ٹکرانے کے مترادف ہے۔ کچھ عرصہ قبل ایک ٹی وی اینکر جو ایک مشہور اخبار کے کالم نویس بھی ہیں نے الٹا عوام ہی سے سوال کر دیا کہ فحاشی کہاں ہے کیونکہ موصوف کے خیال میں ان چینلز پر کوئی بھی مواد غیر اخلاقی نہیں ہے۔ تاہم جو حضرات اس ٹی وی کے وائرس سے بچنا چاہیں تو اردو ڈائجسٹ کے موجودہ شمارے میں عالیہ احمد کے تحریر کردہ مضمون پر عمل کریں۔

(راؤ ندامت رزاق، اوڈیرو لال سندھ)

والدین کو ایصال ثواب

کل ہی ڈائجسٹ ملا۔ ابھی پورا پڑھا نہیں ہے۔ بہت باتیں ذہن میں گڈمڈ ہیں کوشش کروں گی اچھا لکھوں۔ بات کچھ یوں ہے۔

والدین کے لیے دعائے خیر خود کریں بے شک ایک آیت یا ایک رکوع پڑھیں۔ دعا کرنے میں تو وقت نہیں لگتا۔ گاڑی چلاتے ہوئے بھی جو پڑھا ہو والدین کو ثواب پہنچا دیں۔ بجائے قاری صاحب کو گھر بلا کر پڑھانا یا قبر پر قاری صاحب کو بٹھانا یہ باتیں سمجھ سے باہر ہیں۔ خود پڑھیں بے شک کم سے کم ایک آیت زیادہ بہتر ہو گی۔

دیکھا یہ گیا ہے کہ پڑھنے والے سپارے پڑھ تو دیں گے مگر ان کی کیفیت وہ نہیں ہوگی جو ہم خود پریشانی یا تکلیف میں پڑھیں گے۔ ہماری کیفیت کچھ اور ہوگی۔

اس سے پہلے بھی کالم لکھ چکی ہوں۔ اردو کی

قیمتیں بہت زیادہ ہیں اور غریب کی پہنچ میں نہیں مگر ملٹی نیشنل کمپنیاں ڈاکٹروں کو اچھے اچھے تحفے دے کر اپنی دوائیاں بیچتی ہیں۔ اس پر تحقیقی رپورٹ ضرور لکھیں۔

اس دفعہ "شداد کی جنت" پڑھا۔ سنا تو بہت تھا۔ تفصیل سے پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آپ سب لکھنے والوں کو اللہ اجر عظیم دے۔ آمین (شہناز)

مزاح نمبر

تقریباً پچاس سال سے اردو ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں۔ کافی عرصہ بعد چٹکلے اور لطیفے پڑھنے کو ملے، اگرچہ ایک دو پرانے تھے۔ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔

اگرچہ آپ بذریعہ ہوائی جہاز اردو ڈائجسٹ ارسال کرتے ہیں مگر یہاں مجھے ایک ماہ بعد ملتا ہے۔ ابھی تک اپریل کا شمارہ نہیں ملا۔ کیا ریڈرز ڈائجسٹ سے لطیفے ترجمہ کر کے آپ کو اشاعت کے لیے بھیج سکتا ہوں؟

(ابو محمد قریشی، امریکا)

(ہم تحقیق کر رہے ہیں کہ آپ کو رسالہ اتنی تاخیر سے کیوں ملتا ہے۔ حالانکہ ہر ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں رسالہ بذریعہ ہوائی ڈاک بھیج دیا جاتا ہے۔۔۔ادارہ)

آسٹریلیا سے خط

مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے میرا افسانہ "کو نمبر" مارچ 2014ء کے شمارے میں شائع کر دیا۔ میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ پچھلے ستائیس سال سے آسٹریلیا مقیم ہوں۔ کچھ کہانیاں یہاں کی معاشرت کے پس منظر میں بھی لکھی ہیں۔ مگر زیادہ افسانے پاکستان کے حالات اور بدلتی ہوئی سماجی قدروں کے بارے میں ہیں۔

ایک نیا افسانہ "چھوٹی سی بات" بھیج رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گا۔ کوشش کروں گی کہ

آئندہ یہاں رہنے والے پاکستانیوں سے متعلق کوئی کہانی بھیج سکوں۔

(ثریا صدیق سلفی آسٹریلیا)

مشرق اور مغرب کا تضاد

حال ہی میں اردو ڈائجسٹ کو جو نیا رنگ اور نیا روپ ملا ہے' وہ قابل تحسین ہے۔ خصوصاً مختلف کامیاب لوگوں کے انٹرویوز جو پاکستان کی خدمت کر رہے ہیں' قابل تعریف ہیں۔ اس کے ساتھ نئے نئے متنوع موضوعات کی شمولیت بھی ڈائجسٹ کو مزید جاذب نظر بنا رہی ہے۔ رسالے میں مختلف مضامین شامل کرتے ہوئے ہمیں اپنی نظریاتی شناخت اور قومی اقدار اور مفادات کا لحاظ پاس رکھنا چاہیے۔

حال ہی میں اپریل 2014ء کے شمارے میں محترمہ اکیلی بیگ کا شمالی قبرص کا سفرنامہ کے بارے میں مضمون نظر سے گزرا جس میں محترمہ نے فرمایا ہے کہ "قبرص کے لوگ اپنے ہمسایہ عربوں سے یکسر مختلف ہیں۔ جن کا تجربہ ہمارے لیے دبئی اور سعودی عرب میں اچھا نہیں رہا (چلیے یہاں تک شاید گوارا ہوتا) خدا جانے کیوں عرب بے انتہا مغرور' کاہل' بے حس اور اکھڑ ہیں۔ نجانے محترمہ نے سارے عربوں کے بارے میں یہ نظریہ کیسے قائم کر لیا۔ کیونکہ راقم کو اکثر دبئی/متحدہ عرب امارات جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ وہاں جا کر عربوں کے بارے میں بالکل یہ احساس نہیں ہوتا۔

"قرآن حکیم نے اس طرح کی مذمت سے صریح الفاظ میں منع کیا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک شہر چھوٹی ریاست ہونے کے باوجود آج دبئی اپنے امن وسکون اور ترقی کی وجہ سے پوری دنیا کے سیاحوں کا مرکز بن چکا ہے۔ دبئی کی ائیرلائن دنیا کی بہترین ائیرلائنوں میں شمار ہوتی ہے اور اطراف دنیا سے مختلف اقوام کے لوگ جوق در جوق وہاں بسلسلہ سیاحت یا ملازمت کھنچے چلے آتے ہیں۔ جب بھی پاکستان پر کسی ابتلا یا مصیبت کا وقت آیا تو یہ ممالک دل کھول کر ہماری مدد کرتے ہیں۔

راقم نے آج ہی ایک دینی رسالے میں حضور اکرمؐ کی یہ حدیث پڑھی ہے کہ "جو عربوں سے محبت رکھتا ہے' وہ مجھ سے محبت رکھتا ہے اور جو عربوں سے بغض رکھتا ہے وہ مجھ سے بغض رکھتا ہے۔" ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "عربوں سے تین وجہ سے محبت کرو' کیونکہ میں عربی ہوں' قرآن عربی میں ہے اور اہل جنت کی زبان عربی ہوگی۔ اسی طرح کی مزید احادیث بھی ہیں۔

محترمہ نے اس امر کو بھی لکھا ہے جو محل نظر ہے۔ اہل مشرق اور اہل مغرب کا تقابلی موازنہ بھی کیا ہے۔ (کیونکہ وہ خود دیار فرنگ میں مقیم ہیں) اور خصوصاً اہل مغرب کے رویے کو سراہا ہے کہ وہ آپ سے ذاتی قسم کے سوالات نہیں پوچھتے۔ اس کی وجہ بھی دونوں طبقوں کا انداز فکر اور انداز معاشرت ہے۔ اہل مغرب کے ہاں بہت سی ایسی چیزیں رواج پا گئی ہیں جو ہمارے نزدیک ممنوع اور ناروا ہیں۔ جیسے مرد اور عورت کا بغیر نکاح رہنا (جس کی طرف محترمہ نے بھی اشارہ کیا ہے) کیونکہ انسانی ضمیر اس حالت گناہ کو دل سے قبول نہیں کرتا۔ اس لیے اہل مغرب اس پر گفتگو پسند نہیں فرماتے۔ لیکن بقول علامہ اقبال

؎ خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

ہم مسلمان ایک دوسرے کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں اور کسی حد تک بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہیں جس کو "بالاتر" یا "کم تر" رویہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ اپنے اپنے انداز ہیں۔ ہماری اقدار میں "اپنا پن" زیادہ ہے جو محترم کو مغربی اندازِ فکر اپنانے کی وجہ سے ناگوار گزرا ہے۔

ایک اور امر جس کی طرف آپ کی توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں، وہ ماضی کے مشاہیر اور اسلامی تاریخ پر "منک پارٹی" کا وہ عنصر ہے جس پر آج کل ہمارے "دانشور" حضرات کچھ زیادہ ہی مائل ہیں۔ ایک طرف قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی ذات تنقید کا نشانہ ہے تو دوسری طرف رنجیت سنگھ کو ہیرو قرار دیا جا رہا ہے۔ حال ہی میں اردو ڈائجسٹ میں سلاطین دہلی اور عباسی خلفا کے بارے میں ایسے مضامین نجانے کس مقصد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ماضی اور وہ بھی ماضی بعید کے قصے اُچھالنے سے آخر کیا مقصد حاصل کیا جانا مقصود ہے؟ جبکہ گزشتہ 67 سال کے عرصے میں ہم اپنے ملک کا ایک بازو کٹا چکے اور وطن عزیز کا بقیہ حصہ اپنی سالمیت اور امن و امان کے سنگین بحران میں مبتلا ہے۔ آخرکار "وہ لوگ" تو اپنی تمام تر کامیابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ پانچ سے سات صدیاں تک گزار گئے۔ بہتر ہے کہ ہم اپنے حال اور مستقبل پر نظر رکھیں۔ بہت افسوس کی بات ہو گی کہ اردو ڈائجسٹ جیسا موقر اور قومی جریدہ بھی نادانستہ طور پر ان لوگوں کی صف میں شامل نظر آئے۔

(انجینئر انور حسین مجاہد، جوہر ٹاؤن لاہور)

دعائے صحت

یہ چند سطور لکھنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس دفعہ اپریل 2014ء کے شمارہ میں میرا پسندیدہ مضمون "ہم کہاں کھڑے ہیں" نظر نہیں آیا۔ کچھ عرصہ پہلے آپ نے پاناما کے متعلق تجزیے دینا بند کر دیے جس کی کمی محسوس کی گئی۔ اب یہ کالم "ہم کہاں کھڑے ہیں" بھی گول کر دیا گیا ہے۔

قریشی صاحب! ہم تو اردو ڈائجسٹ پڑھتے ہی آپ کے تجزیوں کے لیے ہیں۔ اس رسالہ کا میں اس وقت سے قاری ہوں جب یہ ابھی (1961-62ء) میں شروع ہوا تھا۔ اگر اپنا ریکارڈ دیکھیں تو میرا نام شروع والے سالانہ خریداروں میں مل جائے گا۔

مہربانی فرما کر ہمیں اپنے تجزیوں سے محروم نہ کریں۔ اللہ آپ کو صحت مند و تندرست رکھے۔ آمین

(محمد تسلیم، لاہور)

نوٹ

محترم الطاف حسن قریشی طبیعت کی ناسازی کے باعث کبھی کبھی "ہم کہاں کھڑے ہیں" نہیں لکھ پاتے۔ قارئین سے اپیل ہے کہ اُن کی صحت و تندرستی کے لیے دعا کریں تاکہ الطاف صاحب کا قلم رواں دواں رہے۔

اختر عباس ادارتی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ اُردو ڈائجسٹ کے صفحات کو بہتر سے بہترین بنانے کا سفر جاری رہے گا اور ہمیں یقین ہے کہ قارئین بھی اپنے پُرخلوص مشوروں اور تجاویز سے نوازتے رہیں گے۔

(ادارہ)

Tenders will be issued by the aforesaid offices upto **09-06-2014** during office hour and to be received upto **10-06-2014** at 12:00 P.M and opened on same day at PM.

Tendered rates and amounts should be filled in-figures, as well as, in words and should be signed as per general directions given in the tender documents.

Tender will be received & opened by the District Tender Board, City District Government, Lahore in the office of the undersigned in the presence of Committee/ intending contractors or their authorized representatives who care for same.

Conditional tender and tenders not accompanied with **Earnest Money (2%) of the estimated cost in shape of CDR/Bank Draft** of any schedule Bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firm, will not be entertained.

Any information/ detail of work regarding the tenders mentioned above can be obtained from the Divisional Head Clerk/ Head Draftsman during office time.

The Procuring agency may reject all bids or proposals at any time prior to the acceptance of a bid or proposal. The procuring agency shall upon request communicate to any supplier or contractor who submitted a bid or proposal the grounds for its rejection of all bids or proposals, but is not required to justify those grounds.

Sl. No	Name of work	Tender Amount	Earnest Money (Rs.)	Tender documents Printing charges (Rs.)	Completion time
1.	Rehabilitation of Umair Ali Road from Taj Pura Railway Crossing to Lal Pul Phatak, Lahore	1,00,00,000/-	2,00,000/-	5,000/-	2-Months

DISTRICT OFFICER (ROADS)
Highway City Division No.2
Lahore